TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

ہمایوں

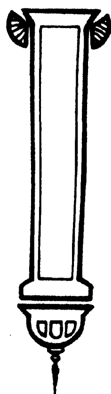
سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی وادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر۔ بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن)
بیرسٹرایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں



فہرست مضامین "ہمایوں" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء

جلد ۲۱ — نمبر ۱



ا

حمد

تکلّم ترا آبشاروں میں پنہاں ترنّم ترا جوئباروں میں پنہاں
ترا رنگِ رُخ لالہ زاروں میں پنہاں تری خندہ روئی بہاروں میں پنہاں
ہے غنچوں کے لب پر تری مسکراہٹ
ستاروں کے رُخ پر تری جھلملاہٹ

ترا نور شمعِ فروزاں میں پیدا ترا حسن ماہِ درخشاں میں پیدا
تری شوخیاں برقِ خنداں میں پیدا تری گونج ابرِ بہاراں میں پیدا
گلوں سے نفاست تری آشکارا
صبا سے لطافت تری آشکارا

تری دلربائی حسینوں میں پنہاں ترے عشق کی آگ سینوں میں پنہاں
ترا ذوقِ سجدہ جبینوں میں پنہاں ترا نام دل کے نگینوں میں پنہاں
تری ناخدائی سفینوں میں یا رب!
تری لامکانی مکینوں میں یا رب!

تُو ساقی ہے خود بزمِ کون و مکاں کا مے آشام ہے ذرّہ ذرّہ جہاں کا
چلا پے بہ پے دور ابرِ رواں کا تو عالم ہوا اور ہی گلستاں کا
چہکتے ہیں بلبل کھلے جاتے ہیں گُل
لہکتا ہے سبزہ نکھرتی ہے سنبل

ہیں آباد بچوں سے ماؤں کی گودیں گلوں سے ہیں زیبندہ شاخوں کی گودیں
بھری نور سے ہیں ستاروں کی گودیں سجیں دُرِّ شبنم سے پھولوں کی گودیں
کشش ذرّے ذرّے کی گھٹی میں ڈالی
محبت کی مے اِک جہاں کو پلا دی

ح - ب

کلامِ ہمایوںؔ

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے — گر گر کے ملکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا

اتّحادِ قوم سے ہر فرد یکتا ہو گیا — قطرہ دریا میں ملا تو خود بھی دریا ہو گیا

مُنجّم! میری لوحِ دل سے پڑھ لے میرا مستقبل — میری قسمت کی تو کیا جستجو کرتا ہے تاروں میں
بگولے آنکھ میں سرمہ لگا کر خاک کا میری — عدم کی راہ کو ہیں ڈھونڈتے پھرتے مزاروں میں

تنہا اُٹھالوں میں بھی ذرا لطفِ گمرہی — اے رہنما! مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے

بہتر ہے گر عمل سے عقیدہ ہوا کرے — ایسے سبق ہمیں نہ پڑھایا کرے کوئی
ہم ہیں فقیر اپنی ہی ٹیڑھی لکیر کے — ہم کو نہ سیدھی راہ دکھایا کرے کوئی

ہمایوں تیرے مدفن پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم — یہاں حُسنِ عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

قطرۂ خوں ہو کے شاید لعل ہی بن جائے دل
ضبطِ غم کا اے ہمایوں یہ صلہ پائے کوئی

[illegible]
12th Septr 1913

Kashmir:
River
Jhelum

ہمایوں مرحوم

زندگی جس کا نام دلبری، جس کا کام رہنمائی!

خاموش، متین، پاک دل

مشہور مصلح، مستور فلسفی

محفلوں سے کنارہ کش، تنہائیوں کی زینت

علم کا مخزن، ادب کا گہوارہ

تقریر کا دھنی، تحریر کا مالک

شعر و سخن اُس کی گھٹی ہیں، سوچ بچار اُس کا شعار

غازیٔ سعیٔ پیہم، صاحبِ بختِ ہمایوں

صدہا مشکلوں کو آسان کرنے والا ہزاروں کا محسن

دوسروں کی لغزشوں پر کُڑھنے والا، اپنی کمیوں کا جابر دشمن

ہمیشہ اپنے اصولوں پر قائم لیکن ساتھ ہی نئے تجربوں سے ہر وقت نئی باتیں سیکھنے کو ہمہ تن تیار اور بالآخر کائنات کی گتھیوں کو سُلجھا نہ سکنے پر خاموش اور شاید مطمئن!

وہ جس کا بچپن نسیمِ سحر کی طرح نرم رَو تھا اور گمنام، جس کا شباب باغِ دنیا کے لئے اِک بہار تھا حیات انگیز، اور جس کی ابھی پیری نہ آئی تھی کہ وہ اک خوشبو کی طرح فضا میں پھیل کر نظروں سے اوجھل ہُوا اور آسمانوں کی کسی نورانی دنیا میں جا بسا!

شاہدِ دینِ عمل!

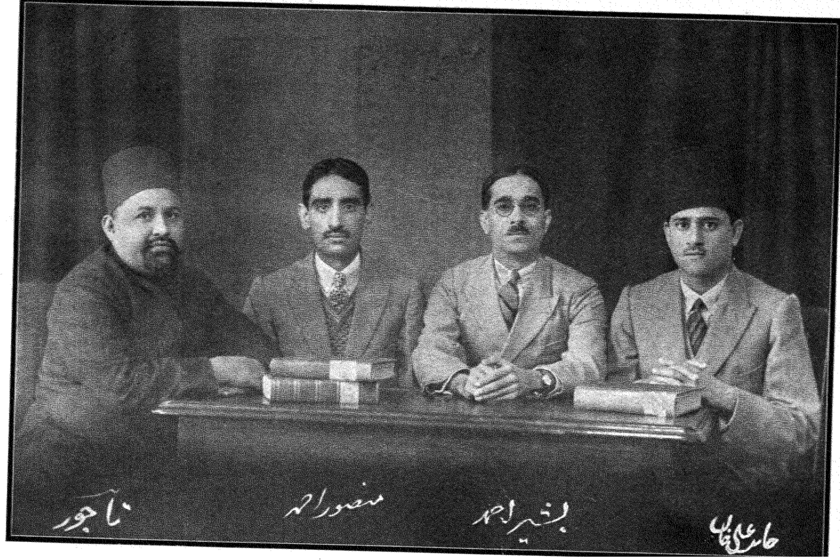
بشیر احمد

THE HUMAYUN.



حضرت ہمایوں مرحوم

CALCUTTA ART PG. WORKS, LAHORE.


تاجور
منصور احمد
بشیر احمد
حامد علی خاں

بزمِ ہمایوں

آج ہمایوں نے اپنی عمر کے دس سال پورے کئے ہیں اور گیارھویں میں قدم رکھا ہے۔ آج میں خوش ہوں اور جی چاہتا ہے کہ اپنی خوشی میں ناظرینِ ہمایوں کو بھی شریک کر لوں کہ ادب کی یہ کٹھن مگر خوشگوار منزل اُنہیں کی شرکت میں ہنسی خوشی طے ہوئی اور ہو رہی ہے۔

دس سال یوں تو ایک قوم یا ایک زبان کی تاریخ میں یہ مدّت گویا محض چشم زدن کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ایک فرد کی زندگی میں اس کے کچھ معنی ضرور ہیں اور گو یہ بیان ایک قسم کی تعلّی سمجھا جائے۔ یہ بھی یقیناً امرِ واقع ہے کہ اُردو زبان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک رسالہ دس سال تک مسلسل اس طرح جاری رہا کہ ہر ماہ اُس کا ہر پرچہ باقاعدہ طور پر پہلی تاریخ کو شائع ہوا + اس کامیاب کوشش میں پہلے مولانا تاجور پھر مولوی حامد علی خاں پھر مولوی منصور احمد اور اب پھر مولوی حامد علی خاں میرے شریک کار رہے ہیں۔ ان سب کی قابلیت و مستعدی پر میں ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے اخلاص اور ان کی شبانہ روز محنت کے بغیر یہ دشوار کام سر انجام نہ ہو سکتا تھا +

ان دس سالوں کے عرصے میں جو اردو رسائل کی تاریخ میں یقیناً ایک ہنگامہ خیز دور ہے ہمایوں کی ادبی سطح ہموار رہی یعنی اس کی مخصوص ظاہری و باطنی حالت بدستور قائم رہی۔ اور جہاں اپنے قدر شناسوں کے نزدیک ہمایوں دوسروں کو کچھ نہ کچھ سکھاتا رہا۔ وہاں خود اسے اعتراف ہے کہ وہ دوسروں سے سبق سیکھنے پر بھی آمادہ رہا اور یوں اُردو ادب کی جدید تحریکات سے بھی متاثر ہوتا رہا البتہ ساتھ ہی یہ خیال ہمیشہ دامنگیر رہا کہ آگے کو قدم صرف وہیں بڑھایا جائے جہاں پھر پیچھے کو نہ ہٹنا پڑے۔ ہمایوں ہمیشہ ذاتی رقابتوں اور ادبی جھگڑوں جھمیلوں سے کنارہ کش رہا۔ ہمایوں نے خود ستائی سے مدد نہیں لی اور لی تو بہت کم۔ ہمایوں کا مقصد نہ صرف علمی و ادبی ترقی رہا بلکہ عموماً علمی و ادبی باتوں میں بھی نفسی و اخلاقی ترقی اس کا مطمحِ نظر بنی رہی اور اس کا باعث راقم کی بے عمل "کتابی" زندگی نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ اُس مجسّمہ عمل اُس "علامہ نصیح" کی ورستارے کی طرح روشن، "وطبعِ بلند" تھی جسے شاعرِ قوم نے دس سال ہوئے اِن غیر فانی لفظوں میں خطاب کیا ؎

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

اِسی انجمن افروز چنگاری سے ہمایوں کی ننھی سی جھلملاتی شمع آج سے دس سال پہلے روشن ہوئی اور شکر ہے کہ آج تک اسی طرح روشن ہے لو رہا نی آیندہ کی اور "عاقبت کی خبر خدا جانے"!

ہمایوں کو اس امر کا احساس ہے کہ اک باقاعدگی کے سوا اُس کی باقی تمام بلند آہنگ "خوبیوں" سے بعض نقائص کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے + یکسانیت اگرچہ یوں قائم رہے تو بے لطف ہو جاتی ہے۔ اسے تنوع اور ولولہ انگیزی کی ضرورت ہے + سبق آموزی مفید ہے اگر اُسے یاد رہے کہ سبق آموزی کے معنی نہ صرف سبق سیکھنے کے ہیں بلکہ سبق سکھانے کے بھی ہیں + صلح پسندی حیات پرور ہے اگر وہ سمجھ لے کہ حقیقت

سے لطف اندوزی اُسی وقت ممکن ہے جب محاسن شناسی کے ساتھ صحیح قسم کی نقائص بینی بھی شامل ہو + خودداری حقیقت نماہی بشرطیکہ وہ خود بینی وخود پسندی کے زعم میں علیحدگی وبے تعلقی نہ اختیار کرلے + اور راست بازی اُسی وقت راست رو ہوسکتی ہے جب وہ بجائے گفتار کے کردار کی راہ پر گامزن ہو + ضرورت ہے کہ جدت پسندی پر ہمایوں کی بدستور نظر ہے اُسے محض اپنے انکسار پر غرور نہ ہو۔ وہ صحیح تنقید سے کنارہ نہ کرے۔ وہ ترقی کی نئی راہیں اور تعارف کے نئے ذریعے ڈھونڈے۔ وہ خالص پند و وعظ کے بجائے درستیٔ اخلاق کے دوسرے رستے بھی تلاش کیا کرے +

لیکن بایں ہمہ ہمایوں اپنی خصوصیات کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ صرف وہ اپنی اصلاح کے لئے ہمیشہ تیار رہا ہے اور رہے گا۔ کیونکہ اگر ہمایوں اُردو ادب کی کوئی خدمت کرسکا ہے تو ہمایوں ہو کر اور اگر کوئی خدمت اُس سے ادا ہوسکے گی تو وہ بھی صرف ہمایوں رہ کر ہوگی +

اہل ادب نے ہمیشہ ہمایوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے اور اردو کے اکثر اہل قلم نے گذشتہ دس سال میں اس کی بزم میں شرکت کی ہے۔ والدِ مرحوم ومغفور جن کی یادگار میں ہمایوں جاری کیا گیا اُن کے نظم ونثر کے زریں خیالات وقتاً فوقتاً ہمایوں کے لئے باعث زیب وزینت بنے رہے + (مولوی محمد حسین) آزاد کی بعض غیر مطبوعہ نایاب تحریریں ہمایوں میں شائع ہوئیں اور شرر۔ اکبر۔ گرامی۔ سلیم۔ چکبست۔ نرخ شن۔ شوق قدوائی نے جن میں سے ہر ایک کے دیکھنے کو آج آنکھیں ترستی ہیں اپنے زندۂ جاوید خیالات سے اسے آراستہ کیا + پھر وہ اکابر اردو جو اردو کی دنیا سے تقریباً روپوش ہوچکے ہیں۔ مثلاً اقبال۔ حسرت موہانی۔ نیرنگ۔ اعجاز۔ سرعبدالقادر۔ مرزا محمد سعید ان حضرات نے گاہے گاہے اپنے رشحاتِ قلم سے ہمیں مستفید کیا + مسز نائیڈو اور سر محمد شفیع کی سیاسی رہنماؤں نے بھی جن کا دائرۂ عمل اُردو ادب سے علیحدہ ہے خاص طور پر بزم ہمایوں میں شرکت کی + اور زبان اردو کے اکثر زندہ محسن ہماری ادبی محفل کو عموماً اپنے دم قدم سے آج تک فیض یاب کرتے رہے۔ بالخصوص (میاں عبدالعزیز) فلک پیما حضرات جوش (ملیح آبادی) سجاد حیدر، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، وحشت، احسن (مارہروی) آغا حیدر حسن، محمد عمر نور الٰہی، پریم چند، راشد الخیری وغیرہ + ان کے ساتھ ہی ہمارے اُن سینکڑوں کرم فرماؤں کا تذکرہ بھی لازم ہے جن میں مفصلہ ذیل اصحاب خاص طور پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ آزاد انصاری۔ اثر صہبائی۔ حفیظ۔ اصغر (گونڈوی) امجد۔ سدرشن۔ ہارون خاں شروانی۔ حمید احمد خاں۔ محمد حسین ادیب۔ محروم۔ نجیب۔ اکبر۔ ممتاز حسن۔ عظیم بیگ چغتائی۔ محمد حامد (دہلوی) ضیاء الدین شمسی۔ عطاء الرحمٰن۔ امتیاز علی تاج۔ احسان احمد۔ عاشق حسین بٹالوی۔ بیلا رام وفا۔ مجذوب۔ ستونرائن شمیم۔ شام موہن لال جگر۔ مقبول حسین (احمد پوری) میر افضل علی۔ جلیل۔ یاس۔ عزیز لکھنوی۔ عبدالحکیم۔ کیفی۔ غلام السیدین۔ گویا۔ منظور سروش۔ اختر۔ عدم۔ شوکت تھانوی۔ حضرات امین حزیں۔ راز چاند پوری۔ خلیقی۔ عابد۔ دیوانہ۔ روش صدیقی۔ نظامی۔ مہر محمد خاں شہاب۔ اعجاز (رسانوی) صادق ایوبی۔ اندرجیت شرما۔ حقی۔ رام رتن مضطر۔ ثاقب۔ اودے سنگھ شائق۔ رام پرشاد ناشاد۔ خالد۔ تپش۔ اعظم کریوی۔ زیبا۔ ماہر وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے نسوانی معاونین میں محترمہ ح ب صاحبہ۔ زب صاحبہ کرم آبادی۔ بیگم شاہنواز۔ محمد رفیع بیگم۔ بشیر احمد بیگم۔ ممتاز جہاں بیگم ہمارے لئے باعثِ صد فخر و

عزت ہیں۔

ہمایوں متفرق مضامین کا ایک مجموعہ ہے، رنگ رنگ کی علمی و ادبی دلچسپیوں کا ایک ذخیرہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس ذخیرے کے بعض جواہر پاروں کا آج ذکر کیا جائے۔ مگر دقت یہ ہے کہ گنجائش کم ہے اور تحائف بہت پس چند مضامین کا نام گنوایا جاتا ہے اِس امر کا اعتراف کرتے ہوئے کہ جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا، اُن میں سے بعض کا درجہ مذکورہ ذیل میں سے بعض سے کچھ کم نہیں۔ سب سے پہلے ہمارے کرمفرما فلک پیما ہیں جنہوں نے برضائے خود اپنے اوپر اپنا ہی یہ حکمِ امتناعی اب تک جاری کئے رکھا ہے کہ وہ ہمایوں کے سوا کہیں اور نہ لکھیں گے۔ اُن کے مضامین ہیں کس کا ذکر ہو کس کا نہ ہو لیکن میں کیا ہوں۔ میرا زینہ۔ بے صبروں کا دوزخ۔ ابلیس اور عورت۔ معترضہ جملے۔ سنہ ۱۹۲۶ء۔ قاضی دیگ بر۔ نئی تاریکی۔ آنکھ کا جادو۔ پچیس اور تیس۔ دقتیں۔ اور دقتیں۔ میاں حمو اللہ میاں۔ بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی۔ مشینوں کی موت۔ بے اختیار یاد آتے ہیں۔

پھر اُور مختلف انواع کے مزاحیہ اور لطیف مضامین کا خاصا ذخیرہ ہے جن میں مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں۔ دل دینا۔ زبیدہ۔ ٹھیکری کا نصیب۔ دماغ کے جھوٹ۔ زندگی کی تین راہیں۔ قبر کا بھید۔ خانہ جنگی۔ بمبئی کا ایک پھیرا۔ انجمنِ زندہ دلانِ ہند۔ صاحب بہادر۔ دوستوں کی قسمیں۔ بہرا۔ غریبوں کی سیل۔ مرد ایک عورت کی نظر سے۔ چھان۔ گولی مولی اردو۔

تاریخی مضامین میں سے چند یہ ہیں۔ انقلابِ فرانس۔ آفرینشِ عالم۔ مصر کے آثارِ قدیمہ۔ گلبدن بیگم۔ تاریخِ ہند کے چند زریں عہد۔ حریت اور اسلام۔ دنیا کی تاریخ ایک صفحے میں۔ نپولین مصر و شام میں۔

سیرت و سوانح عمری میں سے چند یہ ہیں۔ ہمایوں۔ غازی مصطفٰے کمال پاشا۔ لارڈ نارتھ کلف۔ ٹیپو سلطان۔ فخرِ کائنات۔ مسز سروجنی نائیڈو۔ ٹالسٹائے۔ مادام کیوری۔ سر اسحٰق نیوٹن۔ نواب خان خاناں۔ شبلی۔ کونٹ ہرمان کیزرلنگ۔

علمی مضامین میں یہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سائنس اور جنگ۔ علم الجراثیم۔ گیلیلیو۔ سُروں کے رنگ۔ رنگوں کے ذریعے سے سیرت کا مطالعہ۔ تاریخِ مصوریِ ہند۔ موجودہ فنِ مصوری۔ مصوری۔ حسن خاموش۔ نیا سیارہ۔ حیوانِ عاقل۔ فلسفۂ یاس۔

اخلاقی و تمدنی مضامین کی طرف ہمایوں کی خاص توجہ ہے۔ چند عنوانات یہ ہیں۔ عورت اور مختلف مذاہب۔ حقیر شے کی قوت۔ زن و شوہر کے تعلقات۔ شکستہ دلی۔ خوش کیونکر رہیئے۔ قوتِ فیصلہ۔ نیک ارادے۔ عورت اور مرد کا مسئلہ پردہ۔ ہندِ قدیم اور صنفِ نازک۔ مقصدِ زندگی۔ جدید ترکی۔ جرمنی میں تحریکِ صحرا نوردی۔

تنقید میں علاوہ "اردو نمبر" کے چند یہ مضامین ہیں۔ (۲۲ء میں) ادبیاتِ اردو اور ذوقِ عامہ (۲۳ء میں) شاعری و نفسیات

(سنہ ۲۴ء میں) تاریخِ امثال (سنہ ۲۵ء میں) پھول بن (سنہ ۲۶ء میں) ہندی بھاشا کا جدید ادب - اصلاحِ زبان اردو (سنہ ۲۷ء میں) اسلام کی شاعری (سنہ ۲۸ء میں) سودا کی ہجویہ نظمیں - ہندی رزمیات پر ایک معاندانہ نظر - سرمایہ مشترک - (سنہ ۲۹ء میں) طنزیہ شاعری (سنہ ۳۰ء میں) بھوا بھوتی - اردو شاعری (سنہ ۳۱ء میں) شاعری میں عشقیہ مضامین کی اہمیت - اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے۔

افسانوں کا انتخاب مشکل ہے لیکن قارئین کو شاید یہ نہ بھولے ہونگے - سنہ ۲۲ء میں افسانہائے عشق - وزیرِ عدالت - ذکریا کی عروسی - سنہ ۲۳ء میں گمنام خطوط - بنارسی ساڑھی - سنہ ۲۴ء میں حسین جعلساز - گناہ کی یاد - مجھے کوئی منالے - سنہ ۲۵ء میں جادو - سہیل - سنہ ۲۶ء میں شہزادی کا کفن - ایڈیٹر کی شہرت - بڑا والا چودھری - نیرنگِ فطرت - بھنور کی دلہن - ایثار - سنہ ۲۷ء میں لکسر کا مندر - تکمیلِ جنوں - میرے بچے میرے آقا - قربانی - موت کا راگ - سنہ ۲۸ء میں تکمیلِ محبت - ہمارا پہلا مقدمہ - لیلیٰ - زندگی - سنہ ۲۹ء میں خزاں کی ایک رات - پھول - ایک بالاتر ہستی کے مصائب - نیند کا غلبہ - عبرت - سنہ ۳۰ء میں ایک خط اور ایک پارہ - ناکام فاتح - رقاصہ - زرکار اچکن - چھیتا بھائی - سنہ ۳۱ء میں - بہرا شہزادہ - طفلانہ مگر فطری - الشذری - سفر کا مقصد۔

ڈراموں میں رفع دفع - کچھ جھوٹ کچھ سچ - چپ کی داد - آنکھ کا جادو - پہلی پیشی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہمایوں ایک گلدستۂ ادب ہے - اس میں مختلف نوع کے مختصر مضامین پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہمایوں نرا "چوں چوں کا مربہ" نہیں بلکہ اس میں متعدد بار مبسوط محققانہ مضامین پیش کئے گئے ہیں - علاوہ بعض خاص نمبروں کے جن میں دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کا پرچہ ترکی انقلاب کے مفصل حالات پر مشتمل تھا اور مارچ سنہ ۱۹۲۳ء کا پرچہ اس موضوع کے لئے وقف تھا کہ اردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے (اسی موخر الذکر نمبر میں مولانا وحید الدین سلیم کا وہ معرکۃ الآرا انعامی مضمون ہندوستان کی عام زبان درج تھا جو ساری اردو دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے) ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بسیط مستند مضامین ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں - مثلاً سیاسیات میں مبادئ سیاسیات (۱۰۶ صفحات) فلسفے میں اخلاقیاتِ اجتماعیہ (۱۷ صفحات) تاریخ میں دنیا کی تاریخ پر ایک نظر (۲۹ صفحات) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر (۷۴ صفحات) اور تاریخِ ہند کے چند زریں عہد (۲۸ صفحات) سوانح عمری میں دوشیزۂ فرانس (۱۲۷ صفحات) مذہب میں دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ (۶۰ صفحات) اور اسوۂ حسنہ (۱۴ صفحات) تنقید میں علاوہ اردو نمبر (۱۷ صفحات) کے مضامین کے شبلی بحیثیتِ مصنف (۴۵ صفحات) غزل گوئی پر ریزہ خیالی کا الزام (۱۴ صفحات) فنِ قصہ نویسی (۱۴ صفحات) سندر سنگھ اور من سکھی کا قصہ (۲۴ صفحات) اور جدید تحریکات کے متعلق سائنس و مذہب کا ملاپ (۶۱ صفحات) دنیا کا نیا تمدن (۲۶ صفحات) تعلیم و تربیت کے نئے طریقے (۳۶ صفحات) وغیرہ وغیرہ + علاوہ بریں "لطیف ادب" "جدید خیال" اور ادب کے بعض اور شعبوں کے متعلق

متفرق مضامین گاہے گاہے شائع ہوتے رہے جن میں سے بہترین مضامین کے ذکر کی بھی یہاں گنجائش نہیں۔

نظم کے ضمن میں ظاہر ہے کہ غزلیات کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے کہ اُن کے منتخبات کا ذکر ہو سکے۔ بہترین غزلیہ کلام میں وحشت۔ آزاد انصاری۔ احسن۔ اصغر۔ اثر صہبائی۔ اکبر اور حامد اپنی کثرتِ تعداد کے باعث نمایاں ہیں۔

متفرق نظموں میں (۱۹۲۲ء میں) "ہمایوں"۔ خاموشی۔ سفرِ عدم کی اطلاع۔ آصف الدولہ کا مقبرہ۔ وطن کا راگ (۱۹۲۳ء میں) مشرق کا پیغامِ اخوت مغرب کے نام۔ زلیست (۱۹۲۴ء میں) سائل۔ مسافر کا گیت (۱۹۲۵ء میں) خضر کا کام کر دن۔ کرشن جی کی بانسری۔ زورقِ ماہتاب (۱۹۲۶ء میں) محبت کی اولین سرگزشت۔ انسان۔ نامعلوم سرزمین کو۔ کنارِ چمن۔ پھول اور ستارہ (۱۹۲۷ء میں) وفا۔ محبت کا دوسرا دور۔ سمندر کی موج۔ ترانۂ روح (۱۹۲۸ء میں) تمنائے محبت۔ جھیل۔ بچپن کی سہانی صبح۔ جنگل کی شہزادی۔ چاند سے جھڑپ (۱۹۲۹ء میں) کیفِ موسیقی۔ حسنِ نیم شبی۔ پیپل کے پتے۔ برسات (۱۹۳۰ء میں) پھولوں کے دن۔ مکائدِ نفس۔ ہم۔ پریم ناچ۔ بچھڑی ہوئی جوانی۔ آواز۔ پھول۔ کیوڑا۔ معبد کا دروازہ۔ مشیت۔ (۱۹۳۱ء میں) گھٹا۔ نظارۂ قدرت۔ ستارے۔ بروگ بنسی۔ نعرۂ مردانہ۔ افسردہ دلی یہ مقبول ہو چکی ہیں۔

ہرچند محض مقدار و تعداد خوبی کا ثبوت نہیں تاہم قارئین ہمایوں کی دلچسپی کے لئے یہاں بیان کیا جاتا ہے کہ ہمایوں نے گذشتہ دس سال میں جو لٹریچر پیش کیا اُس کا مجموعی حجم ۸,۸۵۱ صفحات ہے۔

آئندہ کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ہمایوں بدستور اپنی روش پر قائم رہے لیکن اس قیام و استحکام میں سکون کے ساتھ تحریک بھی پائی جائے سکون و حرکت کا توازن ہمارا نصب العین ہو۔ نہ ہم محض قدامت سے وابستہ ہوں نہ محض جدت کے لئے بیقرار۔ ہر ایک کو خوش کرنا ہمارے پیشِ نظر نہ ہو لیکن ہم ہر مذہب اور ہر ملت ہر زمانے اور ہر حالت سے سبق آموزی و خوشہ چینی کرنے کو ہمہ تن تیار ہوں کہ صحیح انسانی تمدن فقط مختلف بلکہ متضاد عناصر کی ترکیب و تنظیم ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اور کچھ پائداری بھی نصیب ہو سکتی ہے تو اک ایسے ہی تمدن کو!

اس حقیقت کے احساس نے کہ آج ہمایوں نے اپنی عمر کے دس سال پورے کئے ہیں ہمایوں کے پُرانے ایڈیٹر کے دل میں پھر ادبی ولولہ انگیزی کی اک نئی لہر پیدا کر دی ہے اور اس نئی سرگرمی میں اس وقت خوش قسمتی سے اک ایسے "نیم پرانے" جائنٹ ایڈیٹر کی قابلیت شریکِ حال ہے جس کی نئی مساعی سے ہمایوں کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

ہاں یہ ساری خوشیاں اور تسلیاں، یہ گذرے ہوئے پر تسکین، یہ آنے والے کے لئے تحریک، یہ ولولے یہ سرگرمیاں، یہ جوش و خروش، یہ سارے کے سارے دعوے، یہ تمام کے تمام ارادے اُسی حالت میں کچھ مفید و کارآمد نتیجے پر پہنچیں گے جب ادارۂ ہمایوں کی کوششوں کے ساتھ ناظرینِ ہمایوں ہمدردانہ عملی اعانت بھی شامل ہو!

بشیر احمد

جہاں نما

جنگ عظیم کے بعد گذشتہ تیرہ سالوں میں کوئی سال ایسی عالمگیر مشکلات اور ایسی خوفناک ممکنات سے معمور نہیں رہا جیسا کہ ۱۹۳۱ء! ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کو "جنگِ عالمگیر" پکارا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جنگ اس قدر **عالمگیر** نہ تھی جیسی موجودہ **معاشی سرد بازاری** جس نے ۱۹۳۱ء میں دنیا بھر میں ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ یہ بات کہ متمدن دنیا کے ایک خطے کے حالات و واقعات کا باقی حصص پر کم و بیش اور جلد یا بدیر لازماً اثر پڑتا ہے اس قدر سیاسیات میں ظاہر نہیں ہوئی جتنی معاشیات میں۔ قومیں جو سیاسی نقطۂ نظر سے ابھی ایک دوسرے سے بہت کچھ الگ تھلگ نظر آتی ہیں معاشی حیثیت سے ایک دوسرے سے غایت درجہ وابستہ ہیں اور عموماً ان میں سے کسی ایک کی اچھی یا بُری حالت کا جلد یا بدیر دوسروں پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ تنگ حال ہو تو خوشحال امریکہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا یا اگر ہندوستان بیرونی مال کا مقاطعہ کرے تو ہو نہیں سکتا کہ دوسرے ملکوں کے کان تک جوں بھی نہ رینگے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک تو بعض ممالک کی انتہائی معاشی عُسرت کے باعث اور دوسرے بعض عالمگیر معاشی اسباب کے زیر اثر دنیا کے ہر قوم اور ہر ملک کو اپنی اپنی روزمرہ کی زندگی میں پہلی دفعہ بیک وقت ایک معاشی زلزلے سے واسطہ پڑا اور سبھی نے اس دھماکے کو کچھ اتنا ہی محسوس کیا اور کر رہے ہیں جتنا جنگ عظیم کو۔

۱۹۳۱ء کے بعض واقعات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جنوری میں وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے سامنے اپنی وہ مشہور تقریر کی جس میں ہندوستان کو صوبجاتی و مرکزی ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ کیا اور کانگرس کے قائدین رہا کر دیئے گئے۔ مارچ میں گاندھی اِرون مفاہمت ہوئی۔ اپریل میں سپین ایک خاموش انقلاب کے بعد ایک جمہوریہ بن گیا۔ مئی میں مصطفےٰ کمال چوتھی بار جمہوریہ ترکی کا صدر منتخب ہوا۔ جون میں ہُوور امریکی صدر نے تمام سرکاری بین الاقوامی قرضوں کے ایک سال تک ملتوی رہنے کی تجویز پیش کی۔ جولائی میں جرمن بنکوں نے اپنے دروازے بند کر لئے۔ اگست میں انگلستان میں مالی حالت بگڑ کر مزدور حکومت کا خاتمہ ہوا اور "قومی" حکومت کی بنا پڑی۔ ستمبر میں دوسری گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ جاپانیوں نے چینی شہر مکڈن پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ طلائی معیار سے دست بردار ہوا۔ اکتوبر میں کشمیر کے مسلمانوں نے مہاراجہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے اور انگلستان میں قدامت پسندوں نے دار العوام میں حیرت انگیز اکثریت حاصل کر لی۔ نومبر میں باوجود اسمبلی کی شدید مخالفت کے وائسرائے نے جدید میزانیہ کا قانون نافذ کر دیا۔ دسمبر میں ادھر وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینے کا گول مول وعدہ کیا اُدھر وائسرائے نے بنگال آرڈیننس کا اور بعض کانگرسیوں نے لگان نہ دینے کا اعلان کر دیا۔

ہندوستان اور انگلستان کی باہمی کشمکش، ہندوستان میں فرقہ وار مناقشات، ہسپین میں انقلاب، جرمنی کی مالی عسرت

انگلستان کا معاشی انحطاط اور قدامت پسندانہ زور، جاپان کا حملہ چین پر اور اس پر مجلسِ اقوام کا احتجاج، ساری دنیا میں مالی تباہی کے آثار، یہ ہے سنہ ۱۹۲۱ء کا کارنامہ۔ سب سے پہلے یورپ کو دیکھو۔ یہاں پہلی شے جس کی طرف توجہ خود بخود منعطف ہو جاتی ہے یہ ہے کہ "تمدن" یورپ ایک طرف ہے منقلب روس دوسری طرف۔ یعنی سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا کسانوں اور مزدوروں سے مقابلہ ہے۔ ایک کی کامرانی دوسرے کی تباہی سمجھی گئی ہے۔ ایک ہی برِّ اعظم میں دو تمدن کام کر رہے ہیں ایک دوسرے کا جانی دشمن۔ یورپ کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور گھر کے دو حصّے ہو گئے ہیں۔ اطالیہ اور فرانس کی رقابت بدستور چلی جاتی ہے۔ فرانس یورپ کی سب سے متمول دولت ہے اور اُس کی فوج سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن ادھر اطالیہ میں ایک مسولینی اپنے آپ کو لاکھوں پر بھاری سمجھے ہوئے ہیں وہ اطالیہ کی پُرانی رومی قوت کے احیا کا دیوتا ہے اور بحرِ روم کو اطالوی جھیل بنا لینا چاہتا ہے یہی سبب ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان بحری مقابلے کا بازار گرم ہے۔ جرمنی جو باوجود جنگِ عظیم کی شکست کے گذشتہ سات سال سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اپنی بگڑی ہوئی حالت کو سنوار رہا تھا اب نئی مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ عالمگیر معاشی کساد بازاری نے گذشتہ سال اسے بھی سخت نقصان پہنچایا۔ انگلستان جو مدت سے دنیا کا سب سے بڑا دولت مند سمجھا جاتا رہا اس کی مالی حالت اس قدر نازک اور پیچیدہ ہو رہی ہے کہ دنیا کے ساہوکاروں کو اس ہوشیار بنئے پر اعتماد نہیں رہا اور وہ بڑے تندومد کے ساتھ اپنی حالت کی درستگی میں مصروف ہے۔

لیکن نئے یورپ کو دُنیا کا سب سے اہم مرکز سمجھ لینا غلطی ہے جس طرح اب انگلستان کا یورپ میں وہ رعب نہیں رہا اسی طرح یورپ کا بھی دُنیا میں اب وہ پہلا سا اقتدار باقی نہیں پس رفتارِ زمانہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں نہ صرف یورپ کی سیاسیات بلکہ دوسرے برِّ اعظموں کے معاملات پر بھی ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ ڈالنی چاہیئے اور ساتھ ہی اُن اہم ترین تحریکات کو ایک غائر نظر سے دیکھنا چاہیئے جن کے باعث کچھ عرصے سے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو رہی ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس وقت جو چیز دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے و دنیا پر اپنا اثر ڈال رہی ہے وہ موجودہ غیر معمولی کساد بازاری ہے چیزوں کی قیمتیں کم ہو گئی ہیں لورپول میں گیہوں کی قیمت پچھلے تین سو سال میں اتنی کم نہیں ہوئی جتنی آج ہے۔ بے روزگاری کی ہر سو شکایت ہے یورپ بھر میں جس میں روس شامل نہیں، تقریباً ۱½ کروڑ بیکار آدمی ہیں اور اکیلے ممالک متحدہ میں ایک کروڑ ستر لاکھ آدمی ایسے ہیں جن کے کرنے کو کام موجود نہیں۔ ان میں سے اکثر کو گھر بیٹھے بھتہ ملتا ہے۔ باوجود ان آفتوں کے متمدن حکومت کے جنگی اخراجات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور سب سے صلح پسند ملک ممالکِ متحدہ جس نے جنگ سے قبل تقریباً چھ کروڑ پونڈ سالانہ اس مد پر صرف کئے سنہ ۱۹۲۰ء میں اس کا خرچ چودہ کروڑ کی خطیر رقم تک جا پہنچا۔ اس جنگی گرم بازاری کے اسباب تو فقط باہمی بے اعتمادی اور تمدنی دیوانگی ہیں۔ لیکن اس معاشی سرد بازاری کے اسباب کیا ہیں۔ اسکے چار بڑے سبب بیان کئے جاتے ہیں اول طلب کی کمی جس کی وجہ بے روزگاری، چین میں خانہ جنگی ہندوستان اور جنوبی امریکی ریاستوں میں سیاسی بے امنی، روس کی نشر و اشاعت قوموں میں غلط قسم کی معاشی علیحدگی کی تحریکیں اور تجارت میں تامین کا اجرا امیروں کی تنگ دستی، شرحِ مبادلہ کی تبدیلیاں وغیرہ ہیں۔ دوم، رسد

کی زیادتی جس کی وجہ کلوں کی ترقی رقبہ زیر کاشت کی توسیع اور امتناعی محاصل ہیں۔ سوم زر کا تلون جس کی وجوہ امریکہ اور فرانس میں دنیا کے ۶۰ فیصدی ذخیرۂ زر کا جمع ہونا اور چاندی کی ارزانی ہے۔ چہارم تاوانِ جنگ کی زیادتی جس سے بعض قوموں کی معیشت تباہ ہو کر دوسری قوموں پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔ **اس کا علاج** یوں تجویز کیا گیا ہے کہ رسد کو طلب کے مطابق کیا جائے۔ چین ہندوستان اور جنوبی امریکہ میں امن کے قیام کی کوشش کی جائے، ایک بین الاقوامی کانفرنس مدعو کی جائے جو سونے اور چاندی کی باہمی شرحِ مبادلہ کو مقرر کر دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متمدن دنیا اپنے معیارِ زندگی یعنی معیارِ عیش و عشرت کو برضا مندی خود کم کر دے۔

سیاسی دنیا میں سب سے بڑی سب سے طاقتور اور سب سے مالدار دولت اس وقت ممالکِ متحدہ امریکہ ہے۔ امریکہ بظاہر یورپی سیاسیات سے علیحدہ رہا ہے لیکن اب روز بروز یہ بات اس پر اور باقی ماندہ دنیا پر صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ امریکہ ہر بڑے بین الاقوامی معاملے میں مختلف ملکوں کے داخلی معاملات میں بھی دخل دے رہا ہے۔ فی الحقیقت دخل دینے پر مجبور ہے۔ دنیا کے سونے کا بیشتر حصہ اس وقت ممالکِ متحدہ اور فرانس میں جمع ہو رہا ہے۔ امریکہ کی بحری قوت سب سے زبردست ہے اس کے ذرائع پیدائش سب سے بہتر ہیں اُس کے کارکن سب سے زیادہ ہوشیار اور چست و چالاک ہیں، روس ساری سرمایہ دار دنیا کو چیلنج دے رہا ہے کہ تمہارے طریقے تمام غلط اور ظالمانہ ہیں اور میرے طریقے صحیح اور منصفانہ ہیں۔ وہ بیس تیس برس میں ممالکِ متحدہ کا سب سے بڑا مدِ مقابل بننے کا اُمیدوار ہے اور اپنی تمام پیداوار سے اور اپنی سولہ کروڑ آبادی میں تنظیم و صلاحیت پیدا کر کے وہ ایک نئی اشتراکی دنیا کے مرکز بن جانے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اپنے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دینے میں روز و شب ہمہ تن منہمک ہے۔ ہندوستان ایک آزاد یا نیم آزاد دنیا میں غلامی کی بیڑیاں کاٹ دینے کے لئے آزادی کی سب سے بڑی امن پسند لڑائی لڑ رہا ہے اس نے عمل کی دنیا میں اپنے روحانی تخیل سے کام لے کر نئے حربی آلات ایجاد کئے ہیں جن کا وار بجائے جسم کے دل پر پڑتا ہے۔ اس کا کام جس قدر دشوار ہے اسی قدر دلچسپی سے دنیا اس کی جد و جہد کو دیکھ رہی ہے۔ جمہوریت کی تحریک روز بروز زور پکڑ رہی ہے۔ جنگ سے پہلے یورپ میں تین جمہوری حکومتیں تھیں آج پندرہ ہیں۔ ان جمہوری ملکوں کی مجموعی آبادی تقریباً چھتیس کروڑ ہے "شاہی" ملکوں کی صرف سولہ کروڑ۔

ان معاشی و سیاسی تحریکات سے بہت زیادہ اہمیت رکھنے والی وہ عالمگیر **معاشری اور دیگر عام تحریکات** ہیں جو ایک نئی زندگی کی طرف موجودہ تمدن کی رہنمائی کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ فرد قدیم روایات سے کنارہ کش ہو کر اپنی عقل اور آزادی پر اصرار کر رہا ہے۔ وہ محض دوسروں کی عقلمندی سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا۔ وہ **انفرادی آزادی** اور خود اختیاری چاہتا ہے۔ اپنی راہ آپ اختیار کرنے کی آزادی خواہ اس اختیار اور اس آزادی میں وہ راہِ راست سے راہِ کج پر ہی کیوں نہ چل دے۔ نوجوانوں کے دلوں میں عام بغاوت کا ایک جذبہ کام کر رہا ہے بزرگوں کے خلاف بغاوت، مسلّم اخلاق کے خلاف بغاوت، مذہب کے خلاف بغاوت۔ اس سے خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے لیکن ساتھ ہی کچھ روشنی بھی جس کا نتیجہ وہ قلبی ہیجان اور دماغی بے چینی ہے جو ان باغیوں کو دوبارہ ایک جدید روحانی نشان کا طلب گار بنا رہی ہے۔ **ادنیٰ طبقوں میں** اپنی قدیم مظلوم حالت سے بیزاری اور بے اطمینانی پیدا کرنے والی انقلابی تحریک روز بروز بڑھ رہی ہے روس کی زندہ مثال نے ان مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اور وہ اپنے

پیدائشی حقوق پر بیش از بیش اصرار کر رہے ہیں۔ جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ایک اور نئی طاقت دنیا میں رونما ہوئی ہے جس کا گو ابھی آغاز ہی ہے مگر قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس کا فروغ دنیا کو ایک قطعاً نئی دنیا بنا دے گا۔ یہ ہے **صنفِ نازک** کی **طاقت**۔ اکثر ملکوں میں لاکھوں گھرانوں میں نسوانی حقوق بلکہ مساوی حقوق کا ٹیڑھا مسئلہ درپیش ہے۔ خانگی زندگیوں میں ایک ہل چل مچ گئی ہے جس سے اس قدیم ترین انسانی نظام کے متزلزل ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ مغربی دنیا بالخصوص امریکہ میں عورت مرد کی برابر کی شریک بن رہی ہے (امریکی شریف آدمی اکثر اپنی بیوی کی جوتی کے تسمے باندھتا دیکھا جاتا ہے) اور مشرقی دنیا میں بھی اب غلامی کے دور کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ گو واقعہ یہ ہے کہ اور محکوم جماعتوں کی طرح عورتوں کو بھی بعض ممالک میں ابھی متعدد دشواریوں کا سامنا ہے اور کچھ مدت تک رہے گا۔ **محکوم و مظلوم نسلیں** جابجا بیدار ہو رہی ہیں یہاں تک کہ انگلستان کے افریقی مقبوضات کی بابت بھی گذشتہ سال کے ایک سرکاری کمیشن کی رپورٹ ہے کہ سیاہ فام قوم غالباً ساٹھ ستر سال میں آزادی کا مطالبہ کرنے لگ جائے گی۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ مثلاً جنوبی افریقہ میں چالیس پچالیس ہی برس ہیں یہ لوگ اپنے زمانۂ تاریکی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں گو ان کے سفید حاکم ابھی ان پر طرح طرح کے ستم توڑ رہے ہیں۔ کوئی کالا آدمی سفید آدمی کا موٹر کار نہیں چلا سکتا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر صرف سفید قلی بوجھ اٹھا کر اجرت لے سکتے ہیں۔ رات کے ۹ بجے کے بعد کالوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں علیٰ ہذالقیاس لیکن سفید بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی کالوں کو ہوش آیا اور تختۂ الٹنا آثار ابھی سے خراب ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مختلف ملکوں میں کیا کیا ہوا؟ اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ اس کی تفصیلی داستان کی یہاں گنجائش نہیں چند ملاحظات کافی ہونگے۔ **ممالک متحدہ** ملک جہاں ایک کروڑ نوے لاکھ ٹیلیفون اور تقریباً ڈھائی کروڑ موٹر کار (ساری دنیا میں صرف سوا تین کروڑ) ہیں جس کی آبادی دنیا کے تقریباً نصف ٹین اور ریشم کی خریدار ہے جہاں نئے سے نئے خیالات چند ماہ یا شاید چند دنوں ہی میں پرانے ہو جاتے ہیں جو دنیا بھر کا ساہوکار ہے وہاں بھی معاشی سرد بازاری اور بے روزگاری نے اس سال کے میزانیہ میں تقریباً سوا چار ارب روپے کے خسارے کا احتمال پیدا کر دیا ہے جب دنیا کے سب سے مالدار ملک کا یہ حال ہے تو اوروں کا خدا ہی والی ہے۔ دنیا کی عام معاشی عسرت کو دیکھتے ہوئے امریکہ میں اس خیال نے ترقی کی ہے کہ جنگی قرضوں اور تاوانوں کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ **روس** میں سولہ کروڑ آدمی اپنے پنج سالہ لائحۂ عمل کو عمل میں لانے میں روز و شب مصروف ہے۔ بہت سی زمینداریاں مشترک ہو کر زیر کاشت آگئیں۔ ان میں نئی وضع کے برقی ہل چلنے پیداوار بقدر ایک چوتھائی کے بڑھی مختلف ملکوں کی طرف روسی غلے کی برآمد ہوئی۔ کروڑوں آدمی اپنے جوش میں اس نئے اشتراکی کام کی تکمیل میں مصروف ہیں دیکھئے کب تک یہ بار سہہ سکیں۔ ہاں مخالفین بھی معترف ہیں کہ گو تشدد سے کام لیا جاتا ہے لیکن مقررہ لائحۂ عمل ایک حیرت انگیز حد تک کامیاب ہوتا نظر آتا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے ستر لاکھ بچے مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے ۱۹۳۱ء میں ایک کروڑ دس لاکھ تھے ہر بچے کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے یہاں تک کہ وہ کمانے کے لائق ہو جائے۔ اشتراکی روسی بچوں کی جماعت میں اپنے آئندہ کے حامی و اتحادی پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے مفاد کو اشتراکی دولت کے مفاد سے ملا کر ہر فرد بشر کو اس دولت کا ایک آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی صحت اور تعلیم اور فراغت کی محافظ حکومت ہی ہے، ماسکو کے قریب کے پبلک باغ میں ہر روز تقریباً ایک لاکھ سیر کنندگان کا مجمع ہوتا ہے۔ **انگلستان** پر بُرے دن آئے دنیا میں انگریزوں

کا اعتبار کم ہوا۔ اُن کے سکے کی قیمت گھٹی ہندوستان میں ان کا اقتدار روبہ تنزل ہوا۔ اب انگریزی قوم پھر متحد ہو کر اپنی سلطنت اور طاقت کو سنبھالنے کے درپے ہے لیکن ایک ترقی کرتی ہوئی دنیا میں وہ پہلے سا تفوق پھر حاصل کر لینا جب انگلستان ہی بہترین صنعت گاہ تھا ناممکن ہی ہے جرمنی جو طوفانِ جنگ کے بعد خوب اُبھرنے لگا تھا اب پھر اس کی کشتی معاشی بھنور میں گھر رہی ہے لیکن یہ منچلا ملک سخت دشواریوں میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ اور اس کے سابق دشمن بھی سمجھنے لگے ہیں کہ اگر جرمنی ڈوبا تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوب جائیں گے جرمن ہمت کی ایک عمدہ مثال تحریکِ صحرا نوردی ہے۔ جرمن مرد اور عورتیں کندھوں پر چھوٹے چھوٹے بقچے لئے گھر سے نکل پڑتے ہیں اور دور دراز مقامات میں میدانوں میں پہاڑوں کے چشموں کے کنارے معمولی جھونپڑیوں میں مسافرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے مہینوں کے بعد پھر گھر کو لوٹتے ہیں اور یوں ان سفروں میں تجربہ اور علم حاصل کر کے اپنے نفس میں عزم و شجاعت کے اوصاف پیدا کر لیتے ہیں۔ اطالیہ میں سولینی کی فاسیت سرمایہ داری کی مخالف نہیں لیکن وہ نوجوانوں کی مکمل تنظیم صحیح تعلیم اور ان کے ربط و ضبط پر بہر لحاظ اپنی نظر رکھتی ہے۔ پوپ اور سولینی کے درمیان نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں سخت اختلاف واقع ہو رہا ہے۔ ایک کو اپنے اختیار پر اصرار ہے دوسرے کو اپنے اقتدار پر۔ چین ہر چند کمزور ہے ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم ہے خانہ جنگی کا شکار ہے اور جاپان اُس کی اِس حالت سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن ترقی کا خون اس کی رگ و پے میں برابر دوڑ رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ۱۹۱۹ء سے لے کر آج تک شاید ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گذرا جب ملک کے کسی نہ کسی حصے میں لڑائی نہ ٹھنی ہوئی ہو۔ اربابِ حکومت میں پھوٹ پڑی رہتی ہے، حکومت کنگال ہے، صرف اک شمالی چین میں پانچ لاکھ فوج برابر رعایا کا خون چوس رہی ہے لیکن اس پر بھی جائے حیرت ہے کہ چین کے نوجوان ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ سکونت، حفظانِ صحت، شادی ان سب شعبوں میں بالخصوص ساحلی اور دریائی مقامات میں نئے خیالات نے اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اندرونِ ملک کے ایک خطے میں جس کا رقبہ فرانس کے مساوی ہے پانچ کروڑ لوگ ایک نوع کی اشتراکی حکومت قائم کئے ہوئے ہیں ترکی میں بدستور وہی پہلا سا عزمِ کمال موجود ہے اگرچہ معاشی مشکلات نے بالفعل ملکی ترقی کو روک رکھا ہے۔ ایران میں رضا شاہ آہستہ آہستہ لیکن بتدریج نقل و حرکت، تحفظِ ملک تعلیم، اصلاحِ معاشرت، صنعت و حرفت سب میں ملک کو سیدھی راہ پر لئے جا رہا ہے۔ افغانستان بھی کچھ رینگتا معلوم ہوتا ہے ہندوستانِ جنت نشان میں جہنم کا سا ہیجان پیدا ہے۔ مدتوں سے کبھی اس ملک کو ایسے کرب و اضطراب کا سامنا نہیں ہوا جیسا آج ہے۔ گذشتہ سال کے دوران میں پہلے کانگرس اور حکومت میں مفاہمت ہوئی جس سے کانگرس اور بالخصوص مہاتما گاندھی کا اقتدار بڑھا اور آزادی کی امیدیں بندھیں پھر جا بجا ہندو مسلم تنازعات برپا ہوئے انگلستان میں قدامت پسندوں نے عنانِ حکومت سنبھالی اور ہندوستان کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہونے لگا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب گھر والے لڑیں جھگڑیں تو باہر والے کیسے نہ آدھمکیں۔ ظاہر ہے کہ قومی آزادی حاصل نہ ہو گی جب تک ہندوستان کی بیسیوں قومیں کسی نہ کسی طرح ایک قوم نہ بن جائیں گی۔ آزادی کی ندی "ہزارہا مصائب کی گھاٹیوں میں سے ہو کر بہتی ہے"!

بشیر احمد



التجائے محبت

CALCUTTA ART PG. WORKS LAHORE

محبت

محبت روحِ جسمِ عارضی ہے — محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایاتِ ہستی — محبت حق نما ہے حق رسی ہے

کبھی بھولے سے بھی مجھ کو نہ بھولے — وہ ساعت جس کی یادِ دلربا ہے
غذا ملتی ہے اس روحِ حزیں کو — مزے لیتا ہے یہ دل انتہا کے

سرِ کوہسار میں لیٹا ہوا تھا — سہانی شام تھی اور چاندنا تھا
مری پیاری، مرے دل کی تمنا — وہیں بیٹھی تھی اور میں گا رہا تھا

نہیں ہے آشنائے سوزِ پنہاں — مری امید کا مرکز، مری جاں
وہ مجھ پر مہرباں ہوتی ہے سن کر — وہ گانے جن سے دل ہو وقفِ حرماں

پرانا راگ اب اک میں نے گایا — اُسے اک قصۂ حرماں سنایا
حیا سے جھک گئیں آنکھیں پس اس نے — مری نظروں کو اپنے رخ پہ پایا

یہ تھا اک نوجواں عاشق کا قصہ — اور اک محبوبۂ سنگیں ادا کا
محبت میں گھلا وہ سالہا سال — مگر پگھلا نہ دل اس بے وفا کا

مری دھیمی، مری گہری صدائیں — مری افسردہ و غمگیں نوائیں
سفارش اپنی الفت کی چھپی تھی — مری ہر بات میں ہر اک ادا میں

کہا میں نے "بہ اندوہِ محبت — ہوا دیوانہ وہ برگشتہ قسمت...

بنایا اُس نے مسکن جنگلوں میں — ہوئی ہر روز بدتر اُس کی حالت

قیامت لیکن اب بھی ڈھا رہا تھا — تصوّر ہر طرف اُس بے وفا کا
گھنے سایوں میں، غاروں میں، ہر اک سمت — وہی تھی جس طرف وہ دیکھتا تھا

پھر اک دن اتفاقِ ناسزا سے — پڑی وہ ظالموں کے ہاتھ آ کے
یہ اپنی جان پر کھیلا اور اُس کو — بچایا موت سے بدتر جفا سے

وہ پچھتائی مگر بے کار تھا اب — بنی غمخوار لیکن بے اثر سب
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — جنوں رخصت ہوا جاں بھی گئی جب

بہت روئی بہت تڑپی مگر کیا؟ — علاجِ خستگی ہائے جگر کیا؟
مری پیاری مری جاں پر یہ قصہ — خدا جانے ہوا سُن کر اثر کیا

کُلا اک غازۂ سرخ اُس کے رُخ پر — حیا اور جذبۂ الفت نے مل کر
پھر اک خوابیدہ دھیمی سی صدا میں — مرا نام آ گیا اُس کے لبوں پر

محبّت رحم بن کر رو رہی تھی — وہ جانِ حُسن تمکیں کھو رہی تھی
مرے پاس اُٹھ کے آئی اور اچانک — وہ ہم آغوش مجھ سے ہو رہی تھی

غرورِ حُسن و اظہارِ محبّت! — حضورِ عشق اقرارِ محبّت!

بنے اس طرح ہم دونوں تن و جاں
بنا یوں حُسن غمخوارِ محبّت

حامد علی خاں

(ماخوذ و ملخص از کالرج)

اجتماعی زندگی کا نیا دور

ارسطو کا قول ہے کہ "انسان ایک معاشرتی حیوان ہے"۔ مل جل کر رہنے کی عادت جس حد تک انسان میں پائی جاتی ہے اُس حد تک کسی اور حیوان میں نہیں پائی جاتی ۔ اُس کا تمدن اُس کا مذہب اُس کا اخلاق سب اُس کی معاشرت کا پھل ہیں ۔ اُس کی معاشرت ہی ہے جس کی ضیا پاشی اور آبیاری نے دنیا کے لق و دق میدانوں اور گنجان جنگلوں کو جنت الفردوس کا نمونہ بنا دیا ۔ لیکن بحیثیت ایک حیوان کے اُس کی فطرت میں وہ بہیمیت بھی ہے جس کی جہاں سوزی اور تباہ کاری نے اس جنت کو پھونک کر ایک جہنم میں تبدیل کر دیا ۔

شہرہ آفاق جرمن فلسفی کانٹ نے خوب کہا ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں سے محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی ۔ انسانی فطرت کے اس میلان و اجتناب کو اُس نے انسان کی "بے میل ملنساری" سے تعبیر کیا ہے ۔ جس طرح وہ دنیا دو رنگی ہے جس میں انسان رہتا ہے بعینہٖ اُسی طرح خود انسان کی فطرت بھی دو رنگی ہے ۔

انسانی نفس کے اس تضاد و تلون سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے رنج و راحت کا سب سے بڑا سبب ہے لیکن اپنی یہی کشاکش ہے جو ترقی حیات کی ضامن بھی ہے ۔ انسان دوسروں کی بہترین خدمت اُس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے صحیح ذاتی مفاد کو مدِّ نظر رکھے اور وہ اپنے صحیح ذاتی مفاد کو اُسی وقت پا سکتا ہے جب وہ دوسروں کی سچّی خدمت کرے ۔ اُس کی ترقی اور قسمت کا دوسروں کی ترقی اور قسمت سے چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ لیکن پھر بھی اگر وہ بہترین انسان بننا چاہے تو لازم ہے کہ وہ دیانتداری کے ساتھ اپنی ہی شخصی خصوصیت پر زور دے اور اس کے اظہار کے تمام جائز ذریعے تلاش کرے ورنہ اُس کی حقیقی قوتیں بروئے کار نہ آئیں گی اور اُس کی روح کا جوہر اس مادی دنیا میں اپنی اصلی آب و تاب نہ دکھا سکے گا ۔

اِس زریں اصول کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ اچھے بُرے نتائج پیدا ہوئے ہیں جن سے تاریخ کے صفحات کہیں تاباں ہیں اور کہیں محض سیاہ ۔ بربریت کی حالت میں انسان کو ایک نوع کی آزادی حاصل تھی لیکن جوں جوں معاشرت کی تنظیم ہوتی گئی سود و زیاں کا خیال بڑھتا گیا اور نیکی بدی کے حدود معیّن ہوتے گئے اُس کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی گئیں اور بندشیں بڑھتی گئیں ۔ رکاوٹیں اور بندشیں کچھ اُسے بچانے اور سنوارنے اور بڑھانے والی اور کچھ اُسے بگاڑنے اور پچھاڑنے اور تباہ کرنے والی ۔ خاندانوں کے سرگروہ، قبیلوں کے سردار، قوموں کے بادشاہ، بغاوتوں کے سرغنے، مذہبوں کے پیشوا، عالم، واعظ، مفکر، رنگ رنگ کے رہنما بعض نوعِ انسان کو اپنی بے غرضی سے سیدھی راہ پر اور بعض اُسے اپنی خود غرض

سے غلط راہ پر لے گئے۔ نوعِ انسان طبقوں، نسلوں، قوموں، مذہبوں، رنگوں جنسوں اور خدا جانے کتنی قسموں میں منقسم ہوگئی بلکہ کہنا چاہئے کہ بحیثیت ایک ہستی کے بحیثیت ایک جسم کے وہ ہزاروں ٹکڑوں میں کٹ کر رہ گئی اور ہر فرد فروعات میں پھنس کر حقیقت سے بظاہر دور جا پڑا ! محض بظاہر کم از کم یوں ہماری عقل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ استیصال اور یہ انقطاع محض ظاہری تھا۔ اِن خطروں نے نوعِ انسان کے جسم میں ایک نئی جان ڈال دی اور اس گرفتاری نے ہر فرد کو اپنی آزادی حاصل کرنے پر ہمہ تن آمادہ کردیا !

آج مطلعِ عالم کا اَور رنگ ہے۔ ایک خشک پیاسی دنیا پر جد وجہد اور نزاع اور انقلاب کے دھواں دھار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کہیں چمک دمک ہے کہیں کڑک، کہیں ہوا کا زور، کہیں بجلیاں گرتی ہیں کہیں طوفان اُمڈے چلے آتے ہیں، کہیں ابھی سناٹا ہے لیکن دُور افق پر کڑکنے والی بجلیاں برابر چمک رہی ہیں، جہاں خاموشی تھی وہاں شورش ہے جہاں مایوسی تھی وہاں ہیجان ہے دنیا کا دل دہل رہا ہے۔ سوتی ہوئی قومیں جاگ رہی ہیں، بھولے بھٹکے لوگ اِدھر اُدھر تکنے لگے ہیں کہ ہم کہاں ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ افراد کو اپنی اپنی قوت اور عظمت اور جدّت آفرینی کا احساس ہو رہا ہے آج تک دنیا میں انسانی جمعیتوں کا شور برپا رہا ہے لیکن آنے والی دنیا میں انسانی فرد کارزورِ مشق ازپیش نمایاں ہوگا بلکہ آج کل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کہیں یہ قوت رونما ہو رہی ہے کہیں ہونے والی ہے اور کہیں بہت جلد ہو جائیگی! ایک نئے تمدن کا مہرِ عالمتاب جلوہ گر ہوگا کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہلاکت وتغیر کے تاریک بادلوں کے پیچھے جو آج دنیا پر محیط ہیں نکلنے والے آفتاب کی کرنوں کی سنہری رنگت جھلک رہی ہے۔ خدا کرے یہ فریبِ نظر نہ ہو!

گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں دنیا نے کیا کچھ نہیں دیکھا؟ اٹھارھویں صدی کا انقلابِ فرانس، انیسویں صدی کی قومی شورشیں، بیسویں صدی کے آغاز کی عالمگیر جنگ اور اُس کے بعد کی نسلی اور جمہوری تحریکیں اور اس سے زیادہ اہم اشتراکی اور بالشوی اور نسوانی بے چینیاں لیکن شاید ان سبھی سے زیادہ حیرت انگیز اکثر افراد کے سینے میں ایک کاوش، اپنی انفرادی آزادی کے لئے ایک کشمکش اور خود شناسی کے لئے ایک زبردست انقلابی جذبہ! جیسا کہ ظاہر ہے فرد بغیر جماعت کی اعانت کے اپنا مدعا یعنی اپنی خودی کی عظمت کو نہیں پا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ جماعت کہاں تک اُس کی زندگی میں دخل انداز ہو کہاں تک نہ ہو اور فرد کہاں تک معاشری دائرے میں کام کرے اور کہاں تک آزاد ہے؟

اِشتراکی یا اشتمالی مفکّرین اس کا یہ علاج بتاتے ہیں کہ موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کو یک قلم موقوف کر کے ایک ایسا قومی بلکہ بین الاقوامی اِدارہ قائم کیا جائے جس میں فرد کی آزادی بدرجۂ اتم نشوونما پا سکے۔ اشتراکی اور اشتمالی اور بالشوی اور نراجی دستور العمل کو تہذیبِ حاضرہ پر غایت درجہ اثر انداز ہوئے ہیں اور ان انقلاب پسندوں کا خاموش اثر ملک ملک میں جابجا نئے قوانین اور بالخصوص نئے خیالات میں صاف صاف نظر آ رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کا بیشتر حصہ فی الفور "اشتراکی" جامہ پہننے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ البتہ اکثر تعلیم یافتہ لوگ قدیم طرزِ خیال کو چھوڑ کر کوئی نہ کوئی جدید طریقۂ حیات اختیار کرنے کے

تمنائی ضرور ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا مسٹر ایل پی جیکس نے جو آکسفورڈ میں مانچسٹر کالج کے پرنسپل ہیں ایک بصیرت افروز کتاب "معاشرت کا فن"[1] شائع کی ہے جس میں انہوں نے بجائے ایک نیا لائحۂ عمل پیش کرنے کے انسانی تمدن کی ترقی کا **ایک نیا طریقہ کار** پیش کیا ہے۔ "تعمیری شہریت" کے اس خاکے میں غور کرنے میں بجائے "مکان اندیشی" کے "زمان اندیشی" کے طرز فکر کو ترجیح دی گئی ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک تماشا نہیں جو پھیلی ہوئی فضا میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے بلکہ ایک تجربہ ہے جو زمانے کے اندر جاری ہوا جاری ہے اور جاری رہے گا! زندگی ایک بنی بنائی ہوئی شے نہیں بلکہ ایک ہمیشہ بنتی بدلتی ہوئی حالت ہے لہذا انسانی نفس کے لئے لازم ہے کہ وہ بجائے مقدار کے معیار کی قدر کرنی سیکھے اور بجائے گننے کے کیسے کی طرف توجہ کرے۔ بجائے اس کے کہ وہ زیادہ سوچے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے وہ زیادہ اس بات پر غور کرے کہ جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں اُسے کس طرح کروں؟ مدعا یہ ہے کہ کام اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا اُن کے کرنے کا طریقہ۔ ہم ذیل میں اُن کے بیش بہا خیالات کا خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ تمدن اور اجتماعی زندگی کو اس دور میں اپنی ترقی اور بہتری کے لئے کن ذرائع کے اختیار کرنے کی ضرورت درپیش ہے اور کون سے طریقے ہیں جن پر عمل کرنے سے افراد اور اقوام اور نوعِ انسان اپنے اور ایک دوسرے کے لئے مفید اور موجبِ مسرت ثابت ہو سکتے ہیں۔

تمدن ایک بنی بنائی شے نہیں بلکہ انسان کی طرح قوت کا ایک زندہ مظہر ہے جو اُسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ بدلتا اور نئے سے نیا بنتا ہے۔ اُس میں خطرے ہیں جیسے زندگی میں بھی خطرے ہیں لیکن حیاتِ حاضرہ کی سب سے بڑی خصوصیت خطرہ ہے۔ تمدن ایک خطرناک مہم ہے۔ خطرناک اور اسی لئے شاندار اور زندگی بخش۔ ہمارا منتہائے نظر ہونا چاہئے اِس طرح جان دینا جس طرح اوٹس نے قطبِ جنوبی میں کپتان سکاٹس کے ہمراہ جان دی جب وہ یہ دیکھ کر کہ اُس کے ہمراہیوں کے لئے خوراک بہت کم رہ گئی ہے اور وہ خود اس قدر کم طاقت ہو رہا ہے کہ اُس کی موت یقینی ہے خیمے سے برف و باراں کے طوفان میں اکیلا چل نکلا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ یا اسلامی تاریخ سے ایک مثال لو تو اس طرح جیسے یرموک کے جنگ میں اُن تین مسلمانوں میں سے ہر ایک نے جان دی جو کارزار میں ایک دوسرے کے پاس زخمی پڑے تھے موت کی جاں کنی میں پیاس کی شدت سے بدن کا رواں رواں العطش الغیاث پکار رہا تھا لیکن ایک نے دوسرے اور دوسرے نے تیسرے اور تیسرے نے پھر پہلے کی طرف پانی کا پیالہ لوٹا دیا جس میں یہ کہہ کر کہ اُسے اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے اور یوں تینوں نے جاں نثاری کی ایک حیرت انگیز مثال دنیا میں قائم کی۔ ہمارا نصب العین ہونا چاہئے اپنے سورماؤں کی طرح مرنا!

[1] Time-Thinking سے "The Art of Living To-gether" سے by L. P. Jacks

میکانی طبیعیات اور "مکان اندیشی" کے دلدادوں نے اپنے نظریوں سے نوع انسان کو زندگی کا ایک غلط سبق پڑھادیا ہے۔ وہ اپنے "نقطۂ نظر" اور "منظرِعام" کا یوں ذکر کرتے ہیں جیسے زندگی اور دنیا کوئی ساکن و جامد چیزیں ہیں + زندگی میں ہر شے کی قدر و قیمت اُس کی پائیداری کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ درست ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی کی یاد بعض دفعہ گھرے سے گھرے غم میں محفوظ ہو جاتی ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ نیکی ضائع نہیں ہو جاتی بلکہ اپنی پائیدار یاد میں برابر قائم رہتی ہے +

"زمان اندیشی" یا "زمان فکری" خیال و فکر کا وہ طریقہ ہے جس میں مفکر چیزوں کو زمانے کی عینک لگا کر دیکھتا ہے۔ جو چیز زمانے کے اندر دیر تک قائم رہتی ہے وہ اسے سودمند اور عمدہ اور اعلیٰ سمجھتا ہے لیکن جو چیز جلد فنا ہو جاتی ہے وہ اُسے بے سود اور ناقص جانتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں تلاش کرتا ہے جو پائدار ہوں، ایسے کام کرتا ہے جو دیرپا ہوں۔ اس کے برخلاف تھوڑی دیر رہنے والی چیزیں اور جلد خراب ہو جانے والے کام "مکان اندیشی" یا "مکان فکری" کا نتیجہ ہیں۔ "مکان اندیشی" و "زمان اندیشی" میں کم و کیف کا تقابل ہے۔ مکان اندیشی کم پسندی ہے زمان اندیشی کیف پسندی۔ سادہ زبان میں یُوں کہو کہ پہلی صفت "دور اندیشی" ہے دوسری "کوتاہ اندیشی"۔ مکان اندیش ڈھیر پر مرتا ہے زمان اندیش گن کو چاہتا ہے۔ "زمان اندیشی" "معیار" "پایہ" "جوہر" "گن" ان کو اپنا منتہا بناتی ہے اُدھر "مکان اندیشی" "مقدار" "جسامت" "ڈھیر" "بہتات" ان کو اپنا مطمح بناتی ہے + "مکان اندیش" معاشری نظامات کی عمارات کھڑی کر دیتا ہے۔ "زمان اندیش" پوچھتا ہے یہ کب تک کھڑی رہیں گی؟ ہمیشہ جوں کی توں رہنے والی چیز کو نوع انسان برداشت نہیں کرسکتی۔ ہمارا مصنف کہتا ہے کہ اگر جنت بھی اسی نوع کی ہوئی تو اُسے کوئی کب تک پسند کئے جائے گا + نہیں صحیح جنت وہی ہے جس میں خدا کے نور کا جلوہ ہوگا جو ہر لمحہ نیا ہے!

سچے آرٹ میں، سچے فلسفے میں، بچوں کی فطرت میں جو ابھی غلط تعلیم و تربیت سے کج خیال نہیں ہو چکی ہوتی "زمان اندیشی" کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے + مسٹر جکیس کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں ایک تصویر خانے میں فرا انجیلیکو کی ایک تصویر جس میں بہشت میں فرشتوں کا منظر نقش کیا گیا ہے دیکھ رہا تھا + ایک نو دس برس کا لڑکا میرے ہمراہ تھا جو پہلی بار کسی تصویر خانے کی سیر کو آیا تھا + میں تصویر دیکھنے میں محو تھا کہ یکلخت لڑکے نے مجھے میری محویت سے یہ کہہ کر گویا بیدار کر دیا کہ یہ فرشتے کب تک یوں عبادت کرتے رہیں گے ؟ میں نے جواب دیا "بہت دیر تک - دیکھو تو وہ کیسے خوش ہیں"۔ اُس نے کہا "لیکن کیا ان کے گھٹنے تھک نہ جائیں گے"۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا "خیر اگر تھک بھی جائیں گے تو وہ اُٹھ کر اُس پیچھے والی خوبصورت چراگاہ میں ٹہلنے لگ جائیں گے"۔ لڑکے نے کہا "اور پھر یہ فرشتے کیا کریں گے، چراگاہ میں ٹہلنے کے بعد" میں نے کیسا بُرا جواب دیا کہ "پھر میرے خیال میں وہ یہیں آجائیں گے جہاں اب ہیں اور پھر نماز پڑھنے لگ جائیں گے"۔ اس پر بچہ بے اختیار رونے لگ گیا اور سسکیاں بھر بھر کر کہنے لگا "میں تو فرشتہ نہیں بننا چاہتا" + یہ بچہ بھی اَور بچوں کی طرح

"زمان اندیش" واقع ہؤا تھا + یہی سوال جو اُس نے کئے بہتر سے بہتر معاشری منصوبوں کے متعلق کئے جا سکتے ہیں کہ "یہ فرشتے پھر کیا کریں گے؟ اور کب تک اس حالت میں یونہی قائم رہیں گے"؟ بہتر سے بہتر معاشری نظامات ایک دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے جب تک اُن کے واضعین اُن کو ہر روز بہتر و اعلیٰ تر بنانے میں مصروف نہ رہیں کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے کوئی وجود یا کوئی منصوبہ یا کوئی شے خدا کی کائنات میں زندہ رہ سکتی ہے + آج کل کے منصوبہ باز آج کل کے کاریگروں کی طرح ہیں وہ ایسی شے بناتے ہیں جو ذرا ایک دن میں مٹی میں مٹی ہو جاتی ہے + اُن کے کام میں کارسانی ہوتی ہے۔ کارگذاری یا کاری گری نہیں ہوتی۔ جیسے وہ خود "گن" سے خالی ہوتے ہیں ایسے ہی اُن کا کام بھی بے بنیاد ہوتا ہے + آج کل کی سرکاری عمارتوں سے ذرا بلند نظر، فیاض طبع مغلوں کی عمارات کا مقابلہ کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس زمانے کے دیانت دار لوگ کس قدر جوہر آشنا اور ثبات پسند تھے اور آج کل کے عقلمند کس قدر کوتاہ اندیش اور ظاہر پسند ہیں + "مکان اندیشی" کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کائنات میں ہر شے کو مجبور و مقہور سمجھنے لگتا ہے" "زمان اندیش" محض چیزوں کو دیکھنے میں مصروف نہیں رہتا وہ اُنہیں سنتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے، تھامتا ہے اور سَو سَو طرح سے اُن کو آزماتا ہے جب جا کر سمجھتا ہے کہ وہ ایسی ہیں اور ویسی نہیں۔ اُس کا نفس ہمیشہ متحرک رہتا ہے، گویا حرکت کی پشت پر سوار ہو کر ہمیشہ محوِ جولانی ہے۔ منظر اُس کے لئے بدلتے رہتے ہیں۔ نئی سے نئی حالتیں اُس کے لئے رونما ہوتی رہتی ہیں۔ وہ دنیا کی چیزوں اور باتوں کو خوب طرح سمجھ کر تنگ نظری سے اُن کا پابند نہیں رہتا بلکہ اُن کی ازلی آزادی میں روز بروز شریک ہوتا رہتا ہے + "مکان اندیش" اپنی بندشوں میں گویا نثر کا دلدادہ ہے، "زمان اندیش" نظم کا، بلکہ نظم کی جکڑ بندیاں بھی اُس کے مطلب کی نہیں سو وہ موسیقی کا ہمنوا ہو جاتا ہے اور کائنات اُسے "مجبور" دکھائی نہیں دیتی بلکہ "آزاد" سنائی دیتی ہے + اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چیزوں کے "نظارے" اور فلسفے کے "نظریے" سب چیزیں جن سے محض آنکھ کو تعلق ہے ناکافی ہیں۔ ہم زمانے کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بے شک انسانی اجسام مکانیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہم "رہتے" مکان و فضا میں ہیں، اور "جیتے" ہیں زمانے کے دوران میں + ایک کل نظر میں جانچی جا سکتی ہے لیکن انسان اور اُس کی معاشرت یوں دیکھی اور سمجھی نہیں جا سکتی کیونکہ انسان اور انسانی معاشرت اور انسانی تمدن کا وجود اُن کے قائم ہو جانے میں نہیں بلکہ اُن کے متحرک اور زندہ رہنے میں ہے +

"زمان اندیشی" کی ایک زندہ مثال "مجلسِ اقوام" ہے۔ یہ مجلس محض بنائے جانے سے ہمیشہ کے لئے بن نہیں گئی اگر اس کے اراکین اپنی باہمی وفاداری کا ثبوت دیں گے اور دیتے رہیں گے اگر وہ محض کارندے نہیں بلکہ مسلسل کارندے بنے رہیں گے اور ہر روز وہ کام کرتے رہیں گے جس کا انہوں نے پہلے روز بیڑا اُٹھایا تھا تو اُن کی بنائی ہوئی مجلس زندہ رہے گی اور قائم ورنہ ہزاروں رات کی رات کے تماشوں کی طرح وہ بھی ایک تماشا ہو گی اور بس +

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ معاشری معاملات میں کوئی ادارہ قائم ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اُس کے کامون

کو ایسے انسان نہ نبھائیں جو صحیح معنی میں اُس ادارہ کے "امین" سمجھے جائیں۔ دیانت اور امانت داری کے بغیر کوئی نظام یا ادارہ، کوئی مذہبی یا دنیوی درس گاہ، کوئی مجلسِ شوریٰ، کوئی بنک یا کمپنی دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔

انسانی معاشرہ ایک موضوعہ شے نہیں بلکہ ایک زندہ وجود ہے۔ ہمارے نظامات اور دستور العمل اُتنے ہی زیادہ زندہ ہوتے ہیں جتنے زیادہ جرأت آمیز ہوں۔ جب ہم معاشرہ میں غم پسندی اور ناامیدی کے خیالات رائج کرتے ہیں تو ہم اس کی قوت اور زندگی پر گویا موت کی بجلیاں گراتے ہیں۔ "تعمیری شہریت" موجودہ مسائل کو لے کر اس سے عمدگی کے نصب العین کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس یقین کے ساتھ معاشرت کو بہتر بنانے میں مصروف رہتی ہے کہ دنیا میں اصلی اور پائدار قدور کی کوئی حد نہیں۔ اور یہ کام آزاد معتمد شہریوں سے سرانجام پاتا ہے نہ کہ مجبور و مقہور مزدوروں سے۔ کسی قسم کا قانون یا دستور ایک کارندے کو کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن بہترین کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا کہ بہترین کام صرف آزادی کے اندر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشری اصلاح بھی معاشرت کو اسی طرح بہتر بنا سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ اُس کے بوسیدہ حصّوں کی مرمت کیا کرے اُسے عام تقویت دے کہ وہ خود بخود زیادہ زندہ اور قوی ہو سکے۔ بلا شبہ "لکڑی کی ٹانگ" والا ایک بے ٹانگ آدمی سے بہتر ہے لیکن آخر تو اس کی ٹانگ فقط لکڑی کی ہے۔ تہذیبِ حاضرہ کے بہت سے مصلحین اپنی لنگڑی تہذیب کے لئے مختلف لکڑی کی ٹانگیں لئے پھرتے ہیں کہ یوں اس گرتی ہوئی ہستی کو سنبھالیں۔ ہمارا مصنف کہتا ہے کہ تمدّن کی بیماریوں اور کمزوریوں کی طرف زیادہ توجہ نہ کرو بلکہ اُس کی عام قوت کو بڑھانے میں اپنی قوتیں صرف کرو پھر دیکھو کہ کیونکر اُس کی علالت و نقاہت صحت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مسٹر جیکس نے اکثر موجودہ مصنفین پر نکتہ چینی کی ہے کہ اُن کا طرزِ خیال اور اُن کا فلسفہ علمِ تشخیصِ امراض سے مشابہ ہے۔ وہ تمدّن کو علیل الطبع سمجھ بیٹھے ہیں اُن کے الفاظ و اصطلاحات اس کے شاہد ہیں مثلاً مشہور فلسفی برٹرنڈ رسل "تشخیص" اور "مرض" کا مشتاق ہے۔ مسٹر آر۔ ایچ ٹانی (Tawney) نے "حریص معاشرہ کی علالت" پر ایک رسالہ لکھا ہے اسی طرح امریکہ میں ایک کتاب شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بکی ہے جس کا عنوان ہے "یورپ کا مرض"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ **تشخیصی طرزِ خیال** کس حد تک موجودہ افکار پر چھا چکا ہے۔

موجودہ تہذیب بلا شبہ علیل ہے لیکن علالت اور نقاہت ہی اس کی زندگی نہیں بلکہ ان پر زیادہ غور و فکر خود علالت و نقاہت کا موجب ہو جاتا ہے اور وہ یوں کہ معاشرہ اپنی کمزوریوں کی کہانی سُن سُن کر مضمحل ہو جاتی ہے۔ مشتہرین اپنی اپنی مجرب دواؤں کے اشتہار دیتے ہیں، عوام الناس ان عالی مرتبہ معالجوں کے باہمی مقابلوں اور مناقشوں سے سراسیمہ ہو کر کسی واقعی اچھے معالج تک رسائی پانے کے ناقابل ہو جاتے ہیں۔ فصیح و بلیغ مصنفین و مقررین معاشری خرابیوں اور خطروں کو بھیانک بنا بنا کر دکھاتے اور نامراد لوگوں کو اور نامراد بناتے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ باوجود ان علالت افزائیوں اور نقاہت نمائیوں اور غم پسندیوں کی چیخ و پکار کے معاشرہ کسی نہ کسی طرح زندہ بھی رہتی ہے اور برابر اپنا کام بھی کئے جاتی ہے۔ تہذیب کی بُری حالت پر جا بجا لکچر دیئے جا رہے ہیں اور خوف و ہراس کے نعرے بلند کئے جا رہے ہیں لیکن تعجب ہے،

کہ تہذیب پھر بھی فنا نہیں ہوتی + آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضرور کہیں نہ کہیں اس منحنی مریض کے اندر قوت کا کوئی ایسا خزانہ موجود ہے جو جلد ختم ہونے میں نہیں آتا۔ آؤ اسے ڈھونڈیں اور اس کے مناسب استعمال سے اُسے زیادہ تنومند و قوی بننے میں مدد دیں +

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہ تمدن جو زندہ رہنا چاہے وہ معاشرت جو متحد رہنا چاہے اُسے ہر روز قوت و اتحاد کو از سر نو تازہ کرتے رہنا چاہئے + اس ضمن میں موجودہ معاشری و تمدنی بحث و تحقیص میں بہت سے ایسے غلط الفاظ استعمال میں آرہے ہیں جن سے غلط بیانی اور غلط اندیشی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں + مثلاً "علم المعاشرت" جس سے بہت سے لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کہیں نہ کہیں علما کی الماریوں میں یا حکما کی کھوپڑیوں کے نیچے ایک خاص علم یا حکمت کا کوئی خزانہ مستور ہے جس کے حصول سے نوعِ انسان کی تمام معاشری خرابیوں کا کما حقہٗ سدباب ہو سکتا ہے لیکن کیا ایک تمدن جو بجائے معاشری خدمت کے معاشری "علمیت" کو سراہے کبھی فنا ہونے سے بچ سکتا ہے؟ ایک اور لفظ ہے "سلف گورنمنٹ یا سوارج"۔ اس لفظ میں آج کل ایک جادو سا ہے لیکن اس کی علمی بلند آہنگی بے کار ہو جاتی ہے جب تک اس کی اخلاقی روح زندہ نہ رہے مسٹر جیکس نے گویا گاندھی جی کے لفظوں میں کہا ہے کہ کوئی شہری اپنے ملک کے سوارج یا خود اختیاری حکومت میں کام نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنے ضبطِ نفس میں بھی خود اختیاری نہ برتے + جہاں ضبطِ نفس کی یہ خوبی ایک شہری کے اندر پیدا نہیں ہوتی وہاں جمہوریت اکثریتوں کا استبداد ہو کر رہ جاتی ہے +

"لیڈر" اور لیڈری کے معنی میں بھی ایک تبدیلی واقع ہو گئی ہے پہلے زمانے کے قائد اور رہنما خود جنگ میں یا تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے اُن کی قیادت عملی قیادت تھی خطرے کے وقتوں میں وہ میدان میں یا کہیں اور اپنے پیروؤں سے دو قدم آگے نظر آتے تھے + آج کل کے لیڈر گویا محض گیدڑ ہیں دور ہی دور سے بھبکیاں دینے والے یا زیادہ سے زیادہ "پلیڈر"، مفرّر سبز باغ دکھانے والے، پھسلانے والے یا ڈرانے والے اور بس +

"مسئلہ" "عقدہ" "دقت" "گتھی" یہ سب الفاظ ہماری کمزوری اور جلد بازی کا مظہر ہیں۔ ہم چاہتے ہیں "مسئلہ" "حل" ہو جائے "عقدہ" کی "کشائش" ہو "دقت" "دور" ہو جائے "گتھی" "سلجھ" جائے یہ ہے ہماری کمزور خواہش جو جلد اپنی حرص کو پورا کرنا چاہتی ہے + اس لئے ہم "خوشی" کے پیچھے دوڑتے ہیں "خوشی" بدقسمتی سے نوعِ انسان کے بیشتر حصے کا مرجع و منتہا ہو گئی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ جتنا اس نظر فریب اور دلفریب سیماب پا پری کے پیچھے بھاگو اُتنی ہی اور ہماری گرفت سے بعید نظر آنے لگتی ہے "مسئلہ" اور "سوال" فلسفہ اور ریاضی کی اصطلاحیں تھیں اور "حل" طبیعیات کی اور یہ وہیں تک محدود رہتیں تو بہتر تھا لیکن جب سے انہوں نے عام انسانی زندگی کے دائرے میں قدم رکھا ہے انسان کی معاشرت میں ایک ہلچل ڈال دی ہے + مختلف "ایمیوں" کے موجدوں نے نوعِ انسان کو اس ناگفتہ بہ حالت تک پہنچا دیا ہے۔ دلیر انسان کو اس بات کا صاف لفظوں میں اعتراف کرنا چاہئے کہ میرے پاس "معاشری مسئلہ" کا

"حل" موجود نہیں جو میں اپنے ہم جنسوں کی "خوشی" کے لئے پیش کروں۔ اُسے صرف یہ چاہئے کہ وہ اُن کی خدمت کے لئے اپنی ہنرمندی، اپنی چابک دستی، اپنا استقلال، اپنی سنجیدگی پیش کرے اور نتیجے کی فکر نہ کرے کہ کیا ہوگا اور کیا نہ ہوگا + جب ہم لوگوں کے آگے اُن کے شاندار مستقبل کی ایک "تصویر" پیش کرتے ہیں تو لازمًا وہ "تصویر" لفظوں یا رنگوں میں کھینچنی اور "قائم" کردینی پڑتی ہے لیکن زندگی اگر صحیح زندگی ہے تو وہ یوں قائم نہیں رکھی جاسکتی اُس کا کام ہے ہمیشہ آگے کو چلنا اور بڑھنا اور بڑھے جانا اسی لئے خوبصورت سے خوبصورت تصویر بہتر سے بہتر نقشۂ مستقبل کبھی پورا تسلی بخش نہیں ہوسکتا + ہماری زندگی بھی ایک "نظارہ" نہیں بلکہ ایک جاری عمل ہے ایک "ہوتی ہوئی شئے" ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے لئے مسرت میں پڑے رہنے سی بہتر ہے کہ وہ مسرت سے مشقت بلکہ مصیبت کی سمت چل دے۔ اس دنیا میں "منزل" و "مقام" کی تلاش لاحاصل ہے۔ یہ ایک دائمی سفرگاہ ہے جہاں "انجام" کی بجائے ہمیشہ آغاز کی جستجو کرنا انسان کا شاندار کام ہے + سو بہتر ہے کہ ہم "مسئلے" کی بجائے "چیلنج" اور "حل" کی بجائے "تجربہ" کے الفاظ استعمال کریں ہم مشکلوں کو حل کرنے کے درپے نہ رہیں بلکہ اُن سے "تجربہ" کرنے اور "تجربہ کار" بننے کی تمنا رکھیں + جب مشکلات اور مسائل ہمیں درپیش ہوں اور اگر زندگی بلند زندگی ہے تو اس میں سوائے مشکلات اور مسائل کے کوئی واقعہ درپیش نہیں ہوسکتا تو ہر ایسی گھڑی میں ہم ہر مسئلہ کو ایک "چیلنج" سمجھیں جو قدرت نے ہماری فطرت کو دیا ہے + ہم اس چیلنج سے خائف نہ ہوں، پیچھے نہ ہٹیں، کہیں دبک کر نہ بیٹھ رہیں، بھاگ نہ جائیں بلکہ خوشی اور دلیری سے "لبیک" کہہ کر اُس کی پیشوائی کو آگے بڑھیں + قدرت منتظر ہے کہ انسان کی فطرت اس تسخیر کے لئے آگے قدم بڑھا کر اُسے اور اپنے آپ کو بہتر و خوب تر بنائے جائے!

ہم انسان محض تجربہ کرنے والے ہیں اور ہمارے تجربوں میں کچھ ہمارے "حقوق" ہیں اور کچھ "فرائض"، حقوق اور فرائض زندگی کی جنگ کی تلواریں اور ڈھالیں ہیں، جنگ جو گذشتہ یا موجودہ وحشیانہ طریق سے نہ لڑی جائے بلکہ جو صحیح روحانی معنی میں خرابیوں کی تسخیر اور بہتری کے حصول کے لئے ہمیشہ جاری رہے + تمدّن ہے روح کا منظم معرکہ! کس کے خلاف؟ اُس خردمند قوت کے خلاف جو اس مخالفت میں موافقت کی راہیں پیدا کرتی ہے اُس بلند نظر دشمن کے خلاف جو ہمارا سچّا اور اصلی دوست ہے + اس معرکے میں انسان انسان کی پشت پناہ ہے۔ یہ ہے سچّی محبت نہ وہ جو خالی خالی جذبات یا ہوا و ہوس میں غرق رہتی ہے + ہماری عام شہری زندگی میں ابھی خدمت کی وہ خواہش، باہمی امداد کی وہ خوشی پیدا نہیں ہوئی جو ایک منظم فوج کی روح رواں ہوتی ہے + وہ دن نوعِ انسان کے لئے خوش قسمتی کا دن ہوگا جب ہر پیشہ گویا اپنے پیشے کا جھنڈا سنبھالے ہوئے ترقی کے میدان میں بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔

خرابیوں کو دور کرنے کا بہترین طریقہ خرابیوں سے دل آزردہ ہونا نہیں بلکہ خوبیوں کو اپنے جی میں بسانا اور اُن سے اپنی زندگی کو فروغ دینا ہے۔ "کم اندیش" آدمی کا طریقہ روک ٹوک ہے دور اندیش کا تحریک دینا۔ شاید کہا جائے کہ یہ محض "امید پسندی" ہے۔ "امید پسندی" ہے تو ہوا کرے آخر ناامیدی نے دنیا میں کیا کچھ کرلیا ہے کہ "امید پسندی" لیک

کر اُس کی جگہ نہ چھین لینا چاہیے۔ کسی کا قول ہے کہ "امید پسند" وہ ہے جسے ہر مشکل میں اک موقع نظر آئے۔ اس کے بخلاف "یاس پسند" وہ ہے جسے ہر موقع میں اک مشکل نظر آئے + انسان کی فطرت مشکلوں کی تسخیر کے لئے وضع کی گئی ہے اور وہ سچا انسان اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مشکلوں سے دست وگریباں ہو + اس ہر دم نئے کام میں پرانے نظامات اُس کے کام آتے ہیں + پرانے انسانی نظامات میں ایک مضمر قوت ہوتی ہے جو انہیں جلد فنا نہیں ہونے دیتی۔ یہ ہے گذری ہوئی صدیوں کی قوت جوان کی پشت پناہ ہے، ماضی کی شاندار روایات۔ حال زندہ ہے مگر زندہ ماضی کے ساتھ۔ نرا پھیلاؤ کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب تک وہ اپنے ساتھ کچھ گہرائی بھی نہ رکھتا ہو + اور نری سطے شدہ معاشری اصلاح سے معاشرت کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ معاشرہ کوئی بندرگاہ میں پڑی ہوئی کشتی نہیں وہ زندگی کے سمندر کا ایک تیز رفتار دخانی جہاز ہے جو اپنی شکستہ حالت میں بھی کچھ نہ کچھ چلے ہی جاتا ہے اور جس کی مرمت بھی جو ایک مشکل کام ہے ساتھ ہی ساتھ ہونی لازم ہے + انسانی نظامات کی یہ حیرت انگیز قوت ماضی سے ماخوذ ہے اور اگر غور کریں تو ہم پر ظاہر ہو جائیگا کہ وہ انسانی نظامات و ادارات زیادہ پائدار ہوتے ہیں جو امانت داری پر مبنی ہوں، جن کے چلانے اور کام کرنے والے قابلِ اعتماد امین ہوں اور جو نسلاً بعد نسلٍ ایمانداری اور استقلال کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیتے رہیں +

تمدّن کی ترقّی کے اسباب کیا ہیں؟ اور وہ کون سے ذرائع ہیں جو ہمیں دورِ حاضر میں اپنی انفرادی و معاشری بہبود کے لئے اختیار کرنے چاہئیں؟ ماضی کے تجربات اور حال کے مشاہدات سے اب ہم اس نہایت اہم نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرت کی ترقی اور پائداری کے **تین بڑے عناصر** ہیں + **اوّل** مہذب انسان کی اپنے کام میں ذاتی مہارت۔ اسے ہم اس کی عقلی قوت کہہ سکتے ہیں + **دوم**۔ بہت سے انسانوں میں امانت داری کا وصف جس کے ہونے ہوئے وہ افادۂ عام کے لئے قابلِ اعتبار امین بن سکتے ہیں۔ اسے ہم انسان کی اخلاقی قوت کہیں گے + **سوم** بعض خاص ترقی پذیر و ترقی طلب علمی و طبیعی طریقے جن سے مخاصم حقوق میں مصالحانہ طور پر مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ ہے انسان کی تنظیمی قوت +

مہارت، امانت داری، تنظیم یہ تینوں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے موجودہ تمدّن کی قوت و توانائی کے سب سے بڑے اسباب ہیں اور اس کی ترقی کے سب سے بہتر ذرائع بھی یہی ہوسکتے ہیں + ظاہر ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ ذاتی مہارت معاشرہ کے لئے کسی کام کی نہیں جب تک اپنے کام کا ماہر عوام کے فائدے کے لئے امین بن کر اُسے کام میں نہ لائے۔ نری امانت بے کار ہے اگر امین ہر طرح کی مہارت سے عاری ہے۔ تنہا علمی تنظیم نہ صرف لا حاصل ہے بلکہ جب تک لائق قابلِ اعتماد رہنما کارند ملیں یہ ایک نہایت خطرناک حربہ ہے جیسا کہ محاربۂ عظیم سے صاف طور پر ظاہر ہوا۔ غرض انسانی معاشرت کی صحیح ترقی کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ معاشری "امینوں" کو زیادہ سے زیادہ

تعداد میں تیار کرکے انسانی خدمت کے کام میں لگایا جائے ۔

اور یہ کچھ مشکل کام بھی نہیں۔ آج کل دنیا بھر میں اور بالخصوص مغرب میں مختلف پیشوں میں اور خاص کر صنعت و حرفت کے اکثر حلقوں میں اس قسم کے معتمدوں اور امینوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی ہے، ایسے اشخاص جن کے سپرد بڑے بڑے ذمہ داری کے کام ہیں اور جو اس کارکردگی کے لئے نہ کسی کی حمایت میں ہیں نہ اُن کی ہر وقت نگہداشت کی جاتی ہے +
موجودہ صنعتی تمدّن کا اس درجے کے شہری پیدا کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ تمدّن کے رگ و پے میں ابھی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے + اس خون کو زیادہ صالح بنانا، اس کے دوران کو تیز تر کرنا یہ کام ہے جو تمدّن کے مفکروں اور کارکنوں کو درپیش ہے اور تمدّن کی خوش قسمتی ہے کہ آج کل جب اسے چاروں طرف سے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہے، ان مفکروں اور کارکنوں میں ایک خاصی تعداد اپنی ترقی کے ان ذرائع کی طرف عملی طور پر رجوع کر رہی ہے +

قصہ کوتاہ "علمی شہریت" کا کام ہے ایسا شہری پیدا کرنا جو اس کے کام کا "امین" ہو سکے جو اپنے پیشے کے کام کو یوں نبھائے گویا یہ اک امانت ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے + ذرا ایک لمحے کے لئے غور کرو اور ایک ایسے شخص کا خیال کرو جسے تم جانتے ہو، جسے تم اپنا زر و مال دے سکتے ہو یہ یقین کئے ہوئے کہ اُس کے ہاتھوں میں وہ اسی طرح محفوظ و مامون ہوگا جیسے تمہارے اپنے ہاتھ میں، جو اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے ۔ بس ایسا شخص ہے ایک اعلیٰ درجہ کا شہری، ایک صحیح انسان اور ہماری تعلیم اور ہماری معاشرت اور ہمارے پند و وعظ اور ہماری جملہ مساعی کا یہی نصب العین ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسا شہری اور ایک ایسا انسان پیدا کرے + ہر شخص میں کسی نہ کسی نوع کی ذاتی مہارت پیدا کرنا، ہر کام کرنے والے میں امانت داری کا خیال بدرجۂ اتم بڑھانا، قوم و ملت کے ہر فرد کے نفس میں امانت داری کے خصائص محکم کرنا، یہ ہے ہمارا کام اور اس کام کے کرنے میں ہم بجائے ہوائی قلعے تیار کرنے کے ان مفید چیزوں اور اداروں اور اُن مردوں اور عورتوں سے کام لیں جو آج ہماری دنیا میں ہمارے ملک میں، ہماری قوم میں، ایک خاصی تعداد میں ہیں + ہم یہ نہ دیکھتے رہیں کہ لوگوں میں کیا کیا برائیاں اور کیا کیا کمیاں ہیں ۔ ہم یہ دیکھیں کہ ان میں کون کون سی خوبیاں اور کون کون سی صلاحیتیں ہیں ۔ اور کہیں کہ ہاں یہ ہے ایک اچھی شے، وہ ہے ایک کارآمد عنصر، آؤ ہم اسے لیں اور ایک بہتر اور مفید تر مرکب تیار کریں + "علمی شہریت" کا کام مرمت کرنا نہیں، ساخت کرنا ہے، وہ کمزوریوں کو نہیں دیکھتی، وہ عام قوت کو جانچتی اور ابھارتی اور استعمال میں لاتی ہے اور بالفعل اس بات کے ماننے کو تیار ہے کہ انسانی نسل کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ اوسط درجے کی خوشی کو پا سکے ۔ اس کا اصول ہے "جیسا مسالہ موجود ہے اُسے کام میں لاؤ"!

تمدّنِ حاضر ایک صنعتی تمدّن ہے ۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ لوگ الگ اور چپ چاپ بیٹھ کر کائنات کے مسائل پر غور کرنا اور اسی فلسفے میں غرق رہنا زندگی کا نصب العین سمجھیں ۔ زندگی کے معنی ہیں محنت اور صنعتی تمدن بھی گو ایک محنتی تمدن ہے ۔ اس تمدن میں درحقیقت سیاست کو اس قدر اہمیت حاصل نہیں جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے

اندر صنعت و حرفت کو سیاست سے زیادہ دخل ہے ۔ آج کل کے تمدن کو گویا ہر روز اپنی روٹی کمانی پڑتی ہے ۔ اِس لئے اِس تمدن کی قسمت اُس روزمرہ کے کام کے ساتھ وابستہ ہے جو اِس کے کارکن یا دستکار کرتے ہیں ۔ اگر وہ کام ردی ہے تو گویا اس تمدن میں گھن لگتا ہے اور اگر وہ کام عمدہ ہوتا جائیگا تو اس تمدن میں گویا عمدگی کی صورتیں پیدا ہوتی جائینگی یہ بات ظاہر ہے کہ باوجودیکہ دنیائے حاضرہ کے ملک الگ الگ سیاسی مملکتیں ہیں جن کے معاملات بظاہر سیاسی تدبیروں اور ریشہ دوانیوں پر منحصر ہیں لیکن دراصل یہ تمام ملک ایک دوسرے کے ساتھ کم و بیش زبردست معاشی و صنعتی رشتوں سے جکڑے ہوئے ہیں ۔ قومی حد بین الاقوامی ضروریات کے آگے بارہا مٹ کر رہ جاتی ہیں بہت کم لوگ ہیں جو دیر تک معاشی قوانین سے بے نیاز رہ سکتے ہیں معاشی تغیرات کا ملک ملک پر اثر پڑتا ہے ۔ شرح مبادلہ اور قیمت زر سے لے کر مختلف ملکوں کی پیداوار کی اچھی بُری فصلوں تک کا اثر دنیا بھر پر پڑتا ہے معیشت سیاست پر چھا رہی ہے اور اپنا زبردست اثر صاف طور پر پیدا کر رہی ہے ۔ اِدھر ملکوں پر ایک دوسرے کے معاشی حالات کا اثر پڑتا ہے اور اُدھر تمدن میں ہمہ گیری و یکسانی پیدا ہو رہی ہے ۔ یعنی سیاسی طور پر دنیا میں کثرت نمایاں ہے لیکن معاشی اور تمدنی طور پر وحدت سرایت کئے جاتی ہے ۔ قوموں کے معاشی حالات کسی ایک قوم کی حکومت کے بس میں نہیں بلکہ روز بروز یہ صورت ہو رہی ہے کہ ہر حکومت اِن حالات کے بس میں آ رہی ہے ۔

اس صنعت کے لئے جو موجودہ تمدن کی روح و رواں ہے ایک اخلاقی ضابطہ کی ضرورت ہے ۔ اخلاق کا ایک سیاسی ضابطہ ہے ، ایک مذہبی ، ایک فوجی اور ایک قانونی ضابطہ بھی ہے لیکن آج کل کے تمدن کو سب سے زیادہ **صنعتی اخلاق کی ضرورت** ہے جس سے اُس کی بنیاد استوار ہو ۔ اور اس اخلاق کا دریا اس ایک کوزے میں بند ہے کہ کام جو کیا گیا ہو وہ اچھا ہے یا بُرا ۔ "حزب العمال" صرف "یکساں مواقع" "حفظانِ صحت" وغیرہ کے نعرے مارنے میں معروف ہے لیکن سب لا حاصل ہیں جب تک پہلے وہ کام درست و مناسب نہ ہو یا نہ ہو سکے جو دستکار کے سپرد ہے ۔ مسٹر جیکس کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں قدیم آلات کے ایک مجموعے کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک غایت درجہ خوبصورت اصطرلاب دکھایا گیا جس میں نہایت خوبی اور دیدہ ریزی سے کام کیا گیا تھا ۔ یہ نفیس چیز تقریباً ہزار سال ہوئے حسین علی ایک مسلمان دستکار نے ہندوستان میں بنائی تھی ۔ پیتل پر مینا کاری کا کام تھا اور اصطرلاب کے کنارے پر نہایت خوبصورت عربی خط میں یہ زریں حروف کندہ تھے :- "یہ اصطرلاب عمل ہے حسین علی دستکار اور ریاضی دان کا جو خدائے تعالیٰ جل شانہٗ کا بندہ ہے" ۔ صنعتی اخلاق کا مکمل بیان اس کتبے میں موجود ہے ۔ دستکاری مہارت ہے ، ریاضی دانی قابلیت اور خدا کی بندگی وہ خوبی و عمدگی ہے جو اس مہارت کا صحیح مطمحِ نظر ہے ۔ بقول مسٹر جیکس جب تک عیسائی دنیا اِن اصولوں پر عمل نہ کرے گی اُس کا صنعتی تمدن صحیح راہ پر نہ آ سکے گا !

صنعتی تمدن کی ترقی کے تین ذرائع میں سب سے پہلا ذاتی مہارت ہے ۔ اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک شہری کو "اب تو آرام سے گذرتی ہے" کا ترانہ چھوڑ کر کلی طور پر اپنے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے

اور جب وہ اسے حاصل کرے تو اُسے عمل میں لانے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے کام کے دوران میں اپنے نفس پر پُورا ضبط رکھے ۔ وہ اپنے جسم و روح پر قابو پائے، اُس کے جملہ اعضاو حواس اس کے نفس کے اشارے پر محو کار ہوں اور اگر ضرورت پڑے تو وہ رسمی طریقوں سے بے اعتنائی برتنے کے لئے بھی ہمہ تن تیار ہو ۔ ہر نفیس کام کے منصوبے میں ہمیشہ جرات اور اُس کی انجام دہی میں ہمیشہ ضبطِ نفس درکار ہوتا ہے ۔ یونانی رومی اور اسلامی و ہندی عظیم الشان تعمیرات کا سر انجام دینا صرف قوی النفس اور بلند نظر لوگوں کا کام تھا ۔ اگر تم صحیح معنی میں انسان بننا چاہو تو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرو جس سے عہدہ برا ہونے کے لئے تمہاری ذاتی مہارت اپنی بہترین و قوی ترین صورت میں رونما ہو جائے ۔ نکمے کاموں کے کونے میں اپنی شخصیت کو پھسپھسا نہ بن جانے دو کہ کائنات میں انسان کا اصلی کام صرف ایک ہی ہے ، کام کرنا ہنرمندی اور مردانگی کے ساتھ ۔ مہارت یا ہنرمندی ہے عملی دانش یا یوں کہئے کہ وہ علم کا اظہار ہے کسی چیز کے ساخت کرنے میں ، یا وہ عقل ہے قوتِ ارادی کا لباس پہنے ہوئے ۔ عقل و توجیہہ ، علم و فضل ، خردمندی اور دوربینی سب اپنی اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ جب تک عقل عملی نہ ہو جائے ، جب تک علم کارکردگی میں تبدیل نہ ہو جائے ، جب تک خردمندی اچھے اور مفید کاموں کی صورت اختیار نہ کرے اُس وقت تک اس عمل کی دنیا میں کوئی اِن کا احترام نہیں کر سکتا ۔ اس سے یہ اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی تعلیمی نظام جس سے ایک طالب علم میں کسی نہ کسی مفید کام کی مہارت پیدا نہیں ہوتی ناقص ہے اور علم جو اسے اُس کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے خواہ وہ سائنس ہو یا ادب ، فلسفہ ہو یا دینیات ادھورا ہونے کی وجہ سے نہ صرف بیہود ہے بلکہ غالباً خطرناک ۔ سائنس کی بابت جو ایک طبقے میں یہ خیال ہے کہ وہ "کائنات سے انسانی خوشیوں کا عرق نچوڑنے کا ایک آلہ" ہے محض لغو ہے ۔ اِس طرزِ فکر نے بعض ایسے بدکردار سائنس دان پیدا کئے ہیں جن کے ذریعے سے قدرت نوعِ انسان کی نیم جہالت پر اپنے ستم توڑتی ہے ۔ سائنس نے اوّل اوّل آرٹ کو تباہ کیا تھا لیکن وہ وقت دور نہیں جب آرٹ کے ساتھ مل کر وہ انسان کی ذاتی مہارت کی شکل میں نمودار ہو گی اور یہ ہو گا سائنس اور علم و فن کا اور سائنس اور مذہب کا صحیح ملاپ ۔

کلوں کو بُرا بھلا کہنے میں یورپ کے بعض مفکرین بھی گاندھی کے ہم نوا ہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ کل کار بالکل بانہ مزدور انسانیت کے درجے سے گر کر نری کلیں بن جاتے ہیں ۔ کل سے وابستہ انسان اپنی ذاتی مہارت کھو بیٹھتا ہے اور اُس کی روح روز بروز کمزور پڑتی جاتی ہے ۔ کام محض زرگری کا ایک وسیلہ بن گیا ہے حالانکہ اگر اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معاشرت کو انسان کی محنت کا اصلی فائدہ اسی وقت پہنچتا ہے جب اُسے کسی نہ کسی طرح اپنی ذاتی مہارت کے دکھانے کا موقع ملے ۔ مزدوروں کی انجمنیں کم سے کم معیارِ اجرت پر زور دیتی ہیں مزدوروں کی نفسی و روحانی ترقی بلکہ اُن کی عام خوشی کے لئے بھی بدرجہا بہتر ہو کہ وہ بجائے اس کے کم سے کم معیارِ مہارت پر زور دیں تاکہ جو کام مزدور کرے اُس میں وہ کچھ دلچسپی لے سکے ۔ امدادِ باہمی کی انجمنوں میں اگر علاوہ نفع کی شرکت کے مہارت کی شرکت بھی شامل ہو جائے تو یہ بات کاریگروں کے لئے

بہت زیادہ نفع رساں ہو۔ موجودہ صنعتی نظام میں انسان کل کا غلام ہے۔ اُس کی روح تباہ ہو جاتی ہے، وہ خود کام سے اور زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ بیزاری بیسیوں شکایتوں کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ یورپ میں مہارت صنعتی کارخانوں سے نکل کر بازی گاہوں یعنی کھیلوں میں جاگزین ہو گئی ہے۔ یورپ کے کھلاڑیوں میں ذاتی مہارت کے بہترین نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہاں تک کہ لفظ (Sportsman) "کھلاڑی" کے معنی ہو گئے ہیں ایسا شخص جو شکست کھا کر بھی بددل نہ ہو، جو قابلِ اعتماد ہو، جو اپنے دشمن سے بھی بُرا سلوک نہ کرے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں "کھلاڑی" کے معنی جو ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اسی طرح وہاں آرٹ میں بھی مہارت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ "زیادہ سے زیادہ دستکاروں کی زیادہ سے زیادہ مہارت "تمدن کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے اور موجودہ تمدن کے لئے وہ مبارک دن ہو گا جب اُس کی جنگی اور صنعتی قوتیں مل جل جائیں گی اور دستکار سپاہی سے کہے گا تجھ سی دلیری میں سیکھوں گا اور جیسی مہارت سے تو اپنے ہتھیار چلاتا ہے ویسی مہارت سے میں اپنے اوزاروں سے کام لوں گا" اور سپاہی دستکار کو جواب میں کہے گا "تیرے میدانوں اور کھیتوں کے کام میں اب میری لڑائی لڑی جائے گی۔ وہاں اب میری قواعددانی میری وفاداری اور اپنا کام کرتے کرتے جان دینے کی خواہش اپنے جوہر دکھلائے گی۔ میں اے کاریگر اپنی وردی اتار کر تیرے کپڑے پہن لوں گا اور تو اور میں اپنے دلوں کی جرات اور ہاتھوں کی مہارت سے اِس طرح نوعِ انسان کی جنگِ زندگی میں تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں گے جیسے اب خونی لڑائیوں میں سپاہی مل کر برداشت کرتے ہیں"۔ پھر جنگی غضب ناکی صنعتی محنت میں جذب ہو جائے گی اور تمدن کے روزمرہ کے کام میں وہ قوت پسینہ ہو کر ٹپکے گی جو اب خون ہو کر میدانِ جنگ میں بہتی ہے اور یہ کام اب سے زیادہ پائدار اور اس لئے نوعِ انسان کے لئے اب سے بہت زیادہ سودمند ہو جائے گا۔ نپولین کا قول تھا کہ "ہر جنگ میں وقت سب سے اہم عنصر ہے"۔ یہ اُن جنگوں کا ذکر ہے جو اس لئے لڑی جاتی ہیں کہ مملکتوں کا رقبہ وسعت میں بڑھے، پھر ایسی عظیم الشان جنگ میں وقت یا زمانے کی کتنی قدر و قیمت ہو گی جو ملکوں کی وسعت کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے عمق کے لئے لڑی جائے۔ یہ ہے انسانی روح کی جنگ اُن قدروں کے حصول کے لئے جو پائدار ہیں اور غیر فانی! اسی لئے "زمان اندیشی" کہتی ہے کہ وہ کام کرو جو پائدار ہو اور پائدار کام وہی ہو سکتا ہے جس میں ذاتی مہارت اپنے جوہر دکھلائے۔

ہر شہری لازماً ایک دستکار ہے۔ اپنے نقطۂ نظر سے وہ کام کرتا ہے اپنے جسم و روح کے فائدے کے لئے۔ معاشری نقطۂ نظر سے وہ کام کرتا ہے دوسروں کے فائدے کے لئے اور یوں ہی دوسرے اُس کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ یہ حالت صرف اُس کی محنت کی نہیں بلکہ اُس کی فرصت کی بھی ہے، اُس کی فرصت ایک خاص معاشری قیمت رکھتی ہے۔ فرصت بھی ایک خاص نوع کا کام ہے، کوئی کھیل یا تفریح جس سے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے لطف اُٹھایا جائے۔ معاشرہ باہم مل کر کام کرنے کے لئے ایک منظم جمعیت ہے جسے اعلیٰ درجے کے کام سے تسکین و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کام کا درجہ اور پایہ ایک تو ہر کام کرنے والے کی مہارت اور جرات پر اور دوسرے ساختہ اشیا اور کام کی عمدگی پر منحصر ہے۔ اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ

کارکن کی فرصت اُس کی تمام محنت پر غایت درجہ اثرانداز ہے۔ اِن دونوں کا ایک دوسرے پر گہرا اثر پڑتا ہے + معاشرہ کا مل جل کر کام کرنا فرصت میں، چھٹیوں کے دنوں میں بند نہیں ہو جاتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے + جس طرح محنت میں فرد کی علیحدگی معاشرہ کے لئے مضر ہے اسی طرح فرصت میں بھی اس کی علیحدگی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے + ایک اخبار میں اشتہار دیا گیا جس کا عنوان تھا ”مل جل کر چھٹیاں بسر کرنے کی انجمن“ اگر لوگ اپنے کام اور آرام کے اوقات کو مل جل کر بسر کریں تو نہ صرف آرام کے دنوں میں بلکہ کام کے دنوں میں بھی اُن میں معاشرت کی صحیح حس پیدا ہو جائے اور وہ تمام اجتماعی کاموں کو بہتر طور پر سرانجام دے سکیں + کوئی جمہوریت نری توسیع سے ترقی نہیں پا سکتی۔ نری رائے دہندگی سے سیاست کمال کو نہیں پہنچتی بلکہ صرف صحیح محنت کے کاموں سے وہ قدرِ مشترک وجود میں آسکتی ہے جس کے متعلق رائے اور رائے دہندگی کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں + اس قدرِ مشترک میں محنت اور فرصت دونوں کا عنصر شامل ہے۔ **فرصت کا صحیح استعمال** وہ ہے جس میں محنت کی طرح ذاتی مہارت کا پرتو ہو اور جس کا نتیجہ خوبی نکلے + محنت وہ ہے جو ہر انسان کے لئے اُس کے مخصوص میلانات کا خیال رکھ کر اُس کے لئے منتخب کی جائے، جس سے اُس کی زندگی کی قدر بڑھے، جس میں حصہ لے کر وہ سمجھے کہ میری ذات دنیا کے لئے کارآمد ہے۔ اسی طرح فرصت وہ نہیں جس میں انسان صرف ٹامک ٹوئیے مارتا پھرے اُسے معلوم نہ ہو میں کیا کروں اور کس طرح یہ وقت گذاروں بلکہ فرصت وہ ہے جس میں انسان کا دل کسی ایسی تفریح میں مصروف ہو جس سے لطف اٹھانے کے لئے بالعموم اس کی عقل صرف ہو + کئی اشتراکی چاہتے ہیں کہ نظامِ سیاسی کی مدد سے روزانہ محنت کو کم کر کے صرف چار گھنٹے تک محدود کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ باقی بیس گھنٹے دستکار کیا کرے گا + جوں جوں تمدن ترقی کرتا جاتا ہے یہ لازم ہوتا جاتا ہے کہ متمدن آدمی کو اپنی فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال سکھایا جائے جس سے اس کو کام میں آرام کا اور آرام میں کام کا لطف آئے اور اس کی زندگی ڈانواڈول نہ رہے + بعضوں کا خیال ہے کہ کم از کم فرصت میں تو آزادی حاصل ہو۔ کم از کم آرام اور تفریح کی گھڑیوں میں تو کسی قسم کی بندش نہ ڈالی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محنت اور فرصت میں زندگی کا خون نہ دوڑے تو اُن پر اک مردنی سی چھا جاتی ہے جو اُن کی مسرت کو کھو ڈالتی ہے۔ ایک شراب خانے میں شراب بیچنے والی کا دن بھر گلاس بھر بھر کے دینے کی محنت اتنی بُری ہے جتنی اُس آوارہ گرد کی فرصت جو وہاں پڑا ہؤا دن بھر گلاس منہ کو لگائے رکھتا ہے۔ فرصت نصیب احمق ویسا ہی قابلِ رحم ہے جتنا محنت نصیب غلام + متمدن دنیا کی بابت عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ وہ عیش و عشرت میں غرق ہے گویا وہاں کے لوگ دن رات اپنے عیش و آرام میں مزے اڑاتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ متمدن آدمی جس قدر اپنی ”خوشیوں“ میں ناخوش ہے کسی اور شے میں نہیں + آج کل ”نظارہ بازی“ کا دور ہے۔ امیر لوگ اپنے کاموں اور اپنی خوشیوں سے اکتائے ہوئے ملک ملک میں ”نظاروں“ کی ہوس میں مارے مارے پھرتے ہیں دور دراز چیزوں کو دیکھنے کے لئے وہ ریل، موٹر، ہوائی جہاز غرض ہر تیز رو سواری میں تیزی کے ساتھ سرگرمِ سفر رہتے ہیں، ”چیزوں“ کے درمیان میں سے، اُن کے پاس سے، عموماً اُن سے کچھ دور ہی دور گذر جاتے ہیں، بھاگے دوڑے جاتے ہیں۔ یہ جلد بازی کس لئے ہے؟ ”نظارہ بازی“ کے لئے۔ یہ سرعت کس لئے ہے؟ مسرت کے لئے۔ پرانے زمانے میں خصوصاً

اسلامی اور ہندی دنیا میں لوگ کسی مقصد کے لئے سفر کرتے تھے، کوئی کام سیکھنے کسی سے درس لینے، کسی خانقاہ کی زیارت کرنے، وہ کسی مقام کو جاتے تھے وہاں پہنچ کر کچھ کرتے اور یوں بہتر انسان بنتے تھے لیکن آج ایک ایسے سیلاب کے مقابل میں دس ہزار ایسے سیر پسند تماشا بین ہیں جن کا سفر و سیاحت محض تیز رفتار گاڑیوں کی سواری میں اور ہوٹلوں کے بل ادا کرنے اور "نظارے" دیکھ لینے میں ہے۔ جہاں سے گئے جلد گئے جہاں پہنچے جلد پہنچے، رات رہے، کھانے کھاتے، ایندھن اُن کی خاطر جلائے گئے، سڑکیں اُن کی رگڑ سے گھسیں، محنتی مزدوروں نے ان کی ضروریات پوری کیں، چلئے سیر و سفر ختم ہوا۔ یہ ہے وقت گذارنا نہیں وقت کاٹنا، کسی نہ کسی طرح وقت کی مصیبت کو گلے سے اتارنا۔ اگر اس طرح وہ محض چیزوں کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ چیزوں پر غور کرنے کو جاتے، محض دور سے ہمالیہ کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ کسی چھوٹے سے ٹیلے پر خود چڑھنے کو جاتے، محض ایک اعلیٰ درجے کے جہاز میں دنیا کے گرد گھماتے جانے کو نہیں بلکہ قریب ہی کہیں سمندر کے کنارے یا دریا میں خود تیرنے خود ہاتھ پاؤں مارنے کو جاتے تو وہ زندگی کے میدان میں دو قدم اور آگے بڑھ جاتے، قوت اُن میں سرایت کرتی، اُن کی شخصیت کو جب اپنے اظہار کے ذریعے ملتے تو اُس میں نئی صلاحیتیں پیدا ہوتیں اور زندگی میں نئی خوبیوں کے تجربے سے نئی خوشیاں پیدا ہو سکتیں۔ سیر و سفر کے لئے تم اُن مقامات میں جاؤ جہاں تمہارے لئے دلچسپ مشاغل موجود ہوں جہاں تم بعض بڑی زندہ شخصیتوں سے، جہاں تم نوعِ انسان سے دوچار ہو سکو۔ یہ ہے سیر و سفر، یہ ہے سیاحت کی راحت، یہ ہے فرصت کا صحیح استعمال۔ ایسی فرصت درحقیقت زندہ محنت کی ایک شکل ہے اور ایسی ہی فرصت ہوتی ہے جس سے محنت کے اوقات میں مسرت کی رَو محنتی انسان کی روح در رواں میں دوڑ جاتی ہے۔ ایک عمل پسند انگریز مفکر کہتا ہے کہ جب میں پارلیمنٹ کا رکن بن جاؤں گا تو میں مزدوروں کی جماعت یا محنت والی جماعت میں شریک نہ ہوں گا بلکہ اپنی ایک الگ "فرصت والی جماعت" بناؤں گا۔ اور اس کی مدد سے پارلیمنٹ میں ایک نیا مسودۂ قانون پیش کروں گا جس کا عنوان ہوگا "عوام کی بہتر تعلیم کا انتظام جس سے وہ اپنی فرصت کے اوقات کا بہتر استعمال کر سکیں" یہ ہوگی "برطانوی آزادیوں کی دوسری سندِ اعظم" جس سے امیر و غریب لوگ وقت کو کاٹنے کی زحمت سے نجات پائیں گے اور جس کی دفعات کے مطابق کوئی نوجوان اپنی درس گاہ کے نصاب کو اُس وقت تک مکمل نہ کر سکے گا، اس وقت تک اُسے کامیابی کی سند نہ دی جائے گی جب تک وہ کسی نہ کسی کام میں کچھ نہ کچھ ذاتی مہارت پیدا نہ کرلے۔ یوں اُسے اِدھر اپنے کام پر اُدھر اپنی فرصت میں وہ مسرت حاصل ہوگی جو صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس ضمن میں مفکر مذکور خوب کہتا ہے کہ "بہشت میں لوگ نہ کام کریں گے نہ آرام۔ اُن کا کام آرام دونوں بیک وقت ہونگے"۔

یہاں تک ذاتی مہارت کا ذکر تھا۔ تمدن و ترقی کا دوسرا لازمہ امانت داری ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تمدن کا مرحلہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے اور اسی مشکل میں اُس کی ترقی کے شاندار موقع ہیں۔ لیکن اس مشکل کا کسے سامنا کرنا ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ، اپنی جگہ پر بھی لیکن بالخصوص سب کو مل جل کر۔ انسانی "امدادِ باہمی"

دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے نرا علم معاشرت بے سود ہے۔ اس کے لئے جرأت کی ضرورت ہے۔ اجتماعی جرات کی جرات جو باہمی اعانت اور باہمی وفاداری کے ذریعے سے اپنی قوت دکھلائے، جو نہ صرف وسیع ہو بلکہ عمیق، مشترک خطرات کا مل کر سامنا کرنے کی رضا کاری۔ کیونکہ خطرے اچھی اور بلند زندگی میں ہمیشہ موجود ہوتے ہیں اور موجود رہیں گے اور شکست بھی ہمیشہ ممکن اور بعض دفعہ اغلب ہوگی۔ لیکن تمدن یہی ہے کہ خوف کا جو انسانی روح کی ایک بیماری ہے کلی کر استیصال کر دیا جائے + خطرے اور ہمت کی جائے اتصال انسانی خوبیوں کا مقام پیدائش ہے + نپولین کی بابت کونٹ ویسگور کا بیان ہے کہ ایک دفعہ (شاید بورو ڈینو کی جنگ میں) جب وہ کارزار کا نقشہ سامنے رکھے اُس کے مطالعہ میں مصروف تھا تو ایک "اڈی کانگ" گھوڑا دوڑائے گھبرایا ہوا یہ خبر لے کر آیا کہ غنیم فرانسیسی فوج کے بیچ میں گھس آیا ہے اور فوج پسپا ہو رہی ہے۔ نپولین نے سر اٹھایا اور مڑ کر جھنجھلا کر جواب دیا "دور ہو جاؤ تم ناحق مجھے پریشان کرتے ہو" اسی طرح ہمیں اپنے اپنے کام میں اپنے آپ کو مضطرب نہ ہونے دینا چاہئے محض اس لئے کہ یاس پسند تاریک بین آکر پیشین گوئیاں کر رہا ہے کہ ملک و ملت غرق ہو رہے ہیں اور تمدن کی حالت سخت نازک ہے + ایک ترقی پاتے ہوئے تمدن کی حالت ہمیشہ نازک ہوتی ہے اور اس حالت سے ڈر کر ہمیں سہم نہ جانا چاہئے بلکہ صرف یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک چیلنج (دعوتِ مقابلہ) ہے حالات کا ہماری دلیر روح کو + ہم انسانوں کی ساخت خطرناک ہے اور شاندار۔ ہمارے خطرے کا دن ہمیشہ ہماری خوبیوں کی پیدائش کا دن ہوتا ہے + پس دقتیں اور مشکلیں زمانے کے اتفاقات نہیں ہیں بلکہ قدرت کے قوانین کے مطابق یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں + کامل سکون اور امن وامان ہو تو انسانی نسل کی قوت کے رشتے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اس لئے قانونِ ارتقا کا اقتضا ہے کہ "بہترین" کو اپنی بہتری کے حصول و استحکام کے لئے ہمیشہ اپنے سے کمتر سے برسرِ جنگ رہنا پڑے + خوبیاں ترقی پاتی ہیں تو خرابیاں بھی بڑھتی ہیں۔ انسان آگے بڑھتا ہے تو شیطان بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں رہتا۔ لہذا انسانی قوتوں کا مسلسل کام مسلسل طور پر شیطانی کارستانیوں کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر انسان اپنی انسانیت پر اصرار کرے تو شیطان کی شیطنت بھی اُس کی مخالفت چھوڑ کر اُس کی موافقت کا دم بھرنے لگتی ہے۔ پس مسرت سے تمدن کے عناصر میں اتحاد نہیں بلکہ افتراق پیدا ہوتا ہے اور مسرت کی بہ نسبت مشقت انسانی برادری کے اتحاد کا بہتر ذریعہ ہے مصیبت جب آتی ہے تو وہ بچھڑے ہوؤں کو بھی ملا دیتی ہے +

اس سے ظاہر ہے کہ تمدن کی دقتوں اور مصیبتوں اور خطروں کا سدِ باب متحدہ جرات اور متحدہ قوت ہی سے ہو سکتا ہے یہ جرات اسی وقت بروئے کار آئے گی جب ہر کارکن اپنے آپ کو اپنے کام میں سب کا "امین" سمجھ لے اور خوبی و خوش اسلوبی و امانت داری سے کام کرے + "ایک امین" کے معنی صرف یہی نہیں کہ اُسے اپنے کام میں اپنی قانونی ذمہ داری کا خیال رہے بلکہ یہ کہ وہ از خود ایمانداری اور شرافتِ نفسی سے کام لے۔ اُسے خود اپنے کام کو دیانت داری سے کرنے میں لطف ملے اور اسی میں اطمینان حاصل ہو کہ وہ کبھی کوئی ناپسندیدہ بات نہ کرے + امانت دار آدمی اپنی امانت داری کے لئے کسی نگہداں کا محتاج نہیں۔ امانت داری کے لئے دماغ میں عقل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی سینے میں دل کی حاجت ہے + ہر سچا انسان

اپنے ہر کام اور اپنی ہر بات میں نوعِ انسان کا امانت دار ہے اور بطور کام کرنے والے اور کام لینے والے کے اُس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں جن پر اصرار اور جن کا احساس اُس کی اور دوسروں کی ترقی کے لئے لازم و لابد ہے۔

بطور کارکن کے اُن کا فرض اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے لئے ایک ایسا پیشہ اختیار کرے جو معاشری طور پر مفید ہو اور پھر وہ اپنے کام کو بوجہِ احسن انجام دے۔ بطور آجر یا کام لینے والے کے اس کا فرض ہے کہ اپنے کارندوں کو عمدہ کام کرنے کی ترغیب دے۔ اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے۔ حقوق کے ضمن میں بطور کارکن کے ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے لئے ایک ایسا پیشہ منتخب کرے جسے وہ خوش اسلوبی سے نبھا سکے تاکہ وہ اپنی کارکردگی میں سب کے لئے سودمند ثابت ہو۔ بطور کام لینے والے کے اس کا حق ہے کہ جو چیز وہ خریدے وہ عمدہ ہو اور اس میں کسی قسم کا دھوکا نہ ہو، اپنے آرام کے حصول کا بھی تک کو حق ہے لیکن یہ حق نہیں کہ اُس کی مسرت کسی طرح دوسروں کے لئے ذلیل مشقت کا موجب ٹھہرے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی معاشرت کو ایک ایسی جمعیت بنایا جائے جس کے ارکان باہمی امانت داری کے ساتھ روزمرہ کے کام میں باہمی وفاداری قائم رکھیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ غور اور تسلی بخش ہے کہ ایسی جمعیت کا قیام محض ایک لغو منصوبہ نہیں بلکہ اس زمانے میں بہت سی ایسی قومی اور بین الاقوامی جماعتیں اور انجمنیں موجود ہیں جن میں اصول مذکورہ پر خاصی حد تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ یہ بالخصوص مغرب کی کاروباری دنیا میں پائی جاتی ہیں اور اُن کی کاروباری دیانت داری شہرۂ آفاق ہے۔ بنک، بیمہ کمپنیاں، امدادِ باہمی کی انجمنیں، انگلستان کی عدالتیں اور پولیس اور محکمۂ طب، مجسٹریٹ عورتیں اور بالخصوص ملک ملک کے سائنسدان جن کے ذریعے سے بتدریج بین الاقوامی اتحاد کی خواہش فروغ پائے گی ان میں سے بہت سے ادارے اور افراد امانت داری کے جذبات سے معمور نظر آتے ہیں اور گمان ہوتا ہے کہ عجب نہیں نوعِ انسان کی آئندہ تنظیم سیاسی نہیں بلکہ صنعتی یا علمی یا اور کوئی شکل اختیار کرے اور دنیا کے لوگ باوجود مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کے، باوجود مختلف سیاسی شکنجوں میں مقید ہونے کے اپنے درمیان اتحاد و موانست کے نئے ذریعے پیدا ہوتے دیکھیں اور بالآخر گویا ایک ہی گھرانے کے رہنے والے ہو جائیں۔

"امانت داری" کے ذکر سے "ذمہ داری" کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ عام خیال ہے کہ انسان ذمہ داری کو پسند نہیں کرتا۔ یہ غلط ہے۔ مہذب انسان کبھی پورا خوش نہیں ہو سکتا جب تک وہ کوئی اچھا کام اپنے ذمے نہ لے۔ مشہور بات ہے کہ انسان، بالخصوص متمدن انسان ذمہ داری سے گریز نہیں کرتا بلکہ صرف اپنی ذمہ داری کو وقتاً فوقتاً تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ انسان فطرتاً ایک ذمہ دار وجود ہے وہ ایک پیدائشی امین ہے اُس کے فرائض ہیں ضرور ہیں مگر ان سب فرائض کی بنیاد اُس کا اپنے فرائض کو ادا کرنے کا حق ہے۔ یہ حق کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس پر اعتبار کیا جائے۔

کسی شے یا کسی شخص کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ اُس شے سے کیا کچھ بنتا ہے وہ شخص کیا کچھ کرتا ہے۔ جب کسی شے کی تعریف کی جائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شے کیا ہے جب تک یہ بھی بیان نہ کیا جائے کہ کسی کو اُس شے کے ذریعہ سے کیا کرنا چاہئے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ انسان ایک دوپایہ جانور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے سیدھا ہو کر چلنا چاہئے اور بیٹھے پیچھے

یا بڑے بڑے زندگی نہ گذارنی چاہیئے۔ اگر ہم کہیں کہ سانپ زہریلے ہیں تو مدعا یہ ہوگا کہ ہم لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اُن سے بچ کر رہیں + اسی طرح تمام سچائیاں اور تمام صداقتیں فی الحقیقت اوامر و نواہی کی شکلیں ہیں۔ صداقت کے معنی ہیں کچھ نہ کچھ کرنے، کسی سمت چلنے کی ہدایت نہ کہ جم رہنے کی کوئی کیفیت۔ صداقت ہے ایک فعلیت یا مصروفیت ایک قوت نہ کہ اک نرا جینا + یہی اصول معاشری زندگی پر بھی حاوی ہے۔ شہری ہونے کے کسی مملکت یا جماعت کے رکن ہونے کے صریح معنی یہی ہیں کہ وہ شہری یا رکن ایک چست ذمہ دار شخص ہے جس کے فرائض ہیں، ایک ایسا شخص جسے چاہیئے کہ کچھ کرے اور جتنے اُس شہری یا رکن کو زیادہ فوائد یا جتنی زیادہ عزت حاصل ہوگی اتنی ہی اس کی ذمّہ داریاں اور بڑھ جائیں گی +

ایک شہری کا سب سے بڑا حق ذمہ داری کا حق ہے اپنے فرائض اپنے ذمّے لینے اور اُنہیں انجام دینے کا حق بلکہ ایک متمدن شہری کا تو یہ بھی حق ہے کہ بغیر کچھ اُجرت لئے کوئی کام سرانجام دے + کچھ عرصہ ہوا (سنہ ۱۹۲۵ء میں) امریکہ میں ایک مشہور شخص ڈاکٹر چارلز شٹائن میٹز کا انتقال ہوا۔ وہ برقیات کا ماہر تھا اور کئی برس تک وہاں کی مشہور الیکٹرک کمپنی کا علمی ماہر رہ چکا تھا + کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا امیر کبیر ہے اور مختلف شرکتوں میں اُس کے بیش قرار حصّے ہیں اور اُس کا مشاہرہ بھی گراں قدر ہے + جب وہ مرگیا اور اُس کی وصیّت اخباروں میں چھپی تو لوگ یہ سن کر ششدر رہ گئے کہ اُس کی جملہ جائداد جو اُس نے ترکے میں چھوڑی تین سو پونڈ کا بیمہ ہے اور ایک ٹوٹی پھوٹی موٹر اور چند اور ناقابلِ ذکر اشیا + پھر معلوم ہوا کہ اس کے حصے صفر تھے اور وہ کچھ مشاہرہ نہ لیتا تھا + برضائے خود اُس نے ان چیزوں کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا قول تھا "میں اپنا کام کروں گا محض کام کی خاطر، سونے چاندی کو اس سے کچھ واسطہ نہ ہوگا" مسٹر جیکس کہتا ہے کہ "شٹائن میٹز بھی اسی نوع کا آدمی تھا جیسے حسین علی" + کیا ہم اس قوم کی حالت پر اظہار تاسف کریں جس میں کبھی ایک حسین علی نہیں لاکھوں حسین علی موجود تھے، خاموشی کے ساتھ، شوق کے ساتھ، دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ، بغیر روپے کی طمع کے بغیر کسی اور لالچ کے کام کرنے والے، محض عزت کے خواہاں اور وہ بھی اکثر چھپے ہی چھپے، دل سے کام کرنے والے، زندگی کی تاریکیوں کو اپنے کام اور اپنے ایمان کی روشنی سے چمکا دینے والے سچے انسان! کیا ہم افسوس ہی کریں کہ یہ لوگ کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ نہیں تاسف لاحاصل ہے اور یاس خیز۔ اب بھی عوام میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں اشخاص ضرور ایسے ہونگے جن میں حسین علی بننے کی صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ وہ سمجھیں کہ اُن میں یہ صلاحیت ہے اور بشرطیکہ وہ دیانتداری کے ساتھ اپنی اس صلاحیت کو عمل میں لے آئیں +

انسان جسے اپنے فرائض پر حق حاصل ہے اُسے یہ بھی حق ہے کہ معاشرت اُسے روز بروز بہتر و برتر حق منتخب کرنے کا موقع دے۔ بلکہ وہ چاہے تو بجائے آرام دہ کام کے ایسا کام چُنے جس میں اُسے تکلیف ہو کہیں غریبوں کی امداد کرے کہیں دردمندوں سے ہمدردی کرے + کیا آج ہزاروں ایسے افراد موجود نہیں جو خاموشی کے ساتھ ایسے ایسے کام کرتے ہیں؟ عام خیال کے مطابق اگر معاشرت خوشیوں کو سب میں برابر تقسیم کر دے تو سب انسان مطمئن ہو جائیں۔ لیکن یہ درست نہیں + خوشیوں کا برابر بانٹنا اور پھر یہ یقین ہو سکنا کہ وہ برابر بٹ چکی ہیں ناممکن ہے۔ زیادہ تر اس لئے کہ ہم میں سے ہر فرد جب تک اپنی

خوشی میں تھوڑی سی اپنی شخصیت نہ ملالے اُس وقت تک کبھی پورا خوش نہیں ہو سکتا + اور خوشی کے مرکب میں شخصیت کا جزو محض ایک دلچسپ اور مفید کام کی مدد ہی سے مل سکتا ہے کسی دوسرے کی دی ہوئی خوشی سے انسان کبھی زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا +

مذکورہ بالا باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کے حقوق و فرائض محض ایک قومی جمعیت کے حقوق و فرائض ہیں + وہ محض ایک گاؤں کا یا شہر کا باشندہ نہیں + ایک تو وہ اپنے ملک کا باشندہ ہے، یہاں اس کے حقوق و فرائض سیاسی ہیں۔ دوسرے وہ دنیا کا ایک باشندہ ہے یہاں اُس کے حقوق و فرائض صنعتی ہیں۔ تیسرے وہ کائنات کا باشندہ ہے یہاں اُس کے حقوق و فرائض آفاقی ہیں + بحیثیت ایک رائے دہندہ کے وہ اپنے ملک سے متعلق ہے، بحیثیت ایک کارکن کے وہ نوعِ انسان سے رشتہ رکھتا ہے اور بحیثیت ایک انسان کے وہ ساری کائنات سے وابستہ ہے + ان میں سے ہر حلقے میں اُس کے حقوق و فرائض ہیں ہر ایک میں جداگانہ اور پھر سب میں سے ملے جلے + ان میں ہر حالت کا دوسری حالت پر اثر ہوتا ہے اور ان کے باہمی اثرات سے حقوق و فرائض کا ایک بظاہر نہایت الجھا ہوا سلسلہ پیدا ہوتا ہے جو در اصل اندرونی طور پر ایک متحدہ حقیقت رکھتا ہے اور جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ وسیع ہے کائنات کی وسعت کی طرح اور عمیق کائنات کی مدت کی مانند + اپنی روزمرہ کی دنیاوی زندگی میں ہم کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہماری چھوٹی سی دنیا پر کائنات کے آئین و قوانین حاوی ہیں اور قدرت کی طاقتیں انسان کی مصروفیتوں کو ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھ رہی ہیں اور اس زندگی میں ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم ان کی اس ہمدردی سے مطمئن اور اُن کے ان آئین و قوانین کے بخوشی پابند رہیں!

ذاتی مہارت اور امانت داری کو فروغ دینے کے ساتھ تعمیری "شہریت" کا تیسرا مقصد معاشری تعلقات کو بہتر و خوب تر بنانے میں **علمی طریقۂ تنظیم** کا اجرا و استعمال ہے جس سے معاشرت کی خرابیاں خوبیوں میں تبدیل کی جا سکتی ہیں + پروفیسر جوزیا روئس نے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک قابل کارکن تھا ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب "جنگ اور بیمہ" شائع کی جس میں اُس نے نوعِ انسان کی ترقی کے لئے ایک نئی اور حیرت انگیز تجویز پیش کی + وہ مدت سے اپنے ایک منصوبے "محبوب ملت" کی تکمیل میں مصروف رہا تھا اُسے خیال تھا کہ ملت ایک آزاد آدمی کی وفاداری کا صحیح منتہا ہو سکتی ہے + اُس نے دیکھا کہ مذہب اور سائنس کا ملاپ جس پر اک عرصے سے بہت کچھ قابلیت اور جوش صرف ہو رہا ہے محض دونوں کے اصولوں کے اک نظری یا خیالی تطابق سے وجود میں نہیں آ سکتا بلکہ اُس کے لئے ایک کے بلند روحانی خیالوں کا دوسرے کے صحیح کاروباری طریقوں سے امتزاج ضروری ہے + اس غرض سے اُس نے کاروباری دنیا میں نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی ایسا موجودہ ادارہ ہو جس میں یہ امتزاج عملی جامہ پہنے ہوئے نظر آئے + اکثر لوگوں کو سُن کر تعجب ہو گا کہ اس قسم کا ادارہ نہ اسے کسی سیاسی نہ کسی مذہبی نظام میں ملا بلکہ اُس مشہور کاروباری شراکت باہمی میں جسے بیمہ کمپنی کہتے ہیں + بیمہ کمپنی میں اُسے اپنی "محبوب ملت" کا ایک جیتا جاگتا نمونہ نظر آیا، ایک ایسا ادارہ جس [illegible] افادۂ عام کا اصول اور [illegible] وفاداری اور علمی طریقۂ تنظیم کی شکل [illegible] دکھائی دی

وہ اپنی "محبوب ملت" میں مجسم دیکھنا چاہتا تھا + اُس زمانے میں جب پہلے پہل بیمہ کمپنیاں قائم کی گئیں تو اُن کے قابل
لفتہ حیثیوں اور اَور لوگوں کا بھی عام طور پر خیال تھا کہ نوعِ انسان کی نامعتبری اور کم دیانتی اس قسم کے نظام کو نہ چلنے دے گی۔کہا
جاتا تھا کہ اس سے دنیا میں قتل اور خودکشی بڑھے گی، گھر جلائے جائیں گے، جہاز خود ڈبو دیئے جائیں گے یعنی لوگ اپنی چیزوں
کا بیمہ کرکے آپ انہیں برباد کردیں گے اور یوں بیمے سے فائدہ اُٹھائیں گے + لیکن نتائج نے ان عقلمند پیشین گوئوں کو جھوٹا
ثابت کردیا۔ اور یہ ظاہر کردیا کہ انھوں نے انسان کی امانت داری کے جذبے اور علمی تنظیم کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا تھا۔ آج
دنیا میں ہر قسم کی چیزوں کا بیمہ ہوسکتا ہے، تجارت کا ناقابلِ وصول قرضے کے خلاف، ہماری تعطیلات کا بُرے موسم کے
خلاف، ہم اپنی جان کا بیمہ کرسکتے ہیں، اپنے گھوڑے کی جان کا بیمہ کرسکتے ہیں علیٰ ہذا القیاس + باہمی بیمہ اخلاقی اور علمی اصولوں کے
امتزاج کی ایک عملی صورت ہے۔ متمدن انسان کی امانت داری اس میں بہترین شکل میں ظاہر ہوئی ہے + پروفیسر روئس نے ولیلاً
یہ کہا کہ جس طرح افراد کے جان و مال کا بیمہ ہوسکتا ہے کیا وجہ ہے کہ اسی طرح قوموں کے جان و مال کا بھی بیمہ نہ ہوسکے۔ سرقہ،
تشدد، زلزلہ، قحط، متعدی امراض، شہروں کی آتش زدگی اور اَور ایسے ہی خطرے بلکہ باہمی لڑائیاں بھی، کیا وجہ ہے کہ قومیں ان کے
خلاف بیمہ نہ کرسکیں + منصوبہ یہ تھا کہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی شرکت یا فنڈ بنایا جائے جس کا انتظام بین الاقوامی امینوں کے
ہاتھ میں ہو اور اس شرکت کو انہیں علمی اور کاروباری اصولوں پر چلایا جائے جن پر آج کل بیمہ کمپنیاں چلائی جاتی ہیں + بین
الاقوامی شرکت ایک معتدبہ بین الاقوامی جائداد کی مالک ہو۔ اُس کی حصہ دار مختلف قومیں ہوں۔ اور اس کی ملکیت ملک ملک
میں اس طرح بٹی ہوئی ہو کہ اس پر حملہ کرنا اور اس کا غصب کرنا آسان نہ ہو + قوموں کے جان و مال کا یہ شرکت بیمہ کرے + مثلاً
ملکوں کے قومی جہازوں کا اس طریقے سے بیمہ کیا جائے اور اسی طرح اور چیزوں کا بھی + انجمنِ اقوام کے تجربے سے ظاہر
ہے کہ سیاسی تنظیم معاشی یا معاشرتی تنظیم سے زیادہ مشکل شے ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ بین الاقوامی تنظیم سیاسی شکل میں ہو
کیونکہ ایسی تنظیم کے لئے صرف نیک نیت منصف مزاج امینوں کی حاجت ہے جن کے پیشِ نظر کسی ایک قوم کی بہبود
نہ ہو بلکہ ساری نوعِ انسان کی ترقی۔

سیاست ہمیشہ صنعت و حرفت کو اپنی جکڑ بندیوں میں مقید کرنے پر تلی رہتی ہے جس سے اُدھر سیاست کو اِدھر
صنعت کو ہمیشہ مختلف خطروں کا کھٹکا لگا رہتا ہے + کاروباری معاملات کے انتظام کا تقاضا ہے کہ اُن کے متعلق جو فیصلے
کئے جائیں وہ مضبوط ہوں اور جلد سے جلد کئے جائیں۔ سیاسی بحث مباحثہ کی طرح ان معاملات کی گتھیوں کو بھی اگر جلد سلجھایا نہ
جائے تو اس سے کاروبار میں عموماً سخت خسارے کا احتمال ہوتا ہے + اسی لئے مالیات کے معاملے میں حکومتوں کو اکثر بہت
جلد فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ منظم جمہوری حکومتوں میں ماہرینِ مالیات کی ایک جماعت ہوتی ہے جن سے ارکانِ حکومت ہمیشہ
مشورہ کرتے ہیں اور ایسی باتوں میں عموماً انہیں کے مشورے پر عمل ہوتا ہے + کچھ عجب نہیں کہ جوں جوں تعلیم کا معیار بلند تر ہوتا جائے
سیاسی ادارات بھی امانت داری کے اصولوں پر قائم ہونے لگیں اور بجائے بار بار منتخب ہونے والے سیاست دانوں کے

حکومت کی باگ ڈور بیش از بیش ایسے امینوں کے ہاتھوں میں آجائے جو عمر بھر کے لئے یا ایک لمبے عرصے کے لئے حکومت کے کارکن مقرر کئے جائیں۔ قومی اور بین الاقوامی نظامات میں آئندہ غالباً یہی طرزِ عمل برتا جائے گا۔ جمہوریت کے محاسن ایک مدت سے متمدن دنیا کے دل پر نقش تھے، اب کچھ عرصے سے اُس کے نقائص بھی تجربے کی روشنی میں ظاہر ہوئے ہیں۔ نیابت نے سیاست کے دائرے میں اپنی قابلیت بھی دکھائی ہے اور اپنی جہالت بھی۔ اجتماعی زندگی کے نئے دور میں نری جمہوریت کام نہ دے گی بلکہ ذاتی مہارت اور امانت داری اور علمی تنظیم کے ہاتھوں تعمیری شہریت کی زبردست بنیاد قائم ہوگی!

ل ب

فاروقِ اعظم

ایک دفعہ احنف بن قیس رؤسائے عرب کے ساتھ حضرت عمرؓ کے ملنے کو گئے۔ دیکھا تو دامن چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ احنف کو دیکھ کر کہا "آؤ تم بھی میرا ساتھ دو، بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے"۔ ایک شخص نے کہا "امیر المومنین! آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔" فرمایا "اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ" (مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟)

ایک دفعہ بیمار پڑے، لوگوں نے علاج میں شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن بلا اجازت نہیں لے سکتے تھے۔ مسجدِ نبوی میں جا کر لوگوں سے کہا کہ "اگر آپ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں"۔ اس کارروائی سے طلبِ اجازت کے سوا یہ ظاہر کرنا تھا کہ خزانۂ عامرہ پر خلیفۂ وقت کو اتنا اختیار بھی نہیں"۔

جفائے روزگار

یہ نظم عثمان ساگر کے کنارے جو حیدرآباد کا ایک رومان آفرین تالاب ہے لکھی گئی

کل منہ اندھیرے صبح کو تالاب کے قریب
یاد آ رہا تھا دل کو خرم کا کل حبیب

مس ہو رہی تھی قلب و جگر سے خنک نسیم
بوجھل سی تھی ترائی کی بھیگی ہوئی شمیم

جھونکے تھے اضطراب کا پہلو لئے ہوئے
مرطوب و نرم دوب کی خوشبو لئے ہوئے

تھی مدّوجزرِ آب کے اندر چھڑی ہوئی
ٹھنڈی ہوا کے تُند تھپیڑوں کی راگنی

افسانہ کہہ رہا تھا شبِ تارِ ہجر کا
نظروں سے اُس طرف کا کنارہ چھپا ہوا

میداں ہرے بھرے سبد گل فروش تھے
جنگل کے طائرانِ خوش الحاں خموش تھے

دُھندلی بلندیوں پہ گھٹاؤں کا تھا دھواں
گردوں سے آ رہی تھیں دبے پاؤں بُوندیاں

چھایا ہوا تھا صبح کے ماتھے پہ رنگِ شام
اِتنے میں اک کسان نے جھک کر کیا سلام

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے
اُٹھی نگاہ، رہ گئے سب جھن سی ہو گئے

اللہ رے عدلِ عالم و انصافِ روزگار
ناکارہ کے قدم پہ جھکے شاہِ کاروبار

بیچارگی کے ساتھ مخیّر جھکائے سر
مغرور بھیک مانگنے والوں کو دیکھ کر

قوّت کا اور ضعف کے در پر سرِ نیاز
صحت اُٹھائے حیف ہے بیماریوں کے ناز

پودوں کے ڈر سے صاحبِ گلشن ہو بیقرار
غنچوں سے اور لرزہ براندام ہو بہار

اوچھی زمیں کے پاؤں پہ چرخِ بریں جھکے
بھُوکے کے آستاں پہ غذا کی جبیں جھکے

ناطاقتی ہو کشورِ طاقت میں شہریار
فاقے کو اور رزق بنائے سپاہدار

در کھٹکھٹائے دستِ کریم اور فقیر کا
فولاد اور مان لے لوہا حریر کا

عقلِ سیاہ کار کو سجدے کرے جنُوں
خاشاکِ بزدلی پہ ہو تلوار سرنگوں

مردانِ کوہ و دشت و دلیرانِ گرم خُو
عاجز ہوں دخترانِ تمدّن کے روبرُو

بارِ خدا! "یقین" ہو قرباں "گمان" پر
لعنت ہو اس زمین پہ تُف آسمان پر

جوش

دمتی

لیڈی موہن	
مس دمتی موہن	لیڈی موہن کی بھتیجی۔ ایم اے کلاس کی طالب علم
پروفیسر کرپا دیالم	
مسٹر ودیا شنکر ایم، اے	ایم اے کے دوسرے طالب علم
مسٹر اشتہ ایم، اے	
چند طالب علم	ایم اے کلاس کے طالب علم
دو خدمتگار	

زمانۂ حال

پہلا ایکٹ

پہلا سین

دن ہفتہ۔ وقت ۴ بجے بعد دوپہر۔ باغ میں کچھ طالب علم کتابیں سمیٹ کر چلنے سے پہلے باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چاروں کے چاروں بے تکلفی سے پاؤں پھیلائے گھاس پر سینے کے بل لیٹے ہیں۔

پہلا طالب علم۔ کتابیں کے جادو سے خدا بچائے۔ عورت کے کاٹے کا منتر ہے مگر کتاب کا مارا قطعی لاعلاج ہے۔

دوسرا طالب علم۔ بہت خفا ہو، کیا بات ہے؟

پہلا طالب علم۔ خفا نہ ہوں تو کیا ناچوں؟ یہ ظالم کتاب کہہ رہی ہے کہ جوانی خدائی سہرا ہے۔ ایک بڈھے میاں بکتے ہیں "ہائے جوانی، ہائے کالج کی بے فکری، ہائے کالج کی شرارتیں"

تیسرا طالب علم۔ بس اس بات سے یہ کتاب ظالم ہو گئی؟

پہلا طالب علم۔ سوتیلی ماں سے بھی بڑھ کر ظالم۔ سوتیلی ماں تو صرف باپ سے پٹواتی ہے یہ کتاب اگر کچھ بھی سچی ہے تو اپنے آپ سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ بندۂ خدا سوچو تو سہی کہ ہمیں کالج میں چھٹا سال ہے اور قسم لے لو جو کبھی بھول کر بھی جوانی یا بے فکری یا شرارت کو دیکھا ہو۔ گویا ہم زندہ نہیں رہے محض فرمائشی گدھے بنے رہے اگر کالج کی زندگی پُرلطف ہوتی تو ہم کیا پاگل تھے کہ امتحان پاس کرنے کے لیے یوں مرے جاتے۔

دوسرا طالب علم ۔ بے فکری تو یقیناً نذارد ہے ۔ آج میچ ، کل ڈیبیٹ (debate) پرسوں امتحان اور روزروز بعض پروفیسروں کا منہ دیکھنا ۔ کالج کیا ہے عذاب ہے ۔

پہلا طالب علم ۔ میرے خیال میں ہندوستان میں تو اگر انسان پر جوانی آتی ہے تو شاید بڑھاپے ہی میں آتی ہے ۔

تیسرا طالب علم ۔ شروع ہوگئی تمہاری خیالی بک بک ۔ شرارت کو جی چاہتا ہے تو کرو کون منع کرتا ہے ؟

پہلا طالب علم ۔ تم کیوں نہیں کرتے ؟

تیسرا طالب علم ۔ میں تو تیار ہوں ۔

تینوں (مل کر) تم تیار ہو تو ہم بھی تیار ہیں ۔ تجویز بتاؤ ۔

تیسرا طالب علم ۔ (کچھ سوچ کر کاغذ اور پارکر پن نکال کر) تجویز یہ ہے کہ جو میں کہتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں اس پر دستخط کرو مگر کسی کو خبر نہ کرو اور نہ اس تحریر سے بعد میں انکار کرو ۔

تینوں (زور سے) منظور ۔ منظور ۔ منظور ۔

تیسرا طالب علم (بولتا جاتا ہے اور لکھتا جاتا ہے) ڈیر پروفیسر کرپا دیالم یہ گمنام خط نہیں ۔ آپ ہمارے دستخط پہچانتے ہیں اور ہم میں سے ایک دستخط کنندہ خود آپ کے ہاتھ میں یہ خط دے گا ۔ جو کچھ آپ کو کرنا ہو کل دو بجے سے پہلے کرلیں اگر دیر ہوگئی تو ذمہ داری آپ کی ہوگی ۔ جو اطلاع ہمیں آپ کو دینی ہے وہ یہ ہے کہ کل دو بجے کے بعد مس دمتی موہن کی کوٹھی میں ایک نئے ڈرامے کے ری ہرسل (rehearsal) کی تجویز ہے ۔ یہ ڈراما خود مس دمتی موہن کے متعلق ہے اور ہمیں یقین ہے کہ نقلی ڈراما ہوتے ہوتے ایک اصلی ڈراما ہو جائے گا یعنی بظاہر تو معلوم یہ ہوگا کہ مس دمتی موہن یونہی سٹیج پر مسلمان ہو جاتی ہے اور نکاح کرلینی ہے مگر گمان یہ ہے کہ وہ نکاح اور تبدیلِ مذہب دونوں شاید اصلی ہوں ۔ سٹیج نقلی ہوگی ناٹک اصلی ہوگا ۔ آپ نے اسلام کی تعریف میں جو شاندار لیکچر دیا یہ غالباً اس لیکچر کی فصاحت کا کرشمہ ہے ۔

آپ کے فرمانبردار

طالب علم ایم ۔ اے کلاس

بقلم خود ــــــــــ

بقلم خود ــــــــــ

بقلم خود ــــــــــ

بقلم خود ــــــــــ

مکرر یہ کہ اگر مس دمتی مسلمان ہوگئی تو ہم بھی فوراً اسلام قبول کرلیں گے اور اگر آپ اس کے بعد بھی مسلمان نہ ہوئے تو ہم آپ کو بم کے زور سے مسلمان کریں گے ۔ اسے مذاق نہ سمجھئے ۔

(چاروں کے چاروں دستخط کر دیتے ہیں)

تینوں طالب علم۔ دستخط تو ہم نے کر دیئے۔ اور ہم اپنے وعدے پر بھی قائم ہیں مگر اس میں شرارت کیا ہوئی؟
تیسرا طالب علم۔ شرارت یہ ہے کہ پروفیسر کرپا دیالم ایسا فول[1] بنے گا کہ پھر کبھی سینیر سٹوڈنٹس (Senior Students)[2] پر دھونس نہ جمائے گا۔ مگر جو تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو یہ لو خط موجود ہے اسے پھاڑ دو۔
پہلا طالب علم۔ اعتبار تو ہے مگر جھوٹ میں اور شرارت میں تو ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے تم تو صرف جھوٹ کا قلعہ تیار کر رہے ہو۔
تیسرا طالب علم۔ جناب من! کیا آپ چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتے بھی گھبراتے ہیں؟
تینوں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جو تمہارا جی چاہتا ہے تم کرو۔

دُوسرا سین

وقت پانچ بجے شام۔ لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ ایک خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے

لیڈی موہن۔ سلام دو (خدمتگار دبے پاؤں نکل جاتا ہے اور مسٹر ودیا شنکر (تیسرا طالب علم داخل ہوتا ہے۔ لیڈی موہن کو جھک کر آداب بجالاتا ہے)
لیڈی موہن۔ آئیے، بیٹھئے۔ کیا آپ دمنتی سے ملنے آئے ہیں۔
ودیا شنکر۔ جی نہیں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک نہایت ضروری معاملہ میں آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔
لیڈی موہن (نہایت متانت سے اور اس خوف سے کہ کہیں چندہ نہ مانگتا ہو نہایت خنکی سے) کہئے
ودیا شنکر۔ مختصر عرض یہ ہے کہ میں پروفیسر کرپا دیالم کو ایک خط دینے جا رہا ہوں اور آپ کی بہت ہی مہربانی ہوگی اگر اس کی نقل پر آپ تصدیق کر دیں کہ آج پانچ بجے شام آپ نے اصلی خط دیکھ لیا ہے۔ (یہ کہہ کر وہ خط لیڈی موہن کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ لیڈی موہن پڑھتی جاتی ہیں اور اُن کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگتا ہے)
لیڈی موہن (نہایت غصہ سے) آپ کو شرم نہیں آتی کہ میری بھتیجی پر یہ افترا باندھ رہے ہیں اور پھر مجھ سے ہی اس جھوٹ کی تصدیق کراتے ہیں۔
ودیا شنکر۔ لیڈی موہن! خدا کے لئے آپ خفا نہ ہوں۔ یہ ایک خفیف سی دل لگی ہے۔ کالج کی زندگی میں چند دن کے لئے لطف پیدا ہو جائے گا۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے دم نکلا جاتا ہے۔ اپنی طبع زاد شرارت کے نتیجہ پر ذرا قہقہے لگالیں گے۔
لیڈی موہن۔ دمنتی کا نام بدنام ہو اور آپ اسے دل لگی سمجھیں۔ میں خیال کرتی تھی کہ آپ اس کے دوست ہیں۔

---

[1] الو بنے گا [2] بڑی جماعتوں کے طلبہ

ودیا شنکر ۔ لیڈی موہن! دمنتی نیک و بدشہرت کی قید سے بہت بالا تر ہے

لیڈی موہن ۔ پھر اس جھوٹ کا فائدہ ؟

ودیا شنکر ۔ اس میں نقصان ؟

لیڈی موہن ۔ سراسر نقصان ہے (یہ کہہ کر دونوں کاغذوں کو لیڈی موہن پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیتی ہے)

ودیا شنکر (ہنستا ہے اور ہنستے ہوئے کہتا ہے) میری توقع پوری ہوئی اور اسی لئے آپ کی خدمت میں دونوں نقلیں ہی دی تھیں اصلی خط میرے پاس موجود ہے۔ میری والدہ ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ لیڈی موہن کو غصہ بھی جلدی آتا ہے اور پھر مان بھی جلدی جاتی ہیں۔

لیڈی موہن ۔ تمہاری والدہ ؟

ودیا شنکر ۔ سکول کی آپ کی سہیلی پاربتی ۔

لیڈی موہن ۔ ارے! تم پارو کے بیٹے ہو! (غور سے دیکھ کر) شکل بھی کچھ کچھ ملتی ہے ۔ تبھی تم اس قدر شریر اور دلیر ہو۔

ودیا شنکر ۔ کیا اس سے ملتی جلتی شرارت آپ نے اور میری والدہ نے اپنی ایک استانی کے ساتھ نہ کی تھی ؟

لیڈی موہن (یاد کرتے ہوئے) کیا پارو کو وہ زمانہ اب تک یاد ہے ؟ ۔

ودیا شنکر ۔ اس زمانے کا تو پتہ نہیں آپ کو ہمیشہ یاد کرتی ہیں ۔

لیڈی موہن (خندہ پیشانی سے) کیا اچھا وقت تھا ۔ کاش کہ پھر ملیں

ودیا شنکر ۔ تو فرمائیے کہ اب اس شرارت کی اجازت ہے ۔

لیڈی موہن ۔ شرارت کے لئے تم مرد ہو کر ایک استری کی مدد کے محتاج ہو ۔ دمنتی سچ کہتی تھی کہ پرماتما نے یہ بڑی دیا کی کہ ہندوستان میں مرد ہونے کی ذلت سے بچا لیا ۔

ودیا شنکر ۔ دمنتی کی اصلی دلی رائے کالج کے لڑکوں کے متعلق کیا ہے ؟

لیڈی موہن ۔ اصلی دلی رائے تو ایشور جانے مگر ایک دن کہہ رہی تھی کہ کالج کے لڑکے سیاسیات کے سانڈوں کے لئے بھس ہیں انہیں چبا چبا کر وہ سانڈ موٹے ہو رہے ہیں اور خوب آپس میں ٹکریں لڑتے ہیں ۔

ودیا شنکر ۔ یہ تو دمنتی نے کوئی نئی بات نہیں کہی ۔ ساری دنیا میں شباب بڑھاپے کا شکار ہے ۔ نوجوانوں کی امنگوں کو پختہ کار حضرات صدیوں سے یونہی استعمال کرتے چلے آئے ہیں ۔ بوڑھوں کا کام ہے دھوکا دینا اور نوجوانوں کا کام ہے دھوکا کھانا اس بیچ میں تو کسی کو گھاٹا نہیں ۔ وہ شباب ہی کیا جو انجام کار کو سوچے ؟

لیڈی موہن ۔ آپ اپنا فلسفہ تو رہنے دیجئے ۔ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ یہ شرارت آپ نہ کریں گے ۔

ودیا شنکر ۔ تعمیلِ ارشاد میں وعدہ کر لوں مگر میرے دوستوں میں میرا منہ کالا ہو جائے گا ۔

لیڈی موہن - تو تمہارا ارادہ کیا ہے؟
ودیاشنکر - آپ بالکل پختہ وعدہ کریں کہ آپ میرا راز فاش نہ کریں گی تو آپ کو بتادوں۔
لیڈی موہن - اچھا وعدہ کیا۔
ودیاشنکر - میں یہ خط لے کر ابھی پروفیسر سے ملوں گا اور اسے یقین دلاؤں گا کہ اس آنے والی مصیبت کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ وہ مجھے فوراً اپنے قلم سے لکھ دے کہ اس کے لکچر کا مطلب صحیح نہیں سمجھا گیا۔ اسلام کی مبالغہ آمیز تعریف محض پولیٹیکل مصلحت تھی۔ ان سے اجازت لے لوں گا کہ فی الحال یہ مختصر سا خط صرف دمنتی کو دکھلادوں اور باقی اپنا مطلب وہ کل دو بجے خود آکر دمنتی سے بیان کردیں۔
لیڈی موہن - اگر تم نے یہ کیا تو پروفیسر فوجداری مقدمہ کرکے تمہیں قید کرادے گا۔
ودیاشنکر - قید ہونے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ خفا نہ ہوں - اب اجازت دیجئے
(چپکے چپکے کچھ باتیں کہتا ہے اور پھر ادب سے سلام کرکے رخصت ہوتا ہے)

تیسرا سین

دن ہفتہ - وقت نو بجے رات - پروفیسر کرپا دیالم کے دفتر کا کمرہ

پروفیسر کرپا دیالم - ودیاشنکر مجھے ہرگز یقین نہیں آتا کہ تمہاری اطلاع درست ہے - تمہارے مشورے کے مطابق تحریر میں نے لکھ دی ہے کیونکہ دمنتی کو اس غلطی سے بچانا اولین فرض ہے مگر کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ دمنتی کے سوا اور کسی کو یہ خط نہ دکھاؤ گے؟
ودیاشنکر - میں حلفی وعدہ کرتا ہوں کہ یہ خط مس موہن کے ہاتھ میں خود دوں گا - یہ تحریر میرے حوالے کرکے آپ نے سارے ہندوستان کی ایک اعلیٰ دماغی خدمت انجام دی ہے۔
پروفیسر - ودیاشنکر تم بہت قابل ہو میری ایک نہایت اہم تصنیف اس وقت مطبع میں ہے جس سے قطعی ثابت ہو جائے گا کہ ہندوؤں کے شاندار فلسفے کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے فلسفے ہیچ ہیں - مجھے صرف ان لوگوں سے اتفاق نہیں جو ہماری مقدس کتابوں کو الہامی کتابوں کے ذلیل زمرے میں شامل کرتے ہیں - میری کتاب پڑھو گے تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اصل پوتر ہندو فلسفے کا مجھ سے بڑھ کر چیمپین[1] (Champion) آج تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا
ودیاشنکر - جی ہاں جناب - اس میں کیا شک ہے۔
پروفیسر - یہ تم لوگوں نے اپنے خط میں کیا زہر اُگلا کہ تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟
ودیاشنکر - جناب - ہم تو سب کے سب فری تھنکر[2] (Free Thinker) ہیں اور دمنتی ہم سب کے دل و دماغ کی ملکہ ہے اُس کے

[1] علم بردار او حلیف [2] آزاد خیال

لئے ہم قتل وغارت پر تیار ہیں تبدیل مذہب کیا چیز ہے۔

پروفیسر (خوف زدہ ہوکر) کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟

ودیا شنکر۔ جناب۔ مجھے غلط کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی یقین جانئے کہ اگر ہم مسلمان ہوتے اور آپ نہ ہوتے تو آپ کے لئے بم کا گولہ فوراً تیار کرایا جاتا۔ لیجئے اب جاتا ہوں "گڈ نائٹ سر"! (Good night Sir)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(وقت ۱۲ بجے۔ دن اتوار۔ لیڈی موہن کی کوٹھی میں مس دمنتی موہن کا کمرہ)

(دمنتی اپنے کمرے میں چھوٹی سی سٹیج تیار کرنے میں مصروف ہے۔ کچھ کرسیاں سامنے رکھی ہیں۔ چند کرسیاں سٹیج پر ہیں۔ ان کو دمنتی درست کر رہی ہے کہ لیڈی موہن داخل ہوتی ہیں)

لیڈی موہن۔ دمنتی ڈارلنگ[1]! کمرے کا کیا حال کیا ہے؟

دمنتی۔ آنٹی! آج یہاں ریہرسل (rehearsal) ہوگا اس لئے مختصر سی سٹیج بنا رہی ہوں۔

لیڈی موہن۔ کون سا ڈراما ہے؟

دمنتی۔ آنٹی! ایک دنیا بھر سے نرالا خیال ہے۔

لیڈی موہن۔ وہ کیا؟

دمنتی۔ میرے تین چار ہم جماعت مل کر اپنا پارٹ خود تصنیف کر رہے ہیں اور اُن کا خیال یہ ہے کہ گو ڈراما میرے متعلق ہو مگر مجھے اس کا کچھ علم نہ ہو اور میں اس میں قدرتی طور پر خود اپنا پارٹ پلے (play) کروں یعنی وہ نہ کہوں جو کوئی مصنف میری زبان سے کہلوائے بلکہ جو خود بخود حسب حال میرے منہ سے بے ساختہ نکلے۔

لیڈی موہن۔ یہ تو بالکل فضول ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو گی یا کرو گی اس کا جواب ان لوگوں کے پاس کس طرح پہلے ہی سے موجود ہوگا؟

دمنتی۔ یہی تو نرالا پن ہے۔ ان لوگوں کا دعوٰے ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں گے کہ میرے قول فعل میں اُن کی توقعات سے ذرا بھی فرق نہ ہوگا۔ انہیں شوق ہے تو صرف یہ کہ کیا ایسی صورت میں میرے الفاظ کی بندش اور فقروں کی چستی اسی قسم کی ہوگی جو مشہور ڈراموں میں ہیروئن (heroine) کے کلام میں ہوتی ہے یا میری زبان میں کسی قسم کا ادبی چٹخارہ نہ ہوگا؟

لیڈی موہن (مسکراکر)۔ پاگلوں کے سر سینگ نہیں ہوتے۔

---

[1] پیاری۔ میری جان۔

دمنتی۔ اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے ؟
لیڈی موہن۔ دمنتی ڈارلنگ! میں اتنے ڈرامے پڑھ چکی ہوں اور دیکھ چکی ہوں کہ تم ابھی دس سال تک بھی نہ پڑھو گی نہ دیکھو گی۔
ڈرامے اس لئے تھوڑے ہی لکھے جاتے ہیں کہ ڈائیلاگ (dialogue) اسی قسم کا ہو جس قسم کا واقعی زندگی میں ہوتا
ہے۔ ڈرامے کا پہلا اصول یہ ہے کہ زندگی کو صیقل کرکے پیش کرو
دمنتی۔ آنٹی! آپ اپنے خیال کے مطابق ٹھیک فرما رہی ہیں مگر ہم لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم خالص سونا ہیں۔ سونے کو صیقل
کی ضرورت نہیں۔
لیڈی موہن۔ کیا کہنے تمہارے انکسار کے! اگر کیا مجھے ریہرسل دیکھنے کی اجازت ہو گی ؟
دمنتی (ہچکچاہٹ کو روکتے ہوئے) جی ہاں۔ شوق سے یعنی اگر آپ کو کوئی ضروری کام نہ ہو۔
لیڈی موہن۔ تھینک یو۔ (چلنے لگتی ہیں)
دمنتی۔ آنٹی! اور لوگ تو سب دو بجے آئیں گے مگر مسٹر اشتہ کو میں نے ایک گھنٹہ پہلے بلوایا ہے میں چاہتی تھی کہ وہ آپ
سے مل لیں۔
لیڈی موہن (بے اعتنائی سے) کون ہے وہ ؟
دمنتی (غرور سے) میرا دوست ہے، مجھ پر بے انتہا مہربانی کرتا ہے اور گو اسے آپ سے نیاز حاصل نہیں آپ کا بے انتہا ثنا خواں ہے
لیڈی موہن (دانائی سے فوراً بدل کر) ہاں دمنتی پیاری میں ضرور ملوں گی۔ خدا جانے کون کہہ رہا تھا کہ کالج کے سب سے قابل
لڑکوں میں ہے
(خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لے کر آتا ہے اور لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے)
لیڈی موہن۔ گول کمرے میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔
(خدمتگار چلا جاتا ہے)
دمنتی۔ کون ہے آنٹی ؟
لیڈی موہن۔ تمہارے کالج کا پروفیسر مسٹر کرپا دیالم۔ لو میں جاتی ہوں۔ ضرور تمہاری ریہرسل دیکھوں گی۔
(دمنتی اکیلی کمرے میں رہ جاتی ہے اور پھر کرسیاں درست کرنے لگتی ہے)
(لیڈی موہن کے نکلتے ہی ایک خدمت گار چپکے سے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ایک خط مس دمنتی موہن کو دیتا ہے اور چپکا
کھڑا رہتا ہے۔)
(مس دمنتی فوراً لفافے کو پھاڑ کر پڑھتی ہے اور کچھ خفا ہو کر خط کو کچل کر مٹھی میں لے لیتی ہے اور پھر یک لخت اسے خیال آتا ہے

ــــــــــــــــ

ل مکالمہ

(خدمتگار جو خط لایا تھا وہ کمرے میں موجود ہے خدمتگار کی طرف غور سے دیکھتی ہے)

مس موہن - یہ خط تم لائے ہو؟

خدمتگار - حضور!

مس موہن (بہت غور سے خدمتگار کی طرف دیکھ کر) تمہیں یہاں داخل ہوتے کسی نے دیکھا؟

خدمتگار - حضور نہیں مگر نکلنے پر شاید کوئی دیکھ لے۔

دمنتی - وِدیا شنکر! تم بہت دلیر ہو مگر فوراً چلے جاؤ۔ کیا پروفیسر کرپارام میرا کچھ ذکر کرنے آیا ہے؟

وِدیا شنکر - خیال تو یہی ہے۔ لو جاتا ہوں۔

(چپکے سے کچھ بات کہہ کر دمنتی کے ہاتھ سے خط لے کر نکل جاتا ہے)

(وِدیا شنکر کے نکلنے کے بعد تھوڑی دیر دمنتی ایک کرسی پر سر پکڑے بیٹھی رہتی ہے پھر مستعد ہو کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور بلند آواز سے گویا اپنے آپ سے یہ کہتی ہے)

اگر دنیا میں پروفیسر نہ ہوتے تو زندگی کس قدر آسان ہوتی۔

دوسرا سین

(لیڈی موہن کی کوٹھی میں لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ پروفیسر کرپارام لیڈی موہن کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

پروفیسر - گڈ مارننگ لیڈی موہن۔

لیڈی موہن (سلام کا جواب تبسم دیتے ہوئے) آپ تشریف رکھیں (پروفیسر اور لیڈی موہن کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

پروفیسر - لیڈی موہن ساری دنیا آپ کی اور مس موہن کی روشن خیالی کی تعریف کرتی ہے مگر موجودہ حالات میں تو آزادی کی طرف بھی انسان کو سوچ سوچ کر قدم رکھنا چاہیئے؟

لیڈی موہن - میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

پروفیسر - میرا مطلب یہ ہے کہ مس موہن کالج میں ہر قسم کے طالب علموں سے ملتی ہیں اور اس بے روک ٹوک میل جول کے منددہ سوشل شعار سے بعض ناگوار تصادم ہونگے۔

لیڈی موہن - کیا دمنتی نے کوئی خاص طور پر قابلِ اعتراض حرکت کی ہے؟

پروفیسر - جی نہیں - ہرگز نہیں۔

لیڈی موہن - تو پھر آپ کس بات سے خائف ہیں؟

پروفیسر - مس موہن اپنی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کے جال میں اس قدر پھنس گئی ہیں کہ اُنہیں مذہب سے چنداں لگاؤ نہیں رہا۔

لیڈی موہن۔ اب میں آپ کا مطلب سمجھی۔ دمنی واقعی مذہب کے معاملے میں سخت منہ پھٹ ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی کہ مذاہب کسی انتہا درجے کے عیش پسند کی ایجاد ہیں کیونکہ مذاہب نے معمولی باتوں کو گناہ قرار دے کر انہیں ضرورت سے ہزار فیصدی زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

پروفیسر۔ جی ہاں۔ مس موہن کی یہ بلاغت ایک سخت آفت ہے۔ ایک دن بحث بحث میں کہہ اٹھیں کہ احتیاط سے تول تول کر خوشی کے نوالے کھانے سے تو زہر کھانا بہتر ہے۔

لیڈی موہن۔ مگر پروفیسر صاحب کیا یہ ذلیل ترین حماقت نہیں کہ ایک طرف تو لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دیں اور دوسری طرف اُن سے یہ توقع کریں کہ وہ اپنے علم کو آزادی سے استعمال نہ کریں۔

پروفیسر۔ جی ہاں مگر آزادی کی کوئی حد ہونی چاہیئے ؟

لیڈی موہن۔ حد کون مقرر کرے ؟

پروفیسر۔ سردست تو ماں باپ استاد یا گارڈین (سرپرست) ہی کر سکتے ہیں۔

لیڈی موہن۔ میں تو بحث میں دمنی سے ہمیشہ ہار جاتی ہوں اور مجھے ہمیشہ یہی ماننا پڑتا ہے کہ جو وہ کہتی ہے ٹھیک ہے۔ آپ اسے سمجھائیے۔

پروفیسر۔ آپ اجازت دیں تو آج دو بجے اُن سے ملنے کے لئے آجاؤں۔

لیڈی موہن۔ ضرور آیئے مگر خدا کرے آپ سے بھی کوئی ایسا سوال پوچھ بیٹھے جیسے وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

پروفیسر۔ مثلاً

لیڈی موہن۔ ایک دن پوچھنے لگی "بُرے لوگ اپنے پیشے سے اکتا جاتے ہیں۔ کیا نیک لوگ نہیں اکتاتے ؟"

پروفیسر۔ واقعی ٹیڑھا سوال ہے۔ میری اپنی ہمشیرہ بعض دفعہ اس قسم کے بیباکانہ سوال کر بیٹھتی ہے مگر میں تو اسے ڈانٹ دیتا ہوں۔

لیڈی موہن۔ مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے۔ مرد غلطی پر بھی ہو تو ڈانٹنے سے نہیں شرماتا۔

پروفیسر۔ آپ بھی دمنی سے کم نہیں۔ لیجئے اب مجھے اجازت دیجئے۔ دو بجے حاضر ہونگا۔

(چلا جاتا ہے)

ڈراپ سین

تیسرا ایکٹ

(لیڈی موہن کا گول کمرہ۔ وہی دن، وقت ایک بجے بعد دوپہر۔ لیڈی موہن اور مس دمنی بیٹھی ہیں۔ خدمتگار چاندی کی طشتری میں ملاقاتی کارڈ لا کر لیڈی موہن کی خدمت میں پیش کرتا ہے)

لیڈی موہن۔ سلام دو۔

دمتی۔ آنٹی! پروفیسر کرپا دیال کیا فرماتے تھے؟

لیڈی موہن۔ کالج کے انتظام کے شاکی تھے۔ کچھ اپنی ہمشیرہ کی بیباکی پر خفا سے تھے۔ کچھ تمہاری تیزی ذہانت کے مداح تھے۔ دو بجے تم سے ملنے کے لئے آئیں گے۔

(خدمت گار مسٹر اشتہ کو کمرے میں داخل کرتا ہے)

دمتی۔ ہیلو اشٹو

اشتہ۔ ہیلو ٹام۔

دمتی۔ آنٹی یہ ہیں مسٹر اشتہ جنہیں میں مذاق سے اشٹو کہتی ہوں۔

(اشتہ جھک کر آداب بجالاتا ہے)

لیڈی موہن (اُٹھ کر ہاتھ ملا کر) آئیے۔ یہاں میرے پاس بیٹھئے (اشتہ ادب سے لیڈی موہن کے پاس (Settee) پر بیٹھ جاتا ہے)

دمتی (کرسی سے اُٹھ کر) آنٹی میں ابھی آتی ہوں (کمرے سے چلی جاتی ہے)

لیڈی موہن۔ آپ دوہرا ایم اے کر رہے ہیں؟

اشتہ۔ جی ہاں یعنی اگر پاس ہو جاؤں۔

لیڈی موہن۔ کیا دمتی بھی پاس ہو جائے گی

اشتہ۔ جی ہاں مس موہن ضرور پاس ہونگی۔ بلا کی ذہین ہیں۔

لیڈی موہن آپ نے دمتی کو "ہیلو ٹام" کیوں کہا؟

اشتہ۔ لیڈی موہن! میں محض ایک طالب علم ہوں۔ میرا شغل صرف کتب بینی ہے یا ضروری قسم کی ورزش۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں اپنے کسی ہم جماعت کے لئے یہ سوچوں کہ وہ لیڈی ہے۔ اس لئے مس موہن کی اجازت سے اُن کا نام ٹام رکھ دیا۔ اس سے زندگی آسان ہو گئی ہے اور اُن سے وہی سلوک روا رکھتا ہوں جو اس نام کے ساتھ مناسب ہو۔

لیڈی موہن (ہنس کر) گویا لڑکیاں کالج میں جا کر لڑکے بن جاتی ہیں۔

اشتہ۔ قطعی۔

لیڈی موہن۔ لڑکے تو آپس میں گالیاں بھی دیتے ہیں۔

اشتہ۔ جی ہاں۔ یہی تو آسانی ہے "شٹ اپ مس موہن" (Shut up miss Mohan) کہنا کس قدر ثقیل ہے مگر "شٹ اپ ٹام" (Shut up Tom) کہنا کتنا سلیس ہے اور شٹ اپ (Shut up) پر کیا موقوف ہے۔ ٹام یو آر آ بین اِڈیٹ

لے بکومت مس موہن اور بکومت ٹام۔ لے ٹام تم گاؤدی ہو۔

(Tom you are a fool) "ٹام یو آر اے فول"[1] ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور یہ ٹام (Tom) کے لئے بہترین ٹانک (Tonic) ہے۔ اگر ذرا اردو میں کہہ دیں کہ "دمتی۔ تم اُلّو ہو" تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے۔

لیڈی موہن (مادرانہ شفقت سے) اور تو کوئی وجہ اس تبدیل نام کی نہیں؟

اشتہ (چونکتا ہوا کر) اس سوال کی آپ سے توقع نہ تھی مگر اس لئے کہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ ٹام کے اور میرے مذہب میں دو لفظوں کا استعمال قطعی حرام ہے

لیڈی موہن (بے انتہا دلچسپی سے) کیا دو لفظ؟

اشتہ اول لو[2] (Love) اور دوسرے پیٹریٹزم[3] (patriotism) ہماری رائے میں یہ دو وہ ذلیل جذبات ہیں جن سے دنیا برباد ہے اور اپنے لئے ہم دونوں نے قطعی فیصلہ کیا ہے کہ ان دو جذبات سے اپنی روح کو آلودہ نہ ہونے دیں گے۔

لیڈی موہن کیا جو رہی ہرسل آج ہونے والا ہے وہ ان دو جذبات کے خلاف ایک نئے روحانی جذبے کی جنگ ہے۔

اشتہ لیڈی موہن، میرا پارٹ تو صرف ایک فلاسفر کا تھا اور توقع یہ تھی کہ ٹام کو جج بنا کر میں بطور ملزم پیش کیا جاؤں گا۔ اور مجھ پر فلاسفر ہونے کی فرد جرم لگا کر سزا اُس سے تجویز کرائی جائے گی۔ مگر ری ہرسل تو آج ملتوی ہو گیا۔

(دمتی داخل ہوتی ہے)

لیڈی موہن دمتی سنتی ہو۔ یہ تو کہہ رہے ہیں کہ ری ہرسل ملتوی ہو گیا؟

دمتی (سخت تعجب اور مایوسی سے) ملتوی ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ کیا ہوا؟

اشتہ لوگوں کو اپنے پارٹ یاد بھی نہیں اور پسند بھی نہیں میں ابھی نوٹس جاری کر کے آیا ہوں کہ ری ہرسل کی تاریخ پھر مقرر کی جائے گی۔

لیڈی موہن دمتی! اگر مسٹر اشتہ تمہارے سامنے بطور ملزم پیش ہو اور اس پر فرد جرم یہ ہو کہ یہ فلاسفر ہے تو تم کیا سزا دو؟

دمتی فلاسفر ہونے کے لئے لازم ہے کہ سر گنجا ہو اور بیوی ترش رو ہو۔ سب سے پہلے تو فرد جرم کی ترمیم کروں اور یہ جرم عاید کروں کہ یہ شخص نقلی فلاسفر ہے کیونکہ بیوی ندارد۔ اور بال موجود۔ پھر سزا یہ دوں کہ تین توام بچوں کا باپ اسے بنایا جائے کیونکہ فلاسفروں کے تین ہی بچے ہیں۔

لیڈی موہن بچوں کے نام؟

دمتی کیوں؟ کیا؟ اور کیسے؟ (یہ کہہ کر دمتی پھر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چلتے چلتے دروازے میں کھڑے ہو کر کہتی ہے) آنٹی ری ہرسل نہیں ہے تو یہ ساڑھی بدل کر ابھی آتی ہوں۔ (چلی جاتی ہے)

لیڈی موہن مسٹر اشتہ! آپ میری موجودگی میں تو دمتی کو ٹام نہ کہئے اور سالے۔ اس کے ہم جماعت سب الف سے دمتی پکارتے ہیں

---

[1] ٹام تم گدھے ہو [2] عشق [3] حب وطن

اشتہ۔ تعمیل ارشاد میں عذر نہیں مگر مجھ میں اور دوسروں میں فرق ہے۔ ان کے لئے دمنی صرف ایک ملکہ ہے۔

لیڈی موہن۔ اور تمہارے لئے؟

اشتہ۔ میرے لئے؟ (نہایت نرم آواز سے) دمنی! میرے لئے یہ نام نہیں۔ میرے بہترین خوابوں بہترین آرزوؤں کے لئے (کھل سم سم) (open sesame) ہے۔ سنہر کے شور میں دمنی کسی شاعر کا نازک خیال ہے۔

(لیڈی موہن اس تعریف سے بے انتہا متاثر ہوتی ہے۔ اشتہ بھی کچھ بے خودی کی حالت میں آنکھیں بند کرکے نہایت دھیمی آواز سے دمنی! دمنی!!! دمنی!!! کہتا چلا جاتا ہے گویا یہ وہ راگ ہے جس کے لئے اس کی زندگی وقف ہے۔ دمنی چپکے سے پشت کی طرف سے داخل ہو کر اشتہ کی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اشتہ فوراً چونکتا ہو کر اس کے ہاتھ ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے۔

اشتہ۔ ڈونٹ بی اے فول ٹام[1] (dont be a fool Tom) (دمنی پھر کمرے سے بھاگ نکلتی ہے)

لیڈی موہن۔ تم تو کہتے تھے کہ کوئی (محبت) کا لفظ بھی استعمال کرنا حرام ہے؟

اشتہ (شرما کر، سر جھکا کر) آپ کی اجازت سے حرام حلال ہو سکتا ہے

(لیڈی موہن کچھ کہنے کو تھیں کہ خدمت گار داخل ہوتا ہے)

خدمتگار۔ حضور ایک پروفیسر صاحب اور کئی کالج کے صاحب لوگ آنا چاہتے ہیں۔

لیڈی موہن۔ ضرور بلوالو

(پروفیسر کرپا دیالم، مسٹر ودیا شنکر اور چھ سات طالب علم کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ طالب علم تو نہایت ادب سے جھک کر سلام کرتے ہیں مگر پروفیسر صاحب بڑھ کر لیڈی موہن سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ اشتہ لیڈی موہن کے پاس سے اٹھ کر الگ ایک طرف کو ہو جاتا ہے۔ جتنے لوگ داخل ہوتے ہیں اُن کی نگاہیں گویا چاروں طرف دمنی کی متلاشی ہیں)

لیڈی موہن۔ آپ سب تشریف رکھیں۔

ودیا شنکر۔ لیڈی موہن! آج کالج میں عجیب عجیب خبریں مشہور ہو رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پروفیسر صاحب سکھ ہو گئے ہیں میری نسبت سب کو یقین ہے کہ میں خفیہ طور پر عیسائی ہو چکا ہوں۔ کئی لوگوں نے مجھے گرجا سے نکلتے دیکھا ہے۔ اشتہ کی نسبت مشہور ہے کہ اُس نے جوگی بن کر جنگل کی راہ لی ہے۔ دمنی کی نسبت افواہ ہے کہ کسی مسجد میں قرآن پڑھ رہی ہے۔ پروفیسر صاحب کے لکچر سے آدھے ہندو مسلمان ہو چکے ہیں اور ان کی کتاب سے آدھے مسلمان ہندو ہونے کے آرزومند ہیں۔

پہلا طالب علم۔ لیڈی موہن! یہ بھی مشہور ہے کہ اسمبلی نے قانون پاس کر دیا ہے کہ ہر شخص دن میں تین دفعہ اپنا مذہب بدلے تاکہ ہندوستان میں قومیت کا رنگ پختہ ہو

لیڈی موہن۔ تم دونوں کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو! پروفیسر صاحب آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے۔

---

[1] ٹام عقل سے کام لو

پروفیسر کرپادیالم - آج کل طالب علموں کی طبیعت میں ذرا چلبلاپن ہے اور سائکالوجی (Psychology) کے ماہرین اسے دبائے رکھنا پسند نہیں کرتے - اس لئے جب میں طالب علموں کو کسی وقت بے تکی باتیں کرتے سنتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کیونکہ پھر وہ اپنی سٹڈی زیادہ انہماک سے کرتے ہیں

ودیاشنکر - لیڈی موہن! سائکالوجی اور پولیٹیکل مصلحت دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ طالب علموں کے سر نہ ہوا جائے۔

پروفیسر (بات بدلنے کے لئے) مس موہن کہاں ہیں؟

لیڈی موہن - ابھی یہیں تھی - آتی ہی ہوگی - لو آگئی۔

(دمتی داخل ہوتی ہے - پروفیسر کو "گڈ مارننگ سر!" کہتی ہے طالب علم ہیلو دمتی ہیلو دمتی کہہ کر ہاتھ ہوا میں ہلا کر خیر مقدم کرتے ہیں)

پروفیسر - مس موہن! کیا میرا خط آپ کو ملا؟

دمتی - جی ہاں۔

(پروفیسر کے بشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دمتی سے الگ بات کرنا چاہتا ہے - دمتی تاڑ جاتی ہے)

دمتی - جناب! یہ سب میرے کلاس فیلو میرے دوست ہیں اور میری آنٹی تو گویا میری سہیلی ہیں آپ ان کے سامنے ہی مجھے سمجھا دیجئے۔

پروفیسر - کیا اس گپ کی کچھ بنیاد ہے کہ تم میرے لیکچر سے متاثر ہو کر مسلمان ہونا چاہتی ہو۔

دمتی - صرف اسی قدر یہ گپ بے بنیاد نہیں کہ ہم سب طالب علموں نے اور بالخصوص میں نے اس لیکچر کا بار بار ذکر کیا اور ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کوئی مسلمان بھی شاید اسلام کی خوبیاں اس فصاحت سے بیان نہ کرتا - آپ کی تقریر آپ کی تحریر سے بھی بڑھ کر مؤثر ہے۔

پروفیسر - تقریر میں مبالغہ لازمی ہے۔

دمتی - ہم تو آپ کے ایک ایک لفظ کو سچ سمجھے۔

پروفیسر - مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میرے لیکچر کو پسند کیا مگر میں اصولاً تبدیل مذہب کے خلاف ہوں۔

دمتی - میں بھی قطعی خلاف ہوا کرتی تھی مگر اب تو میری رائے بدلتی جاتی ہے - انسان کو چاہئے کہ مختلف مذاہب کو عارضی طور پر آزمائے اور پھر اس مذہب میں رہ جائے جس کے عقیدے اُسے خود خوبصورت معلوم ہوں - مذہب کو خوبصورتی کے لئے چننا چاہئے نہ کہ صداقت کے لئے - مذہب میں حسن سب کچھ ہے صداقت کچھ بھی نہیں۔

پروفیسر - کیسی بھولی باتیں کرتی ہو - مذہب لمبے ہیں - زندگی چھوٹی ہے - راہ راست ہر مذہب میں موجود ہے۔

دمتی - جی ہاں - بالکل بجا ارشاد ہوا مگر یہ مجھے کیسے علم ہو کہ جس مذہب میں میں پیدا ہوئی اس کا راہ راست میری خاص طبیعت کے لئے خوبصورت بھی ہے - میں دعا کی قائل ہونا چاہتی ہوں مگر اس لئے نہیں کہ دعا ایک اچھی چیز ہے بلکہ محض اس لئے کہ دعا ایک خوبصورت چیز ہے - دعائیں بلا کا زور ہے - اپنی عاجزی کے بھروسے پر انسان تقدیر کے پہاڑ کو اکھاڑ کر پھینک دینے کی آرزو رکھتا ہے۔

پروفیسر۔ یہ لمبی بحث ہے پھر کسی وقت سمجھا دوں گا۔ (لیڈی موہن سے مخاطب ہو کر) اب مجھے اجازت دیجئے (کھڑا ہو جاتا ہے)

لیڈی موہن۔ ذرا تو آپ ٹھیریں۔ ان بچوں کے ساتھ چاء میں شامل ہوں (پروفیسر صاحب بیٹھ جاتے ہیں)

دمنتی۔ پروفیسر صاحب۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ لکچر آپ نے کسی پولیٹیکل مصلحت سے دیا تھا؟

پروفیسر (مسٹر ودیا شنکر کو گھورتے ہوئے) ودیا شنکر کو میں نے مفصل سمجھا دیا ہے

ایک طالب علم۔ جناب اجوبات ودیا شنکر کو مفصل سمجھائی جائے وہ مسٹر ودیا شنکر سو دفعہ دہرائیں پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرا طالب علم۔ جناب! مفصل کوڑمغزی کا دوسرا نام ودیا شنکر ہے۔

تیسرا طالب علم (بناوٹی جوش سے) پروفیسر صاحب! آپ کیوں صاف نہیں کہہ دیتے کہ لیکچر آپ نے ہرگز کسی پولیٹیکل مصلحت سے نہیں دیا۔

پروفیسر۔ اس میں کیا شک ہے۔

بہت سے طالب علم (شور مچا کر) ودیا شنکر کا جھوٹ کھل گیا۔ ودیا شنکر کا جـ

ودیا شنکر۔ میرے پاس پروفیسر صاحب کی اپنی تحریر موجود ہے کہ اسلام کی مبالـ

(اس نے دمنتی کو دیا تھا جیب سے نکال کر سب کو دکھلاتا ہے۔ سب طالب عـ

مارے سر جھکا لیتا ہے)

لیڈی موہن۔ پروفیسر صاحب آپ بالکل خفا نہ

پروفیسر۔ لیڈی موہن تھینک یو۔ اگر یہ طالـ

ودیا شنکر (پروفیسر کی فراخ حوصلگی اور خوش

آپ کے علم [illegible]

سب لڑکے۔ [illegible]

لیڈی موہن۔ اچھا آپ کی خوشی

(سب طالب علم اور پروفیسر لیڈی موہن کو آداب

دمنتی۔ اشنتو! تم بھی مجھے اب دمنتی کہا کرو۔

اشنتہ۔ کیوں دمنتی؟

دمنتی۔ میں لائق ہونے کے مذہب سے تھک چکی ہوں۔ زندگی ایک

اشنتہ (نہایت پیار بھری میٹھی آواز سے) پیار بھری میٹھی لگا

لیڈی موہن (ایک طرف الگ) ارے نوگرفتارو! تم نے قلم۔

سلہ الو بنائے جانے پر۔

جلاوطن شہزادی کا خط

شہزادہ میرزا جوان بخت ولی عہد آخری بہادر شاہ، بادشاہ کی بیوی اپنے شوہر اور اپنے ساس سسروں کے ساتھ قید ہو کر دہلی سے رنگون گئی تھیں وہاں سے انہوں نے اپنی والدہ کے نام دہلی میں جو خط لکھا تھا وہ اگرچہ آج کل محفوظ تو نہیں ہے لیکن جس قدر مفہوم اس خط کا مجھے معلوم ہو سکا اُس کو میں نے اپنی زبان میں یہاں لکھ دیا جو دہلی کے واقعاتِ غدر کے سلسلہ میں ایک خاص اور اہم چیز مانا جائیگا۔

حسن نظامی

از رنگون ملک برہما۔ دہلی کے قیدی بادشاہ کا گھر

... کو آداب!

... اپنے وطن دِلّی سے ہزاروں کوس دور میکہ سے جدا اور ایسی جدا کہ اب جیتے جی کبھی کسی میکہ

... کر آئے تھے جب وہ حضور (بہادر شاہ) سے باتیں کر رہے تھے میں نے چلمن میں

... ہوتے باتیں کرکے سائیں صاحب ان کے (جوان بخت کے) ساتھ میرے کمرہ میں

... جب میری شادی ہوئی اور غالب و ذوق کے سہروں کا چرچا ہوا اور

... —— اس وقت میں ولیعہد ہندوستان کی ملکہ

... ایک جلاوطن قیدی ہوں۔ اور ایک قیدی کی

... نہ سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ بس لکڑی کا

... ایک کمرہ میں حضور (بہادر شاہ) اور

... اپنے

... بھی

... ہیں۔ مکان

... خدا کے فضل سے یہ (جواں بخت) ایک

... کی تباہی کا جو حال لکھا ہے وہ تو ہم جب

... کی پھانسی کا حال اس خط سے معلوم ہوا۔ وہ تو

... یہ بات آپ نے نہ لکھی۔ سائیں صاحب سے

... تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی شاہ صاحب کی سازش میں شریک

... بنارس بھی اسی غرض سے گئے تھے کہ بات چھپانے کا ایک بہانہ

... سے پھانسی دی گئی۔ اور آپ خود پھانسی کے وقت موجود تھیں

تو مجھے مارے غم کے غش آنے لگا ——— ہم جب دہلی سے جلاوطن ہو کر چلے ہیں اُس وقت تک تو وہ بنارس سے آئے نہیں تھے۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کا بیان کر کر کے رونا سائیں صاحب سے سنا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ سعیدہ سلطان کی عمر شاید چار برس کی ہوگی اس کو کیا خبر کہ باپ کہاں چلا گیا۔ اور اس کو کیوں پھانسی دے دی گئی۔ جب میں نے سعیدہ کی یہ بات سنی کہ آکا بھائی کی لاش گھر میں آئی تو اُس نے آپ سے کہا۔ ابا حضرت ہم سے خفا ہو گئے۔ بولتے نہیں۔ آنکھ بند کئے لیٹے ہیں تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سعیدہ مجھے بہت یاد آتی ہے اور جب سے آکا بھائی کے مارے جانے کا حال سنا ہے۔ سعیدہ کا خیال روز آتا ہے موئی مٹی کی نشانی ہے میں اس کو دیکھتی تو دل کے زخم پر مرہم لگ جاتا۔ مگر میں کہاں؟ سعیدہ کہاں؟ اور میرے ماں باپ کہاں؟ اور میرا دلی شہر کہاں؟ ———

اب تو کوئی امید دلی آ سکنے کی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں پر بہت سے بُرے وقت آ چکے ہیں حضرت بابر پر ہم سے زیادہ مصیبتیں پڑ چکی ہیں مگر وہ اتنے مایوس نہیں تھے جتنے ہم مایوس ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہمت کے سامنے ساری دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اُن کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے ہزاروں لاکھوں آدمی اُن کی حمایت کے لئے کھڑے ہو...

تھی مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہو...

کرنے والے کو کسی سے کچھ امید ہو اور توقع ہو۔ ہم سے کسی کو کیا امید ہوگی۔ اور کیا توقع ہوگی...

گل ہو چکا۔ ہمارے سب حمایتی مر چکے۔ اب جو ہماری مدد کا ارادہ...

انعام و اکرام ہم اُس کو نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام...

جو دیئے جاتے تھے۔ ماورقاتلوں سے محض ڈیڑھ...

سیر جو شاہی فوج کو فی آدمی دے سکتے تو وہ فا...

ہمدردوں اور حمایتیوں کو ڈیڑھ سیر جو بھی نہ...

دل میں کیوں آئے یہ دنیا تو امید...

اس ملک کو...

کیوں قید کیا گیا ہے۔ اماں جان ہماری یہ قید ایسی ہے...

میں جا نہیں سکتے اس لئے قیدی ہیں اور طوق...

ہیں اس لئے مردہ ہیں۔ چلتے چلتے کھاتے پیتے ہیں اس...

جائینگے ——— سعیدہ سلطان بڑے مقتول بھائی کی لڑکی کو گو...

ہم کو بھی بھول جاؤ۔ نہ وہ ملیں گے نہ ہم ملیں گے۔ وہ قبر میں ہے جب تک زندہ ہیں قبر میں ہیں اور جب مر جائیں...

آداب اماں جانی تسلیم۔ خاک ہو دو والی

کام سندیس

جاگے دنیا والے اور تُو نینوں نیند سموئے
چیتے دنیا والے اور تُو اپنے آپ کو کھوئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

اِس دنیا کے ڈھنگ نرالے، دکھ بن سکھ نہ ہوئے
ر کاٹے وہ جو بوئے
جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے

ہماری

ے ایسا کوئی نہ سوئے

ے

ے ایسا کوئی نہ سوئے

ے والے ایسا کوئی نہ سوئے

سید مقبول حسین احمد پوری

آزاد نگارستان[۱] اور دادا جان

مل گئی۔ آخر نگارستان کو کامل آزادی مل ہی گئی۔ اور کیوں نہ ملتی۔ اس ایک آزادی کے لئے یہاں والوں نے کیا کیا جتن
نہیں کئے۔ کھیتوں کی کاشتکاری چھوڑ دی۔ نہروں سے پانی لینا چھوڑ دیا۔ ولایتی کپڑے کا خریدنا چھوڑ دیا۔ تجارت میں حصہ لینا چھوڑ
دیا۔ بنکوں سے حساب کتاب چھوڑ دیا۔ دوکانوں پر چوکس کی۔ شہروں پر ڈاکے ڈالے۔ ریلوں کے پل اُڑائے۔ اپنوں اور غیروں پر طمنچے چلائے
فوجوں کی گولیاں کھائیں۔ پولیس کے ظلم سے جیلخانوں میں چھاؤنی چھائی۔ پھانسیوں پر جان گنوائی۔ آخر آزادی آئی اور بڑے زور سے
بھرن
آئی حکومت ملی اور پوری حکومت ملی۔ خیر ایک جھگڑا گیا۔ مگر دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ حکو
کرے۔ لیڈروں کو دعویٰ تھا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ نوجوانانِ وطن کو ادعا تھا کہ
نہ سنتا۔ کسانوں کو زعم تھا کہ اگر ہم لگان دینا بند نہ کرتے اور گھر سے بے گھر نہ... جا
شخص سمجھے بیٹھا تھا کہ میں نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اور ہر شخص دعویٰ دارتھ
سے رکھ دو۔

سب سے پہلی مصیبت انتخاب کی پیش آئی۔ انتخاب کے جو
تھا۔ یہاں آکر ایک وکیل صاحب نے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ لوگوں کو
لکچر دیا۔ وہاں لکچر دیا۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں قصبہ میں خاصا اثر پیدا
وقت ٹہلنے نکلے۔ دادا جان کی عمر کوئی ستر کے لگ بھگ ہو گی۔
جوان کی بھی کیا ہو گی۔ صبح اُٹھتے ہی من بھر کی جوڑی کے سو ہا
ہیں۔ مگدر ماریں تو بھینس کو بٹھا دیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں
استعمال کرتے ہیں۔ جب ملک میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور
نکال دیا۔ تھے سمجھدار اس لئے جلانے کی بجائے خانے سے اچھے دام
لیڈروں سے ہم بہت زیادہ سمجھدار ہیں وہ آج سودیشی بدیشی کا جھگڑا
تھے۔ تم کو لاکھ سمجھایا مگر تمہاری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ ولایت
کے مذہب پر بھی جان دیتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ لوگو

۱؎ نگارستان سے مراد چین نہیں ہے بلکہ وہ ملک ہے جہاں

تھے وہ ٹھیک تھا"۔ خیر میری تو کیا مجال تھی کہ اُن کے سامنے زبان ہلاتا۔ اچھے بڑے بڑوں کو اُن کے سامنے کچھ ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور جو خدانخواستہ کہیں کسی نے منطقی دلائل سے ان کو چُپ کرنا یا زبان کے زور سے اُن کو دبانا چاہا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ زبان تو زبان اُن کو لکڑی کے ہاتھ دکھانے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ اُن کا غصہ سارے امن آباد میں مشہور تھا۔ مگر اس غصے کے باوجود لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ اور وقت پر سلوک ایسا تھا کہ تمام قصبہ اُن پر جان دیتا تھا۔ بھلا ممکن تھا کہ کسی شخص پر برا وقت پڑے اور دادا جان اس کے آڑے نہ آجائیں۔ کسی کے ہاں شادی غمی ہو اور دادا جان اُس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کا ہاتھ تنگ ہو اور دادا جان اس کی مدد نہ کریں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ادھر اُنھوں نے کسی بات میں "ہاں" کی اور اُدھر سارے قصبے والے اُس "ہاں" میں اُن کے شریک ہو گئے۔ اُنھوں نے کسی بات میں "نہیں" کی اور ہر شخص کے منہ سے "نہیں" نکلنے لگی۔ غرض سارا قصبہ ان کو "دادا جان" کہتا اور وہ سارے قصبہ والوں کو اپنا عزیز سمجھتے۔ نگارستان کو جو آزادی ملی۔ اُس کی جدوجہد میں امن آباد نے بڑا بھاری حصہ لیا تھا

کن جب آزادی مل گئی تو قصبہ والوں کو تو سب بھول گئے۔ اور باہر سے لوگ آکر قصبہ کا حق

گئے جہنم میں۔ باہر کے ایک وکیل صاحب نے آکر اپنے لئے ووٹ جمع کرنے شروع کر دیئے۔

ٹہلنے کو نکلے۔ آبادی کے باہر ندی کے کنارے کیا دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی جمع ہیں میلہ

صاحب کے حالی موالی لوگوں کی خاطریں کرتے پھرتے ہیں مجمع کے بیچ

پر وکیل صاحب کھڑے اپنے انتخاب کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ دادا جان نے

دادا جان یہ وہی وکیل صاحب ہیں جو آج کل ووٹ جمع کرنے یہاں آئے ہیں"۔

تمہارے لئے یہ کروں گا اور یہ کروں گا"۔ دادا جان نے کہا "ہیں اس کی کیا ضرورت

مارے پھرنے کی کیا حاجت ہے۔ خود ہی لوگ ان کو ووٹ دیں گے۔ اور اگر

گا۔ کیا ہمارے ہاں کے لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ اپنا بھلا برا بھی نہیں سمجھتے"

پیسے دے کر کسی کو ذرا دھمکا کر کسی کی خوشامد کر کے۔ کسی کو دھوکا

تھا کہ دادا جان تو بپھر ہی گئے۔ کہنے لگے "ہیں۔ یہ کیا کہا۔ تو گویا یہ وکیل

یہاں سے کیا لے جاتے ہیں۔ مصیبت ہم نے بھری۔ زمینیں ہماری

صاحب اب حصہ بٹانے آئے ہیں۔ بٹانے کیوں لگے سارے کا سارا ہضم

ب ہم دونوں مجمع کے قریب پہنچے تو لوگوں نے دادا جان کے گزرنے

کا لکچر [illegible] سن لوں گا۔ کوئی بہرا تھوڑی ہوں کہ پاس جائے بغیر

قت وکیل صاحب فرما رہے تھے "میرے عزیز بھائیو تم کو

ہو۔ تم میں اتنی تعلیم کہاں ہے کہ وہاں جاکر خود اپنی بہبود

کے لئے کوئی رائے ظاہر کرسکو۔ تم میں اتنی سکت کہاں ہے کہ دارالسلطنت میں رہ کر وہاں کے اخراجات برداشت کرسکو۔ میں تمہارا خادم ہوں مجھے پر تمہارے حقوق ہیں۔ تمہارا فائدہ ہروقت میرے پیش نظر ہے۔ میں تم کو خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ میں پارلیمان میں تمہاری نیابت کروں گا۔ میں ثابت کردوں گا کہ تم نے مجھ پر جو بھروسا کیا تھا وہ کچھ بے جا نہ تھا۔ میں تمہارے مقابلہ میں اپنے فائدہ کو ہیچ سمجھوں گا۔ میں ظالموں کے پنجے سے تمہیں نجات دلاؤں گا۔ سچ کی مدد کروں گا اور حقدار کو حق پہنچاؤں گا۔"

وکیل صاحب یہیں تک پہنچے تھے کہ داداجان نے "ٹھہر جا تو جھوٹا ہے" کا نعرہ اس زور سے مارا کہ سارا میدان گونج اٹھا۔ ہر شخص اُن کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ یہ بھی بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے لوگوں کو دھکیلتے دھکاتے موٹر تک ہی پہنچ گئے۔ اور کہنے لگے "بھائیو۔ اب میں نے اس شیطان کو پہچان لیا۔ یہ بڑا جھوٹا اور دغاباز شخص ہے۔ تمہیں اننداا اور مکندا کا مقدمہ تو یاد ہوگا۔ تم ہی بتاؤ کہ اس میں بیچارے اننداپر ظلم ہوا یا نہیں۔ حق اننداکا تھا یا مکنداکا۔ بدمعاش مکندا ایک لنگوٹی باندھے گاؤں میں آیا۔ انن ا ... کر ... ہنے
لگا۔ اور آخر اس غریب کا سارا گھر بار۔ ڈھور ڈنگر۔ زمین مکان سب دبا بیٹھا۔ یہی حضرت اس
گواہیاں انہوں نے دلوائیں۔ جھوٹی دستاویزیں انہوں نے بنوائیں اور اب یہ بے حیا ہمارے
ہوں اور حقدار کو حق پہنچاتا ہوں۔ خدا کے لئے اس بدمعاش کے پھیر میں نہ آ
کی صورت ذرا اچھی طرح دیکھ لو اور پہچان لو کہ یہ وہی شخص ہے کہ جب مال گذاری نہ
کوڑیوں کے مول اپنے سالے کے نام سے خریدی تھیں۔ وہ تو کہو کہ پہلی سرکا
لگا ہی دیا تھا۔ اور کیوں جی۔ امن آباد کے لوگ کیا مر گئے ہیں کہ اُن کی بجائے یہ پرے
پرس رام تجھ کو ممبر بنائیں گے" پرس رام نے کہا "ناجی۔ دادا۔ مجھ سے یہ کام نہ
او۔ برکت اللہ۔ ادھر آ۔ تو کیوں ممبر نہیں ہوجاتا" برکت اللہ نے کہا "دادا۔ مجھے لکھ
نے کہا "ارے ممبری کے لئے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے جو سچی بات ہو
ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔ اچھا تم میں کوئی ممبر نہیں بنتا تو چلو ہم ممبر بنتے ہیں۔
میں قدم رکھا تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ تم نے اس قصبہ کو کبھی کیا مانی
ہم رہتے ہیں۔ بھائیوں۔ اس بلا کو یہاں سے دفع کرو۔ نکالو۔ نکالو۔ اس کو ا
صاحب تو ہاتھوں ہاتھ خبر نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ م
چلا کہ یہاں کبھی کوئی موٹر نکلی بھی یا نہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے
دیوانی اور فوجداری دو دو نالشیں داغ دیں لیکن ثبوت
بھی زبان سے نکالتا۔ دونوں مقدمے خارج ہوگئے۔ ا
اور مزا یہ ہے کہ سب کے سب انتخاب کنندوں نے بجائے

کی ایک نشست آنریبل مسٹر داداجان ایم پی کے نام سے محفوظ ہوگئی۔

داداجان کے نام کا اعلان ہونے کے تین چار روز بعد پارلیمان کی کارروائی کا پروگرام ۔ دو ٹکٹ اور ریل کے درجۂ اول کا پاس
آگیا۔ اجلاس کے دو ہی دن رہ گئے تھے اس لئے داداجان نے جھٹ پٹ روانگی کا سامان درست کرنا شروع کردیا۔ کہیں سے
ڈھونڈ ڈھانڈ کر کسی وقت وقتان کا ٹاٹ کا بیگ نکالا۔ موچی کو بلوا کر جہاں جہاں سے چوہوں نے کاٹا تھا اُس کو سلوایا گیا۔ دو جوڑے
کپڑے لنگی میں لپیٹ کر اس میں رکھے گئے۔ ناریل کا حقّہ، چلم، تماکو، کوئلے اور دیاسلائی کی ڈبیا اور خدا جانے کیا کیا الا بلا اس میں
ٹھونسی گئی۔ پرانی دری دھلوائی گئی۔ صاف چادر اور دو موٹے موٹے تکیے اس میں لپیٹ اور اوپر چھتری اور لٹھ رکھ۔ سب کو بان
۔۔کر ۔۔ رسّی باندھ کر اس کو بستر ے میں لٹکایا گیا۔ ڈاڑھی اور بالوں میں لوگوں کے بہت کہنے سننے سے خضاب
پہلے یہ مصیبت کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ اس لئے ہر بال نے اپنی طبیعت کے موافق نیا رنگ اختیار
۔گے چل کر طاؤسی رنگ کی ہوئی۔ پھر اور آگے اودی ہوئی اور آخر ہلکے گلابی رنگ پر ختم ہوئی۔
۔اکر کشمشی رنگ کی ٹوپی بن گئے ۔ چلنے کے دن صبح ہی سے داداجان کا بناؤ شروع
۔رگاڑھے کی مرزئی پہنی ۔ گاڑھے کی تہمد باندھی۔ پاؤں میں ادھوڑی استرکا
۔رلیمان کے پورے ممبر ہوگئے۔ مینجھولی میں بیٹھ کر گھر سے نکلے۔ قصبہ کے باہر
۔ن جے" کے نعرے لگائے گئے اور اس طرح ہم داداپوتے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے
۔خر میں جاکر کیا کروں گا۔ آپ کام سے جاتے ہیں۔ میرے بے کار جانے سے کیا
۔ڑی کے آنے میں دیر تھی۔ داداجان کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کبھی ریل کو برا بھلا
۔ل چلانی ذرا مشکل ہے۔ تم ہی دیکھو نا۔ کہ پہلے کیا ٹھیک وقت پر آتی
داداجان۔ اب ریل کے وقت بدل گئے ہیں" کہنے لگے "یہی تو میں بھی
۔ ۔ کہ پہلے وقت میں کیا برائی تھی جو بیٹھے بٹھائے اس کو بدل دیا۔ نہیں بھئی۔
تے ہی کہوں گا کہ اس ریل کو پرانی سرکار کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ ان کی دیکھی بھالی چیز ہے
۔م نہ سنبھلا ہے نہ سنبھلے گا" میں نے ہزار طرح سمجھایا کہ پہلے
کہتے رہے کہ ریل کو تو میں بکوا کر رہوں گا" خیر۔ خدا خدا کرکے
۔نے اندر جھانکا اور جھٹ باہر نکل آئے۔ میں نے کہا "اندر
یہ تیسرے درجہ میں لے چلو" بڑی مشکل سے میں نے اُن کو
کی ہیئت کذائی دیکھی تو کہا
Get out! This is
First Class.

داداجان انگریزی تو کیا خاک سمجھتے ہاں ان لوگوں کے چہرے اور الفاظ کے جھٹکے سے جان گئے کہ مجھے نکل جانے کو کہتے ہیں
فوراً باہر آگئے۔ پھر لاکھ سر مارا کہ اندر جا کر بیٹھئے۔ ان لوگوں سے بھی کہا کہ یہ پارلیمان کے ممبر ہیں لیکن داداجان کسی طرح راضی نہ
ہوئے۔ اور ساتھ ہی میرے پیچھے پڑ گئے کہ ساتھ چل۔ آخر میں نے بھی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور بیک بینی و دوگوش ان کے ساتھ
ریل میں سوار ہو گیا۔ تھرڈ کلاس میں بیٹھ کر داداجان کی طبیعت کھلی۔ پہلے اپنا تھیلا کھولا۔ ناریل نکالا۔ کوٹلے جلائے۔ چلم بھری اور
اپنے ہم جنسوں سے مزے مزے کی باتیں کرنے لگے۔ اناج کے بھاؤ پر بحث ہوئی۔ سرکاری مالگذاری کے قصے چھڑے۔ مقدمات کا
ذکر ہوا۔ نئی گورنمنٹ کے متعلق رائے زنی ہوئی۔ اپنے کارنامے دہرائے گئے۔ پارلیمان کے لئے تحریکات مرتب ہوئیں۔ غرض
رات کے گیارہ بجے تک یہی جھک جھک بک بک ہوتی رہی۔ میں تو کھڑکی میں سر رکھ کر سو گیا۔ معلوم نہیں کہ یہ قصے کب تک چلے
اور کب ختم ہوئے۔ ہاں صبح جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ داداجان اسی طرح اپنے یارد

صبح، بجے گاڑی آزادنگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ اول تو یہ شہر خود ہی بہ
ہونے کی وجہ سے اس کی چہل پہل اور بڑھ گئی تھی۔ اسٹیشن کی یہ حالت تھی کہ آد
قلیوں کی چیخ پکار اور سودے والوں کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی
نے کہا "میاں۔ ذرا ٹھہرو۔ بھیڑ کو چھٹ جانے دو۔ ابھی جلدی ہی کیا۔
نے کہا "داداجان۔ اس اسٹیشن پر تو ہر وقت یہی حالت رہتی ہے۔ بس اب اتر ہی،
یہ ریل ہٹ جائے گی۔ دوسری ٹرین آرہی ہے"۔ خیر بڑی مشکل سے ان کو اتارا۔ پہل
قلی کو بلایا۔ مگر بھلا قلی تھرڈ کلاس والوں کا سامان اٹھانے کب آتے ہیں۔ ان کو د
کب فرصت ملتی ہے۔ جب کوئی قلی نہ ملا۔ تو تھیلا میں نے اٹھایا۔ بستر دا
سے باہر نکلے۔ پارلیمان کے ممبروں کو لینے کے لئے جتنی موٹریں آئی
کہ موٹر کرایہ کی لے لیجئے اور ممبروں کی اقامت گاہ پر چلیئے۔ کہنے لگے "میں موٹر
میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ اسٹیشن کے قریب ہی ایک اچھی سرائے ہے
کا بندوبست بھی اچھا ہے۔ میں تو وہیں ٹھہروں گا"۔ میں نے ہزار
مگر وہ کیا ماننے والے تھے ہم اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ داداجا
میں کھڑا سواریوں کا انتظام کر رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "
کسی گاڑی یا موٹر کی ٹکر لگی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ میں نے کہا د
ٹھیر جاؤ جس طرف کا ہاتھ جھکا دیتا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس طرف

مگر اس بچارے پر ظلم ضرور ہو رہا ہے۔ ہاتھ پھراتے پھراتے شل ہو گئے ہونگے غضب ہے بارہ روپے مہینہ تنخواہ دو اور کام ایسا
سخت لو۔ کیا اسی کا نام آزادی ہے اور کیا اس بیوقوف کو آزاد کہا جا سکتا ہے۔ جو چند پیسوں کے لئے سڑک پر کھڑا ہو کر ناچے۔ غرض
وہ بزرگوار اسی طرح پٹڑی پر کھڑے منطق بگھارتے رہے۔ میں نے کئی دفعہ چلنے کو بھی کہا لیکن وہ اس سپاہی کی حرکات کا ایسے
غور سے مطالعہ کر رہے تھے کہ چلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آخر جب میں نے اُن کو یاد دلایا کہ دس بجے سے پارلیمان کا اجلاس ہے
اور آپ کو وہاں جا کر حلف لینا ہے اُس وقت اپنی جگہ سے کھسکے۔ آگے چل کر راستہ کا عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ ادھر انہوں نے پٹڑی سے
نیچے قدم رکھا اور کوئی موٹر پوں پوں کرتی سامنے یا پیچھے سے آئی۔ اور وہ بھاگ کر پھر پٹڑی پر آ گئے۔ میں نے اُن کو سمجھایا کہ آپ جہاں
کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہیں موٹر خود بچ کر نکل جائے گی۔ اس کے بعد اور آگے بڑھے اور اسی طرح ٹھیرتے ٹھیراتے سڑک پار کیجئے۔
...ی۔ دو ایک دفعہ تو بیچ سڑک سے بھاگ کر پھر اسی پٹڑی پر آ گئے جہاں سے چلے
...طرف آزاد سرائے تھی۔ وہاں جا کر دو پیہ روز پر ایک کوٹھڑی لی۔ کھانے
...ور پارلیمان جانے کو تیار ہو گئے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹا۔ میں نے کہا
...ی ایک نہ مانی۔ اور مجھ کو اُن کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ سرائے کے دروازہ
...لوئی گیارہ بجے پارلیمان کے دروازے پر جا پہنچے۔ یہاں سے میں
...لہ سیڑھیاں چڑھ۔ عمارت کے عالی شان پھاٹک میں قدم رکھا دروازہ
...ائے تھے ایک سبز اور دوسرا سفید۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفید ٹکٹ گیلری کا تھا۔ اور
...اگر کسی دوست کو لانا چاہو تو لا سکتے ہو۔ انہوں نے سفید ٹکٹ نکال کر افسر
...ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ نعلدار جوتے سے کھٹ کھٹ کرتے سیڑھیوں پر
...نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ انہوں نے ذرا آہستہ
...مرمر کی سیڑھیاں تھیں اور نعلدار جوتا۔ لاکھ دبا کر پاؤں رکھتے وہ کھٹ
...سپاہی نے وہی خاموشی کا اشارہ کیا۔ اب اُن کو سوائے اس کے کچھ نہ
...چنانچہ اس طرح یہ مشکل آسان ہوئی۔ سیدھی طرف جو دروازہ تھا۔
...جاؤ۔ یہ سڑک کے انتظام میں پولیس کے سپاہی کی حرکات
...جھٹ ڈبکی مار اُس کے ہاتھ کے نیچے سے گزر...
...ںوں نے جو دیکھا کہ ایک دہقان جوتیاں بغل میں دبا...
...بیگم صاحب نے بے دم ہو کر دادا جان کے کندھے
...وہ بھی بند ہو گیا۔ سب لوگ پھر پھر کر عورتوں کی گیلری کی طرف

دیکھنے لگے۔ صدر نشین نے "خاموش خاموش اور آرڈر۔ آرڈر" کے سینکڑوں نعرے مارے مگر کون سنتا تھا۔ آخر نیچے سے دو تین افسروں نے آکر اور دادا جان کو اس گیلری سے نکال کر زبردستی مردوں کی گیلری میں ٹھونس دیا۔ یہ تھوڑی دیر تک تو پریشاں حال بیٹھے رہے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اور لوگوں کی کہنیاں کھاتے دھتکاریں سنتے گیلری کے جنگلہ تک پہنچے اور جنگلہ پر دونوں کہنیاں ٹیک جھک کر نیچے کا تماشا دیکھنے لگے۔ لوگوں نے ہٹانا بھی چاہا۔ ٹانگوں میں چٹکیاں بھی لیں۔ مگر یہ کیا ہٹنے والی اسامی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب سے پوچھا "ارے بھئی یہ نیچے کیا ہو رہا ہے"۔ انہوں نے کہا کہ "پارلیمان کا اجلاس"۔ پھر سوال کیا کہ "نیچے جو لوگ بیٹھے ہیں یہ کون ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا کہ "یہ پارلیمان کے ممبر ہیں" اتنا سننا تھا کہ دادا جان نے نعرہ مارا کہ "ٹھیرو ٹھیرو۔ ہم کو بھی نیچے آنے دو۔ یہ ہمارے بغیر کیوں اجلاس کیا جا رہا ہے" اس آواز سے سب لوگوں کی نگاہیں مردانہ گیلری کی طرف خود بخود پھر گئیں۔ کیا دیکھتے ہیں
بپا کر چکے تھے۔ اب دوسری گیلری میں کھڑے اجلاس بند کرنے کا حکم دے
نشین نے بڑے زور سے "خاموش" کہا۔ دادا جان سمجھے کہ مجھے خاموش کر
ہم کیوں چپ رہیں۔ ایک تو ہمارے بغیر کمیٹی شروع کر دو اور پھر یہ کر
دیر میں نیچے سے پھر وہی دونوں افسر اوپر آئے اور اُن کو زبردستی گھسیٹ
اُن کو دکھائے۔ منتظمین کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت امن آباد کے ممبر
صدر نشین صاحب سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد اجلاس میں دادا جان
داستان ہے پھر کبھی عرض کروں گا۔

بھلائی

جتنی بھی تم سے ہو

بس ط

دہار

جب

جس

ہمیشہ جب

میڈیا

سینٹل کی مشہور تصاویر میں کولچس کی ساحرہ شہزادی میڈیا کی تصویر سے بڑھ کر مقبول شاید کوئی تصویر نہیں ہوئی یونانی دیومالا کے جس کردار کا انتخاب مصوّر نے کیا ہے اُس کی مثالی تصویر اُس کے مُوقلم کے اِس کارنامے کو دیکھ کر آنکھوں میں پھر جاتی ہے

ایک مضبوط قوتِ فیصلہ، ایک ناقابلِ تسخیر آزادی مزاج اور ایک طاقتور سیرت کی تصاویر پنڈورا اور سیفو کے چہروں کے مقابلے میں میڈیا کے چہرے پر نی ہے۔ اُس کے نازک نتھنوں اور کنجِ لب کے خوبصورت لیکن پُرغرور اشارہ سا جگر لگا تا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس چہرے میں بھول سکتی۔

س نے یونانی صنمیات کی مشہور ساحرہ سرسے ہے جو اس کی پھوپھی ہوتی اپ کے شہر میں گولڈن فلیس حاصل کرنے کے لئے پہنچا تو میڈیا اُسی اینلول ے حصول میں باپ کے خلاف جیسن کو اپنے جادو سے مدد دی اور ے گئی۔

نے جیسن کو اپنی طرف سے دل برداشتہ پایا۔ آخر جیسن نے کریئون شاہ کار نتیجہ

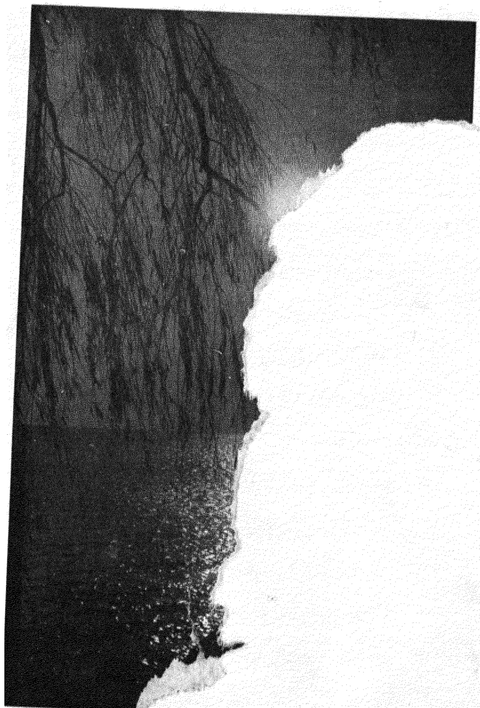
ں نے اپنی رقیب کو زہر میں بسا ہوا ایک لباس رمغاں دے کر ہلاک کر ر وہ اجسن کی محبت کا نام ونشان مٹانے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے

م نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ آہ اب تمہارے پاس کیا باقی رہا ہے؟

ئی نہ سہی
بل اور خود میں ہوں

حامد علی خاں





کا منظر

CALCUTTA ART PG. WORKS. LAHORE.

جینیوا کی جھیل پر

جینیوا کی جھیل پر آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ ادھر سوئٹسان کی پہاڑیاں ہیں ادھر سامنے فرانس کے پہاڑ۔ پانی ساکن و مطمئن ہے لیکن نہ اتنا کہ شام کی ہوائیں چلیں اور وہ ذرا بھی مضطرب نہ ہو۔ اس کی ننھی منی جنبشیں کسی حسین ہستی کے نرم و نازک دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہی ہیں!

آفتاب اُن خوبصورت شان دار پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانے کو ہے رخصت دید ہے۔ سونا پانی پر نچھاور ہو رہا ہے!

جھیل کے کنارے کنارے اِدھر سوئٹسان میں اُدھر فرانس میں ہزاروں، پہاڑوں پر سورج پر آسمان پر مسرت کی نگاہیں ڈالتے ہیں اور زندگی کا لُطف اٹھا... کی ضرورت نہیں نظاروں کو بھی چاہنے والے دلوں کی حاجت ہے!

یورپ کی آزاد قومیں فطرت کے حسن و خوبی کی دلدادہ ہیں۔ مغرب کے سمندروں اور ساحلی مقامات میں اپنی فرصت کے اوقات سیر و تفریح میں ... کر زندہ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ان کے تمدن کی رُوح و روا...

جینیوا کی جھیل یورپ کے مرغوب ترین نظاروں میں شامل پھیلے پڑے ہیں۔ حسن آزادی کی گود میں پرورش پا رہا ہے یا یوں کہئے کہ جمہوریت کی کیسی کیسی تحریکات آزادی کے لئے کیا کیا مساعی اس جھیل نے ساحل پر اپنی آنکھوں دیکھی ہیں، سوئٹسان کی آزادی کی لڑائیاں فرانس کے جمہ... کہ انگریزی شاعر بائرن نے اس کے ساحلوں پر حریت کے گیت گائے اور اٹھ... پر ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی زبردست آواز بلند کی!

جھیل کا سوئٹسانی کنارہ کوسوں تک انگور کی بیلوں... میلہ ہوتا ہے۔ یہیں ہے لوزان جہاں ترکی کی آزادی کی سبا... کی نئی امیدوں کا ماویٰ و ملجا ہے۔

راگ اور کھیل

میں کھیت میں سے گذرنے والی راہ پر اکیلی ٹہل رہی تھی اُس وقت جب کہ ڈوبتا ہوا آفتاب ایک کنجوس کی طرح اپنا آخری
سونا چھپا رہا تھا۔

ڈوبتی گئی اور بیوہ زمین جس کی فصل کٹ چکی تھی خاموش پڑی تھی۔ اچانک ایک لڑکے کی تیز
اپنے راگ سے معمور کرتے ہوئے وہ تاریک رستے پر سے گذرا۔
تھا۔ گنے کے کھیت کے پرے کھجور اور ناریل کے درختوں کے سائے میں چھپا ہوا۔
تاروں بھرے آسمان کے نیچے ٹھہری اور میں نے اپنے سامنے تاریک زمین کو دیکھا
مزتیں ہیں پنگوڑوں اور پلنگوں اور ماؤں کے دلوں اور شام کے چراغوں سے
جانتی کہ دنیا کے لئے اس کی قدر و قیمت کیا ہے!

ن بھر اک ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے کھیلتے۔
مسکراتی ہوں۔
رے رقمیں جمع کر رہی ہوں۔
یسا لکما سا کھیل ہے ساری کی ساری صبح کو بے مزہ کر دینے والا۔
دوں سے لطف اٹھانا بھول گئی ہوں۔
ز اور چاندی کے ٹکڑے جمع کر رہی ہوں۔
بنا لیتے ہو۔ اور میں اپنا وقت اور اپنی طاقت دونوں ہی ایسی

کے لئے جد و جہد کرتی ہوں اور یہ بھول جاتی ہوں کہ

بشیر احمد بیگم

انگریزی شاعری میں محبّت کا تصوّر

مندرجہ ذیل مضمون انگریزی ادبیات پر لفکاڈیو ہرن کے خطبات میں سے ایک کا ترجمہ ہے۔ لفکاڈیو ہرن ۱۸۵۰ء میں بمقام
لفکاڈیا (واقع جزائر یونان) پیدا ہوا اور اسی نسبت سے بعد میں اس نے اپنا مسیحی نام چھوڑ کر "لفکاڈیو" کا نام اختیار کیا
کا باپ سرجن میجر چارلس ہرن آئرلینڈ کا رہنے والا تھا جس کے خون میں جپسی (یا بہ الفاظ دیگر خانہ بدوش)
اس کی ماں ایک یونانی نژاد عورت تھی جس کی رگوں میں عربی خون بھی دوڑتا تھا۔ لفکاڈیو ہ
کسی قدر بے قرار طبیعت ترکے میں ملی تھی۔ سن شعور کو پہنچ کر وہ رومن کیتھلک عقائد سے
ہوگیا۔ اسی زمانے میں فکرِ معاش کے لئے اسے امریکا جانا پڑا۔ جہاں وہ کئی سال تک
پلتا رہا۔ ۱۸۹۱ء میں وہ جاپان آیا اور اُس نے محسوس کیا کہ یہی وہ سرزمین ہے جہا
اب تک اس کا کوئی مذہب نہ تھا مگر اب اس نے بدھ مت اختیار کیا۔ اُس نے جاپانی شہر
اپنا نام بدل کر ایک جاپانی نام رکھا اور ایک جاپانی عورت سے شادی کر لی۔ ۱۸۹۶ء میں وہ ٹو
کا پروفیسر مقرر ہوا اور یہیں اُس نے وہ بے نظیر خطبات کہے جن کا مجموعہ اب چار جلدوں میں
میں اسے خرابیٔ صحت کے باعث ٹوکیو یونیورسٹی سے الگ ہونا پڑا لیکن اب اُ
اچھوتے پن، زورِ بیان اور ادبی محاسن کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبو
ہوگیا۔

یہ خطبات مشرقی طالب علم کے لئے ایک خاص اہمیت
کو ایک مغربی ادیب نے ایشیائی طرزِ خیال پیشِ نظر رکھ کر
قاعدہ تھا کہ اپنے جاپانی شاگردوں کے سامنے کسی ادبی م
اس کے طلبہ اُن الفاظ کو جو اس کے منہ سے نکلتے تھے قلمب
خوبیاں نظر آتی ہیں جو کسی محنت سے تیار کی ہوئی صنعت
تھا کہ طلبہ کے لئے اس کے یہ خطبات کبھی دنیا کی نظر سے
بعد اس کے دوستوں نے اس کے بعض جاپانی شاگ

ان اسباق میں ایک گراں بہا ادبی خزانہ چھپا ہوا ہے۔

اگر لفکا ڈیو ہرن کو ان خطبات پر نظر ثانی کا موقع ملتا تو بعض غیر اہم اور فرعی نقائص یقیناً رفع ہو جاتے لیکن وہ بے تکلفانہ اظہار خیال جس نے ان تقریروں کو رسمی تنقید کے پھیکے پن سے بلند کر کے بے حد دلکش بنا دیا ہے غالباً رخصت ہو جاتا جو کچھ وہ یہاں کہتا ہے، انگلستان کے ثقہ نقادوں کے لئے نہیں بلکہ جاپانی طالب علموں کی ایک جماعت کے لئے کہتا ہے نقادوں کے وہ "عالمانہ" تبصرے جو کسی نظم یا افسانے کے مالہٗ وما علیہ پر بصیرت افروز نکتہ آفرینی کرتے ہیں اور خود نفسِ مضمون کو نظر انداز کر دیتے ہیں یہاں نہیں ملتے۔ پروفیسر جان ارسکن کے الفاظ میں "لفکا ڈیو ہرن کو نقادانِ ادب کی صف ... [illegible] ...صل یہ ہے کہ وہ ہمارے اصلی اور خالص ادبی تجربے پر وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی براہ راست ان احساسات ... [illegible] ...سے واقعی ہم پر طاری ہوتے ہیں" اور حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے انگریزی ادب کا ... [illegible] ...یں ہو سکتا۔ مشرق اور مغرب کے فلسفے سے اس کی گہری واقفیت ان خطبات میں ... [illegible] ...کی قدر و قیمت تشریحات ادب کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی ہے۔

... [illegible] ...س قدر زیادہ عرصہ تک جاپانی طالب علم کو انگریزی ادب کے مطالعہ کا موقع ملے گا اسی قدر ... [illegible] ...گا جو افسانہ نویسی اور شاعری میں محبت کے جذبہ کو دیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو خود میں بھی اس ... [illegible] ...یں آنے سے پہلے یہ بات مجھے بالکل قدرتی معلوم ہوتی تھی کہ محبت ادبیات کا سب سے ... [illegible] ...کسی اور تہذیب و معاشرت سے مجھے مطلق واقفیت نہ تھی۔ لیکن آج مجھے یہ بات حقیقت ... [illegible] ...معلوم ہوتی ہے تو بھلا تم کو کتنی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہوگی! بلاشبہ اس مسئلے ... [illegible] ...کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اور ہر چیز کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ ... [illegible] ...سیدھی سادھی تشریح کافی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی باتیں ... [illegible] ...ابھی عشق کو اپنا موضوعِ اکبر قرار دیتے ہیں؟ مجھے بالکل علم نہ تھا، ... [illegible] ...ون سے کس قدر لبا ہوا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مجھ ... [illegible] ...لئے نظم و نثر سے منتخبات حاصل کرنے چاہے جس میں میری ... [illegible] ...سبت سے نہیں بلکہ دوسرے مضامین سے تعلق رکھتے ہوں ... [illegible] ...بمشکل ہی کچھ مل سکا۔ مقالہ (Essay) اور تاریخ کی ... [illegible] ...بیت سے مشہور ہیں۔ اور تقریباً محال ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مستند ... [illegible] ...ں اُن میں چومنے، گلے ملنے یا کسی خیالی یا حقیقی معشوق

کی حسرت و آرزو کے متعلق کچھ نہ ہو۔ ورڈزورتھ البتہ کسی حد تک مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے اور کولرج سب سے زیادہ ایک ایسی نظم کے لئے مشہور ہے جس میں محبت کو قطعاً کوئی دخل نہیں لیکن مستثنیات کا اس عام اصول پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا کہ محبت انگریزی شاعری کی روح ہے۔ اور اسی طرح فرانسیسی، اطالوی، ہسپانی اور جرمن شاعری کا بھی یہی موضوع ہے یہ محرک ہر جگہ موجود ہے +

اسی اصول کا اطلاق انگریزی افسانہ نگاروں پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ مستثنیات نظر آتی ہیں مثلاً رابرٹ لوئی سٹیونسن کے اکثر ناولوں میں عورتوں کو تقریباً کچھ دخل نہیں۔ اس کے ناول زیادہ تر مہمات و خطرات کے افسانے یا حکایتیں ہیں لیکن اس قسم کی مستثنیات بہت کم ہیں۔ آج کل انگلستان میں ہر سال ایک ہزار کے قریب نئے ناول شائع ہوتے ہیں اور ... افسانے ہوتے ہیں۔ ایسا ناول لکھنا جس میں کوئی عورت نہ ہو کچھ زیادہ حوصلہ افزا کام نہیں۔ سو میں سے ننانو ... ہو سکتیں۔

جو کچھ میں نے اوپر کہا اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی انگریزی ... مضمون زیر بحث سے ہے جب تم ایک پوری قوم کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ... اس کا باعث تم یقیناً یہ قرار دے سکتے ہو کہ وہ مسئلہ اوسط درجہ کے انسان کی زندگی میں بے انتہا ... کہ ایک ایسے نظام معاشرت کا تصور قائم کرنے کی کوشش کرو جس میں کسی دوسرے شخص کی مدد ... شوہر بطور خود انتخاب کرنا ہوتا ہے، اور نہ صرف انتخاب کرنا بلکہ ممکن ہو تو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مغربی مقابلہ اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کا نفاذ ہے۔ بہت ... طاقتور اور سب سے زیادہ زیرک ہو) بہترین عورت ملنے کا امکان غالب ہوتا ہے جہاں ... ہوتی ہے سکڑو، نحیف، بے مایا اور کریہ صورت لوگوں کو شادی کرنے ... شادی ناممکن ہوتی ہے۔ اس وقت میں طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ متوسط کا ... نوعمری میں شادی کر لیتے ہیں لیکن کشمکش یہاں بھی بالکل ایسی ... کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو شادی کرنے کے لئے کسی نہ کسی ... لئے ایک طرح کی جنگ، یا معرکہ ہوتا ہے۔ نہ صرف انگلستان ... تم بہ آسانی سمجھ سکو گے کہ اہلِ مغرب کے لئے ایسی ادبیا ... زیادہ دلکشی ہے۔

اگرچہ وہ حالات، جو میں نے ابھی بیان کئے تمام ... سے سروکار ہے ان ممالک میں مطلق یکساں نہیں۔ اس ...

زیادہ گہرے اور کہیں زیادہ اہم ہیں۔ کیونکہ تمام ممالک میں رائے عامہ کسی شخص کو نثر کی بہ نسبت نظم میں زیادہ آزادی دیتی ہے۔ اس
مضمون کے اسلوب بیان میں یہ اختلافات فی الحقیقت سیرت کے قومی امتیازات پر دلالت کرتے ہیں۔ شمالی اقوام کے
عشقیہ افسانوں اور عشقیہ شاعری میں زیادہ متانت اور زیادہ سنجیدگی ہے اور اُن کے مصنفین حدود معینہ سے تجاوز نہیں کرتے۔
بعض مضامین عام طور پر ممنوع ہیں۔ مثلاً انگلستان میں عوام محبت کے متعلق ناول چاہتے ہیں۔ مگر یہ محبت ایک ایسی لڑکی کی محبت
ہونی چاہئے جو کسی کی بیوی بننے والی ہو۔ انگریزی ناولوں میں قاعدہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے کی کشمکش اندیشے اور درد یا بالفاظ دیگر
وہ جد و جہد بیان کی جائے جو دنیا میں شادی کے حق کے لئے کی جاتی ہے۔ محبت کے کسی دوسرے پہلو کے متعلق کسی شخص کو نہ
ہیں شک نہیں کہ بہت سے مصنفین نے اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی ہے لیکن بایں ہمہ قاعدہ موجود ہے کوئی
رمیان مقابلہ دکھا سکتا ہے جن میں سے ایک اچھی ہو اور ایک بُری لیکن اگر کہانی میں بری عورت کی جیت
۔ یہ انگریزی دستور اٹھارویں صدی یعنی رچرڈسن کے وقت سے قائم ہے اور قیاس چاہتا

قاعدہ کی مطلق پابندی نہیں ہوتی۔ فرانس کے ناول زیادہ تر عورتوں کے ان تعلقات کو بیان
سے اور حستاق کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی افسانوں کا معتدبہ حصہ مرد اور عورت کے
سی باتوں کے متعلق ہوتا ہے جن کو اہل انگلستان اپنے افسانوں میں روا نہیں رکھتے۔ اس کا یہ مطلب
بیبیوں یا دوسری جنوبی اقوام کے مقابلہ میں کوئی تفوق رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے
ے فرق ہیں۔ اس قسم کا ایک فرق نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک انگریز
ٹن کی کسی لڑکی کو شادی سے پہلے ہر ممکن حد تک آزادی میسر ہوتی ہے۔ لڑکی سے
ل بنو اور کوئی برا کام نہ کرو"۔ شادی کے بعد اس آزادی کا خاتمہ ہو جاتا
سختی سے نگرانی کی جاتی ہے لیکن فرانس اور ممالک جنوب میں شادی
بھائی اپنے باپ اپنی ماں یا کسی تجربہ کار رشتہ دار کی حفاظت میں
دوسرے لوگوں کی موجودگی کے بغیر اسے اپنے منگیتر سے ملنے
تا ہے۔ اُس وقت پہلی مرتبہ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی
ل کی تحریر میں افسانہ نگاروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں شمالی
لکھے ہوئے اور انگلستان میں لکھے ہوئے ناولوں کی نوعیت

جنہیں ہم احساس ادبی کے ارباب کہہ سکتے ہیں جنوبی یا

لاطینی اقوام کو شمالی اقوام کے مقابلہ میں تہذیب و تمدن کی منزل تک پہنچے بہت زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ انہیں پرانی دنیا یعنی قدیم یونان اور روما کی دنیا، کی حسیات ورثہ میں ملی ہیں اور ذکور و اناث کے باہمی تعلق کی نسبت ان کا طریقِ فکر و خیال اب بھی بہت کچھ وہی ہے جو قدیم شاعروں اور داستان نگاروں کا تھا۔ وہ ایسی ایسی باتیں کر دکھاتے ہیں جو انگریزی مصنفین سے ممکن نہیں کیونکہ اُن کی زبان میں نزاکتِ بیان کی استعداد زیادہ ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لاطینی مصنفین محبت کا ذکر اب بھی بہت بڑی حد تک اسی طرح کرتے ہیں جس طرح مسیحیت کے ظہور سے پہلے کرتے تھے۔ لیکن مسیحیت کے ذکر سے میرا مقصود ایک خاص تاریخی زمانہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، ورنہ مسیحیت سے پہلے شمالی اقوام کا نقطۂ نظر بھی محبت کے متعلق بہت کچھ وہی تھا جو ان کے بہترین شعرا کا آج کے دن تک ہے۔ سکنڈ نیویا کی قدیم ادبیات سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ اُس پرانے بحری قزاق کا جسے "وائیکنگ"[1] کا نام دیا جاتا ہے محر
جو آج ٹینی سن یا میرڈتھ کا ہو سکتا ہے۔ اُس کے نزدیک صرف ایک محبت سچی اور حقیقی ہ
وہ الفت جو شوہر اور بیوی کے دلوں کو ایک کئے ہوئے ہو۔ اس کے علاوہ ہر چیز اُس
مسئلہ کے متعلق اُس کا یہ جذبہ نہ بدل سکی۔ زمانۂ حال میں انگلستان، سوڈین، ڈنم
گہرے، سنجیدہ، شریفانہ خلوص سے دیکھتا ہے جس سے اس کے مشرک آبا و اجداد د
نسلوں کے درمیان تعلقاتِ ذکور و اناث کے بارے میں جذبہ و احساس
تاریخ سے بہت زیادہ پرانے ہیں۔ ان کا دخل قوموں کے رگ و ریشہ اور روح
سکتی ہے۔

اب تک میں بالتخصیص فرانسیسی اور انگریزی ناولوں کے فرق
کیونکہ قصے کی صورت میں حقیقت کی ہو بہو روئداد ہوتے ہیں لیکن
واضح اور نمایاں ہے۔ زمانہ حال میں لاطینی اقوام کے شعرا عشق
شہنشاہ اغسطوس کے عہد کے قدیم لاطینی شعرا کا شعار بھی
وقت بہت ضبط ملحوظ رکھتے ہیں۔ اب حدِ فاصل کہاں قا
صحیح ہے؟ عشق کے مضامین پر قلم اٹھاتے وقت ہم کس ط
بری ہے؟

لازم ہے کہ عشق کی کوئی تعریف کی جائے۔

---

[1] یہ آٹھویں سے دسویں صدی تک کے زمانے کی طرف
ظلوم سمندروں پر لوٹ مار اور غارت گری کی خطرناک مہموں میں ہو

محبت سے کیا مراد ہے؟ لاطینی مصنفین کے استعمال کے مطابق اس لفظ سے معانی کا ایک سلسلہ وابستہ ہوگیا ہے جو حشرات
یا حیوانات کے شہوانی تعلق سے لے کر مذہبی جذبہ کی اس اعلیٰ ترین شکل تک پھیلا ہوا ہے جسے "محبت الٰہی" کہتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے
کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایسی ڈھیلی ڈھالی تعریف ہمیں کام نہیں دے سکتی۔ انگریزی لفظ سے بہ اتفاق رائے شہوانی جذبہ اور گہری
دوستداری دونوں مراد ہوتے ہیں لیکن یہ معنی بھی ہماری ضرورت سے زیادہ وسیع ہیں۔ روزمرہ کی گفتگو میں "سچی" کی صفت محبت سے پہلے
بڑھا کر اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب کوئی انگریز سچی محبت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی مراد بالعموم ایک ایسی چیز
سے ہوتی ہے جس میں جذبہ اور خواہش کو مطلق دخل نہ ہو یعنی ایک کامل دوستداری جو شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے اور
جسے اُس جذبہ سے جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لایا تھا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن جب انگریز شاعر محبت کا ذکر کرتا ہے

ے ہوتی ہی ہیں صرف بہت عام اصول بیان کر رہا ہوں۔ تم نے دیکھا یہ مضمون کس قدر پریشان کن
ڈری دیر کے لئے تعریف کے سوال کو چھوڑ کر اس مسئلہ پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کریں۔

ہی ہیں محبت (یعنی ذکور و اناث کی باہمی محبت) کو مختلف انواع میں تقسیم کرنے
یل کی دوسری چیزوں کا نام لیتے ہیں یہ سب لاطینی مزخرفات ہیں۔ الفتِ جنسی کے
ہ فطری کشش جو مرد اور عورت کے درمیان ہو۔ اور اس کشش کی اعلیٰ ترین اور
انی جمالیاتی اور اخلاقیاتی احساسات کی ایک بہت بڑی تعداد کو اس جذبہ سے
ہیں ہوتے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جذبہ کی بلند ترین صورتوں
پیچ کیوں نہ ہو۔ یہ قبضہ و تسلط کی خواہش ہے۔ قبضہ کے بعد جو کچھ ہوتا ہے
سے کامل ہمدردی اور رفاقت کہہ لیا جائے یہ بالکل ہی ایک الگ چیز ہے۔
ے، وہ دوستداری نہیں جو اس جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔

ریزی میں جو لفظ (passion) استعمال ہوتا ہے لغوی طور پر
سے متعلق ہو تو مغربی ذہن کے لئے خاص معنی رکھتا ہے کیونکہ اس
ے جب مراد بھی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس جذبہ کا

ان مظاہر ذہنی کی حیرت انگیز نوعیت پر نگاہ ڈالنی چاہئے۔
ہیں مبتلا ہو جاتا ہے، ایک ایسے عجیب و غریب فریب میں کہ
اہم ہے کہ افلاطون نے ایک مشہور نظریہ میں اس کی توضیح
و بظاہر بدل دیتا ہے یا یہ کہو کہ ایک خاص زمانہ میں کہ

کے حواس کو فی الحقیقت بدل دیتا ہے۔ اس کی آنکھ کے لئے ایک خاص چہرہ یک بیک دنیا کی حسین ترین چیز بن جاتا ہے۔ اس کے کانوں کو ایک خاص آواز کا زیروبم دنیا بھر کی موسیقی سے زیادہ شیریں معلوم ہوتا ہے عقل کو اس سے کچھ سروکار نہیں اور عقل کو اس افسون پر مطلق قابو نہیں ہوتا۔ قدرت کے حیرت خانۂ اسرار میں سے نکل کر خدا جانے کس طرح یہ عجیب سحر کسی شخص کے حواس کو ناگہاں منور کر دیتا ہے اور پھر جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب فوق الفطرت چیز ہے اور کوئی عجیب فوق الفطرت نظریہ ہی اس کی تشریح کر سکتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر تک نے اس کے متعلق ایک جدید نظریہ قائم کرنے کی غرض سے اپنا استدلال صرف کیا ہے۔ اس بارے میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تم کو صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ اب عشق کے متعلق ایک طرح سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے موجودہ زندگی سے علاوہ دوسری زندگیوں سے کچھ علاقہ ہے مختصراً یوں سمجھو کہ ایک قسم کی بتدریج ارتقا باقی ہوئی یاد ہے اُن تعلقات کی جو وجود کی ہزار ہا اور لاکھوں گزری ہوئی صورتوں میں قائم تھے۔ یہ نظریات صحیح ہوں یا غلط عشق کی یہ ... کہا جاسکتا ہے

اعلیٰ درجہ کی شاعری کا موضوع ہے۔ صرف اس لئے کہ یہ انسانی زندگی کا سب سے زیا...

اور کیوں؟

اس لئے کہ اس احساس کی قلیل مدت میں وہ بلند سے بلند، وہ لطیف سے لطیـ...
بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت آدمی کم از کم ایک انسانی ہستی کے لئے ایسا بے غر...
نہیں ہوتا۔ نہ صرف بے غرضی بلکہ ایثارِ نفس ایک ایسی خواہش ہے جو اس...
اسی پر رضامند نہیں ہوتا کہ جس سے اُسے محبت ہے اپنی ہر چیز اس کی نذ...
اس کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ اسی لئے ٹینی سن نے اِس وقت...

عشق نے زندگی کا رباب اٹھا لیا اور اس...
چوٹ لگائی،
خودی کے تار پر چوٹ لگائی جو لرز...

بلاشبہ بے غرضی بجائے خود ایک نہایت شریفانہ احسـ...
میں اعلیٰ درجہ کے اور محسوسات بھی موجود ہوتے ہیں۔ رحم...
یا مددگار سے الفت، حفاظت کرنے کی آرزو، یہ سب...
کے مقابلے میں زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے ادائے فرض...
انداز میں ذہن پر روشن ہوتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص ان...
اخلاقی احساسات سب سے زیادہ گراں قدر...
سے اخلاقی تجربہ کی بہت بلند شکل ہے۔ حکمت در...

ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رشتہ اطلاقی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس دنیا کی کسی چیز میں اطلاقیت نہیں لیکن رشتہ قائم ضرور ہے۔ جو شخص
ایک نوع کے حسن کی بلند ترین صورت کا ادراک کرسکتا ہے، وہ دوسری نوع کے حسن کو بھی کسی نہ کسی حد تک شعور میں لاسکتا ہے
مجھے خوب معلوم ہے کہ ایام محبت کی معراج ایک فریب، ایک دھوکا ہے۔ ہزار میں سے نو سو ننانوے صورتوں میں محبوب عورت
کا حسن صرف تصور میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس سے اُن حقائق کی پاکیزگی میں جو اس تصور کے ساتھ وابستہ ہیں کوئی فرق
پیدا ہونا ممکن ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ حسن کا تصور کرنا درحقیقت اُس کو دیکھنا ہے۔ خارجی طور پر تو شاید یہ صحیح نہ ہو
مگر باطنی طور پر بلا شائبہ شبہ و شک ہم کو حسن نظر آجاتا ہے۔ خواہ تم اس حسن کو صرف اپنے ذہن میں دیکھو، یہ تمہارے ذہن میں ہے،
تو سہی اور اس کا اخلاقیاتی اثر تمہارے ذہن میں بروئے کار تو ضرور آئے گا۔ جس دوران میں کوئی شخص خواہ فرضی جسمانی حسن
ستش کرتا ہو اس ... قسم کے حسن، دل و دماغ کے حسن، کی ایک چھپی ہوئی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کیا اس دنیا
نے منظور نظر عورت کو بنی نوع انسان میں نہ صرف سب سے زیادہ خوبصورت بلکہ اخلاقی
میں تو ایسا کوئی نہیں ہوا۔

ب یوں بیدار ہوتے ہیں تو اس کی تمام لطیف تر انسانی قوتوں کو دفعتہً پیغام
ہمت، شجاعت و بسالت اور ہر طرح کے انتہائی مشقت طلب داعی یا
اور صحت عمل کی مقتضی ہو۔ کم از کم اس وقت کے لئے انسان اپنے اندر ایک
نے قوا کے بہترین استعمال کے لئے زبردست تحریک کرے فائدہ رساں
قلیل مدت میں جس کا ذکر میں کر رہا ہوں عورت یا مرد کی سیرت کے بہترین
بدنما پہلو جس حد تک ممکن ہو نظر نہیں آنے پاتے۔

ت سے دوسرے اسباب کے باعث جن کا ذکر کیا جاسکتا ہے،
ستان لکھنے والے قدرتہً جائز طور پر بیان کرسکتے ہیں۔ کیا وہ
پر منحصر ہے کہ وہ اوپر جاتے ہیں یا نیچے۔ اوپر جانے سے میری
مراد محض حیوانی موجودیت[1] کی سطح پر اتر آنا ہے۔ اس موجودیت
کا بہترین حصہ اس پر مبذول ہو۔

کیا یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے کہ جو حالات دنیا میں موجود
نے اُن بہتر حالات کے وجود میں آنے کا راستہ

---

[1] ان کا اعلیٰ ترین تصور یا نصب العین ہو مثالیت کہلاتی ہے۔

ے۔

صاف کیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ فنونِ لطیفہ کی تمام اعلیٰ درجہ کی مثالوں نے یہی کیا ہے۔ کیا تمہیں وہ پرانا قصہ یاد ہے کہ یونانی مائیں اپنے کمروں میں کسی دیوتا یا انسان کی مورت جو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ حسین ہوتی تھی اس غرض سے رکھتی تھیں کہ اُن کا تصورِ حسن کے نظارہ سے ہر وقت متاثر ہوتا رہے اور اس طرح وہ شاید اس قابل ہوں کہ زیادہ خوبصورت بچے دنیا میں لاسکیں؟ عرب میں بھی مائیں کچھ اسی قسم کا کام کرتی ہیں لیکن چونکہ اُن کے ہاں صورت گری کا کوئی فن نہیں اس لئے وہ خود فطرت سے زندہ صورتیں مستعار لے لیتی ہیں۔ سیاہ روشن آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں اور بیویاں اپنے خیموں میں ایک چھوٹا سا ہرن رکھتی ہیں جسے غزال کہتے ہیں۔ یہ ہرن اپنی آنکھوں کے حسن اور درخشانی کے لئے مشہور ہے۔ اس پیارے جانور کو عربی بیوی اس امید سے ہمیشہ دیکھتی رہتی کہ کبھی وہ ایک ایسا بچہ دنیا میں لائے گی جس کی آنکھیں غزال کی آنکھوں کی طرح خوبصورت ہونگی۔ فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ ترین کوشش کو ہماری یا کم از کم دنیا کی وہی خدمت بجالانی چاہئے جس کی توقع یونانی اور عربی ماؤں ... کہ ... تقد ... لیعنی
حالاتِ موجودہ سے بلند تر حالات کا وجود میں آنا ممکن ہو۔

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد دوبارہ غور کرو کہ کسی انسانی زندگی میں جذبہ ...
اپنی اصلیت و ماہیت کے اعتبار سے مثالیت کا زمانہ ہے ـــ وہ زمانہ جس میں ...
ہیں انسان کے تخیل میں آتے ہیں۔ کیونکہ ہر وہ شخص جس نے محبت کی ہے کسی ...
ہو۔ ہر قسم کی مثالیت فنونِ لطیفہ کا جائز موضوع ہوسکتی ہے۔ موجودیت کا ...
لطیف احساس سب کچھ ایک سادہ سی حیوانی تحریک کی بنیاد پر قائم ہے لیکن اس ...
سا فرق بھی نہیں آتا۔ بالکل یہی بات ہم تمام انسانی جذبات کے متعلق کہہ سکتے ...
خود غرضانہ ہیجانات تک پہنچتا ہے جن میں انسان ادنیٰ حیوانات کے سا...
درخت کی جڑیں زمین میں ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس ...
اس کی نظر نہ آنے والی جڑوں سے نہیں جانچنا چاہئے لیکن اگر ...
متعلق کیا کہا جائے گا؟ جب جڑیں اس طرح کھود ڈالی جائیں تو د...
موجودیتین یہی کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا شوق ہے ...
طرف جسے چھپائے رکھنا چاہئے۔ اور اسی وجہ سے چھپا...
اگر درخت کا زندہ رہنا مقصود ہو۔

الغرض ایامِ فریب ہی عشق کی ساعتِ زریں ہیں ...
بات کی آزادی ہونی چاہئے کہ بڑی سے بڑی بلند پرواز ...
ہے لیکن اس صورت میں صرف دو سمتیں ہیں جن کا رخ ...

کی طرح عشق کو مذہبی کیف و سرور کے جذبہ کی شکل دینے میں کامیاب ہو جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شاعر زمانۂ حال میں یہ کر سکتا ہو ہمارا عہد مذہبی وجد و نشاط کا عہد نہیں۔ لیکن اوپر کی طرف جانے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ نیچے کی طرف چلتے چلتے شاعر اتنا نیچے اُتر سکتا ہے کہ جہنم تک پہنچ جائے۔ بلا شبہ حدودِ مثالیت اور موجودیت کے حیوانی نقطۂ نظر کے درمیان متعدد تدریجات ہیں۔ میں صرف اُس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو میرے نزدیک ایک صداقت مطلقہ ہے کہ محبت کے بیان میں اساتذۂ فن کو ایام قریب سے سروکار رکھنا چاہئے۔ اس سے نیچے اترنا ایک خطرناک کام اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اور اب کہ ہم اس موضوع کے متعلق بلند پایہ ادبیات اور ان چیزوں کے درمیان جو بلند پایہ نہیں ہیں ایک ایسی حدِ فاصل قائم کرنے کی کوشش کر چکے ہیں جو موزوں اور صحیح خیال کی جاتی ہے ہم بعض مثالوں کا مطالعہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں انگریزی اور دوسرے شعرا کے کلام سے ایسے قطعات دست بردانشتہ انتخاب

... قرار ہو۔

بے زیادہ ٹینی سن سے روشناس ہو اُس نے عشق کے جذبۂ مثالی کے چند نفیس نمونے

... آخری بند ہے جو اس کی مشہور نظم "ماڈ" میں آتا ہے۔ میرا مطلب اُس موقع سے

... بوبہ کے قدموں کی چاپ اُسے قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

...ری میری شیریں ادا،

...تنی نزاکت ہو

...اِسن لے گا اور دھڑکنے لگے گا۔

...چھونے میں مٹی ہو گیا ہو۔

...صدا سنے گی اور رقص کرے گی ———

...رہا ہوں۔

...کے نیچے تڑپے گی اور گلنار او رقرمز

...تو یہ کہہ لو کہ شاعر کا زورِ تخیل حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے

...لازماً حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہ سوال کرنا

...ے ہوئے آدمی کو بیدار کر سکتی ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ محبت

...ک سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم اور ہر ملک کے لئے

...ہے۔ بعینہٖ یہی خیال نسبتاً سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا

...دہ ہے۔ اس عبارت کا اصل مطلب صرف یہ ہے کہ

عاشق کے لئے محبوب عورت کی آواز اور نگاہ اور مس بلکہ پاؤں کی آہٹ بھی موت اور زلیست کے برابر اہم ہوگئی ہے۔اس دوران میں وہ کسی اور معبود کو نہیں جانتا۔وہی اس کی دیوی ہے کیونکہ عاشق پر جو اختیار اُسے حاصل ہوگیا ہے وہ نامحدود اور ناقابلِ مدافعت ہے۔

دوسری مثال ہم اسی نظم کے ایک اور حصّے سے لیتے ہیں۔شادی کا وعدہ دیا جا چکا ہے اور عاشق کی زبان سے کامرانی کا نغمۂ سرور بلند ہوتا ہے ؎

آہ یہ مضبوط، یہ ٹھوس زمین
کہیں میرے پاؤں تلے سے پھسل ہی نہ جائے
اس سے پہلے کہ میری زندگی بھی اس چیز کو پا سکے
جسے بعض دوسروں نے اس قدر شیریں پایا ہے۔
اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا ہو، ہو جائے،
خواہ میں مجنون ہی کیوں نہ ہو جاؤں
میں اپنا بہار کا دن تو دیکھ چکا ہوں گا۔

یہ پیارا آسمان ابھی اور کچھ دیر تک برقرار رہے
اور اس کی وسعت سمٹتی ہوئی کہیں میرے سر پر
اس سے پہلے کہ میں یہ جان لوں، سچّے دل سے
کہ دنیا میں کسی کو مجھ سے بھی محبت ہے۔
اس کے بعد جو کچھ بھی ہونا ہو، ہو جائے،
ایک سراپا الم زندگی کو ان باتوں کا کیا ڈ
میں اپنا بہار کا دن تو دیکھ چکا ہوں گا۔

عاشق کے دل کی کیفیت یہ ہے کہ بعد میں خواہ کیا کچھ ہو
زلیست اور موت اور درد و الم اور ہر چیز کی قیمت ادا ہو جاتی
استغنا ہے جو انسان کو نتائج سے بے پروا بنا دیتا ہے مگر ا
پر کوئی حرف نہ آتا ہو۔اور یہ تو بالعموم سمجھ ہی لیا جاتا ہے کہ (اشد
پاکیزہ فطرت کے لوگ ہوتے ہیں۔آگے چل کر جب ہم محبت کے ایک
ٹینی سن سے کہیں زیادہ حیرت انگیز کمال کے ساتھ با:

نظم سناؤں جس میں اُس نے عشق کی دلفریب کہانی کو نہایت خوبی اور نزاکت سے بیان کیا ہے۔ یہ چیز زمانہ حال کی نہایت دلآویز نظموں میں سے ہے اور عجب نہیں کہ ہمیشہ رہنے والے اشعار کی صف میں جگہ پائے کیونکہ یہ اب تک نظم کے چار یا پانچ مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا عنوان "اٹیلانٹا کی دوڑ" ہے۔

سب سے پہلے میں تمہیں اٹیلانٹا کی کہانی سناتا ہوں تاکہ تم نظم کی لطیف تلمیح کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ سکو۔ اٹیلانٹا ایک یونانی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے برابر خوبصورت نہ تھی اور اس کے ساتھ ہی دنیا میں کوئی شخص اس کے برابر تیز نہ دوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنا وقت سیر و شکار میں گزارتی تھی اور شادی کرنا نہ چاہتی تھی لیکن چونکہ بہت لوگ اس سے شادی کرنے کے آرزومند تھے اس لئے ایک قانون بنایا گیا کہ جو شخص اُس سے شادی کرنا چاہے اُسے شہزادی کے ساتھ پہلے ایک دوڑ

گ گ

رہے تو شہزادی اس سے بیاہ کرے گی لیکن اگر وہ ہار جائے تو اُس کی سزا موت ہوگی۔ ایک
تھا اور لڑکی ہاتھ میں ایک نیزہ لئے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگتی تھی۔ یہاں تک کہ
تی تھی۔ اس دوڑ کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ شادی کے بہت سے خواستگاروں
رہیں ایک نوجوان آیا جس کا نام ہپومینیز تھا۔ اُسے محبت کی دیوی نے سونے
یہ سیب گراتے جاؤ گے تو لڑکی ان کو اٹھانے کے لئے رکے گی اور اس طریقے پر تم
نے اپنے آپ کو دوڑ ہارتے ہوئے پایا تو ایک سیب پھینک دیا۔ لڑکی سیب کو
آگے نکل گیا۔ اسی ترکیب سے اُس نے دوڑ جیت لی اور اُس کی شادی
یں ہپومینیز اور اُس کی بیوی شیروں کی صورت میں بدل دیئے گئے
سے یہاں ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ یونان کے اس پرانے قصے میں ایک
ہے کہ اس کے مصنف مارس ٹامسن نے اس لطیف نکتے کو سمجھا
کیا ہے

اور خواب ناک ہوائیں شیریں خوشبوؤں

ٹھنڈے ٹھنڈے کنج اشجار کے درمیان
روشوں پر اپنے سبک رو قدموں کے

اور مجھے ایسی سرگوشیوں میں جو گلاب کے پھولوں کی سانس کے مانند میٹھی ہیں،
پیغام دیتی ہے کہ بھاگ کر آؤ!
میں جانتا ہوں کہ اس دوڑ میں ہارنا میرے لئے مقدر ہو چکا ہے
اور آخر میں، مجھے معلوم ہے، کہ موت میرے لئے کھڑی ہے

لیکن میں خوش و خرم اپنا بند بند برہنہ کر دیتا ہوں
اپنے بدن کو نسیم تابستاں کے جھونکوں کی مالش کے لئے کھول دیتا ہوں اور اپنی ایک
ایک رگ، ایک ایک ریشے میں
مجھے ہیومینیز کی چستی اور تنومندی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
آہ اے محبت کی دوڑ! ہم سب
کنج ہائے بہاریں سے ہوتے ہوئے تیرے پُرسرور میدان میں
اور جب آخر کار ہم ہارے، تو ہم نے
زندگی اور موت اور کسی چیز کی پروا نہیں کی!

ان اشعار میں دو ایک باتیں تھوڑی سی شرح کی محتاج ہیں۔ تم جانتے
میں فرار ہا کرتے تھے اور جو لوگ مقابلوں میں اترتے تھے وہ اپنے سب کپڑے
کی جاتی تھی اس سے غرض کچھ تو یہ ہوتی تھی کہ جلد دھوپ اور گرمی کے اثر
شاعر نظم میں نوجوان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ بہار کی یعنی انسانی زندگی
دلآویز خیال ہے۔ جو بات وہ ہم کو سمجھا رہا ہے دراصل یہ ہے:
"اگرچہ یونانیوں کے میلے اور کھیل ختم ہو گئے لیکن محبت
شباب کی فضا گویا مقابلے میں اُترنے والے کی مالش ہے"
مگر نظم کی اصلی خوبی اُس اخلاقی سبق اور اس دلکش ا
کیا ہے۔ ہم میں سے تقریباً ہر شخص کی زندگی میں ایک موقع ایسا آ
خاطر بڑی بڑی کڑیاں جھیلتے ہیں لیکن اُس زمانے میں ہمیں رنج و کا
اُن ساعتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ اس
آج بھی بالکل اسی طرح سچی ہے۔ تقریباً ہر شخص کو اٹیلانٹا

فریبِ ہستی

مخلوقِ خدا جہاں کہیں ہے — اک ہستئ نیستی قریں ہے

انجم، قمر، آفتاب، افلاک — جلوہ اِن سب کا بایقیں ہے

لیکن یہ یقیں بطورِ اذعان — بے حجّت و بے چناں چنیں ہے

سُن سُن کے جمالیا ہے دل میں — تحقیق کا کون خوشہ چیں ہے

سازیوں میں — اک خواب و خیال جاگزیں ہے

کس — دھوکے میں نگاہِ خوردہ بیں ہے

بدولت — غائب یہ گمانِ حاضریں ہے

باقی ہے — متوالے کو کہتے ہیں، ذہیں ہے

ے — مِٹھا، کھٹّے کا جانشیں ہے

ن — بہرا دنیا میں بحرِ دیں ہے

ری — کھویا وہ، جو ملکِ تہ نشیں ہے

رنگِ برعکس ہر کہیں ہے

دو دن کی نمائشِ زمیں ہے

اچھی یہ دل لگی نہیں ہے

پھندا ہے، کمند ہے کہیں کا

یہ یار وہ مارِ آستیں ہے

زہرابِ بشکلِ انگبیں ہے

اک شعر جو وجد آفریں ہے

زیبِ ہستی

ہے!!

احسن مارہروی

ڈیمانسٹریشن

تمہید۔ منشی گوربرشاد رنگیں طبع آدمی ہیں۔ گانے بجانے کا شوق ہے، کھانے کھلانے کا شوق ہے، اور سیر تماشے
کا شوق ہے پر اُسی مناسبت سے کسبِ معاش کا شوق نہیں ہے۔ یوں وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں، بھلے آدمیوں کی طرح رہتے ہیں
اور ہیں بھی بھلے آدمی، مگر کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ عزم کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس میں
آناً فاناً قارون کا خزانہ مل جائے اور وہ ہمیشہ کے لئے معاش سے بے فکر ہو جائیں، بینک سے چھ ماہ کا سود چلا آئے، گھر میں
اور مزے سے پڑے رہیں کسی نے صلاح دی، ناٹک کمپنی کھولو۔ اُن کے دل میں بھی
دینی شروع کر دی کمپنی کا پراسپکٹس بنا، کئی مہینے اُس کے خوب چرچے رہے
کئے لیکن نہ حصے بکے اور نہ کمپنی کھڑی ہوئی۔ ہاں اسی دھن میں گوربرشا
کمپنی کے نذر کیا جائے لیکن یہ تو معلوم ہی تھا کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہو
کمپنی میں اس کا ڈراما نویس بھی ہوتا ہے اُسے یہ کب گوارا ہوگا کہ اُس کے ممالک
طرح طرح کے عیب نکالے گا، اور کمپنی کے مالک کو بدظن کر دے گا۔ ا
جائے کہ ڈراما نویس صاحب کی دال نہ گل سکے۔ پانچ آدمیوں کی ایک م
گیا، اور دوسرے دن پانچوں حضرات ناٹک کا معائنہ کرانے چلے۔ ناٹ
ناٹک کا ڈیمانسٹریشن کرانا طے ہوا تھا۔

یکایک بنود بہاری نے کہا، یار تانگے پر جانے میں
پر دس پانچ روپیہ کا منہ دیکھنا مناسب نہیں ہیں تو انگریزوں
کر کے باقی ایک آنہ میں روزگار کرتے ہیں۔ کہیں سے دو مو
رسک لال بولے، لیکن کرائے کے موٹر وا
بات سچی تھی بھیس سے ہی بھیک ملتی
سویرے اس کا نام لے لو تو دن بھر پانی نہ ملے —
داہ منہ دھو رکھئے۔ اُس کی گاڑیاں
ہے۔ اچھا تو کوہ صاحب کے پاس کیوں نہ چلیں

دے گا۔ڈرائیور نہیں ہے مرمت میں ہے گورپرشاد نے بے صبر ہو کر کہا "تم لوگوں نے تو مفت کی زحمت مول لے لی۔ تانگوں پر چلنے میں کیا حرج تھا۔

بنود بہاری نے پھڈکا رہنائی۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے اور معاملہ کو نپٹا لینا دوسری بات ہے۔آٹھ آنے صفحہ سنا دے گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے۔

امرناتھ نے فلسفیانہ انداز سے کہا "میں تو سمجھتا ہوں موٹر کے لئے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بالکل عبث ہے۔ تعریف تو جب ہے کہ پاؤں پاؤں چلیں۔اور وہاں ایسا رنگ جمائیں کہ موٹر سے بھی زیادہ شان رہے۔

بنود بہاری اچھل پڑے سبھی نے یہ تجویز پسند کی۔لوگ پاؤں پاؤں چلے۔وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہونگی، کس طرح تمہید باندھی جائیگی کس طرح نوٹ کا تخمینہ بلند ہوگا، کس طرح ڈراما نویس صاحب کو خوش کیا جائے گا۔ ان اہم مسائل پر باتیں ہوتی جاتی تھیں۔

بجے پہنچے۔وہاں کمپنی کے مالک، اُس کے ایکٹر، اور ڈراما نویس سب کے سب پہلے ہی سے

ئے گئے تھے علیک سلیک کے بعد رسک لعل نے سیٹھ جی (مالک کمپنی) سے کہا

ؤں آئے ہیں۔آج یہی صلاح ہوئی کہ حسن فطرت کا مزہ اٹھاتے چلیں۔منشی

ج گیرُوے کپڑے پہنے یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوتے یا کسی کوہستانی علاقہ میں

سے نہیں! جانے کہاں کہاں خاک چھانتے، چکر لگاتے، ان کے پیرو

ز جاکر تو موٹروں پر سوار ہوتے ہیں، اور آپ گلی گلی مارے مارے پھرتے

ہ کے کنارے۔ نورِ سحر کا سنگار دیکھتے ہیں۔

جاتا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اُس میں نہ جانے کیا ڈھونڈ

ہے۔ یہ حضرت یورپ میں ہوتے تو آج ان کے دروازے پر

پوچھتا ہوں، کیوں روتے ہو، تو اور روتے ہیں۔ منہ سے آواز

فریات قلب کا آئینہ ہے۔

نے آپ کو بھی شاعر بنا دیا۔

مجھے شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ آپ لوگ مجھے

ہر جگہ عنصر لطیف سے بنا ہوا ہے۔

مست رام ۔ آپ کے اس جملے پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں، آپ نے سنی، منشی رسک لعل شاعر کی عظمت! اس جملے کو یاد کر لیجئے۔ رٹ لیجئے

رسک ۔ کہاں تک یاد کریں بھائی؟ یہ تو صنائع و بدائع میں باتیں کرتے ہیں اور انکسار کا یہ عالم ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں

اہلِ کمال کے یہی اوصاف ہیں جس نے اپنے کو کچھ سمجھا وہ گیا۔ (سیٹھ جی سے) آپ تو خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے منشی جی نے اس ڈرامے میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے بشرامیں جو ایک قسم کی نازک مزاجی ہوتی ہے، وہ آپ کو چھو بھی نہیں گئی ۔ اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے کے لئے آپ نے کچھ نہیں تو ایک ہزار ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا ۔ واجد علی شاہ کو متعصب مورخوں نے کتنا بدنام کیا ہے ۔ یہ آپ مانتے ہی ہیں ۔ اُس دفترِ بےمعنی سے حقیقت کو ڈھونڈ نکالنا آپ ہی کا کام تھا ۔

نبود ۔ اسی غرض سے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے، اور وہاں کوئی چھ مہینے مٹیا برج

دستِ مبارک کا لکھا ہوا ایک ایسا نسخہ ہاتھ آگیا جس میں انہوں نے روزمرہ کے وا

بڑھیا ابھی تک موجود ہے ۔ چھ مہینے کی خوشامد کے بعد کہیں جا کر وہ

امرناتھ ۔ کتاب نہیں ہے جناب پارۂ جواہر ہے ۔

مست رام ۔ اُس وقت اُس کی حالت ردی تھی، گور پرشاد نے ا

سنے دل تھام لے ۔ ایک ایک فقرہ دل میں چبھ جائے ۔

امرناتھ ۔ دنیا کے سبھی مشہور ناٹک آپ نے چاٹ ڈالے، اور صد ہا کتا

نبود ۔ جبھی تو یہ ایجاد کیا ہے ۔

امرناتھ ۔ لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا ۔

ہوئے ۔ جہاں ایکٹر ہی اچھے نہ ہوں وہاں اپنا ڈراما کھلوانا ا

جواب نہیں رکھتے، اور ہمارے ڈراما نویس صاحب

مچا دے گا ۔

نبود ۔ ایک تو مصنف صاحب خود شیطان سے زیادہ مشہ

مست رام ۔ روز ہی تو کسی نہ کسی کمپنی کا آدمی سر پر

نبود ۔ بس ایک ہی کمپنی ہے جس کے تماشوں کے

کوڑی کے ہیں ۔ میں نے تو تماشا دیکھنا ہی چھوڑ دیا ۔

گور پرشاد ۔ ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ۔

سال کی مدت بھی کافی نہیں ۔ بلکہ حقیقت

امر۔ پانچ ہزار ہے یا دس، یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ پر رنگ خوب جم گیا۔
مست رام۔ مجھے تو کامل یقین ہے کہ وہ دس ہزار سے نیچے جا ہی نہیں سکتا۔ آپ لوگ واہ واہ کر رہے تھے، میں سیٹھ جی کے قیافہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ آج ہی کہتا پر شاید ڈرتا تھا کہ کہیں یہ لوگ نامنظور نہ کریں۔ اُس کے ہونٹوں پر تو ہنسی نہ تھی پر دل میں مگن ہو رہا تھا۔
گور پرشاد۔ میں نے سنا یا بھی تو جی توڑ کر۔
بنود۔ کیا کہنا ہے۔ سبھوں کی آنکھیں کھل گئیں۔
رسک۔ مجھے اُس کی خموشی سے ذرا شبہ ہوتا ہے۔
امر۔ آپ کے شبہ کا کیا کہنا، آپ کو تو خدا پر بھی شبہ ہے۔
مست رام۔ ڈراما نویس صاحب بھی بے حد محظوظ تھے۔ دس بارہ ہزار کا ا
گور پرشاد۔ پہلے کچھ مُنہی بٹہ ہو جانے دو۔
مست رام۔ جی نہیں، تب تو محفل نشاط ہو گی۔ آج صرف دعوت کی رہ
بنود۔ بھئی تم بڑے خوش نصیب ہو گور پرشاد!
رسک۔ میری رائے ہے کہ ذرا اس ڈراما نویس کو گانٹھ لیا جائے۔
مست رام۔ آپ تو واہی ہوئے ہیں۔ وہ حضرت ناک رگڑ کر رہ جائیں اس طلسم سے نہیں نکل سکتے۔
بنود۔ تمہید کتنی زوردار تھی؟
امر۔ اسی نے تو رنگ جما دیا اب کوئی معمولی رقم پیش کرے،

تماشا

رات کو گور پرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت:
شام کا وقت ہوا خوری کا ہے۔ آج موٹر پر نہ آنے کے
مُحرّمی صورت تبدیل ہو گئی تھی۔ بات بات پر چہکتے
سامان تیار تھا، میزوں پر طشتریاں چنی جانے لگیں۔ منز
مہمان نوازی کے مجسمے بنے ہوئے ہر ایک مہما
قابل دعوت کا سامان یہاں کہاں میسّر!
احباب اسے فال نیک سمجھ کر جامے میں

کھانے کے بعد معاملے کی بات چیت ہونے لگی، گورپرشاد کا دل امید اور خوف سے کانپنے لگا۔

سیٹھ جی۔ حضور نے نہایت اعلیٰ درجے کا ناٹک لکھا ہے۔ کیا بات ہے!

ڈراما نویس۔ یہاں خلقت اچھے ڈراموں کی قدر نہیں کرتی۔ ورنہ یہ ڈراما لاجواب ہوتا۔

سیٹھ جی۔ خلقت قدر نہیں کرتی، نہ کرے۔ ہمیں خلقت کی بالکل پروا نہیں ہیں تو اس تماشے کی تیاری میں محض بابو صاحب کی خاطر پچاس ہزار روپیہ صرف کردوں گا۔ آپ نے اتنی کاوش سے ایک چیز لکھی ہے تو میں اس کی تبلیغ بھی اتنے ہی حوصلے سے کروں گا۔ ہماری زبان کے لئے کیا یہ کم خوش نصیبی کی بات ہے کہ آپ جیسے اہلِ کمال اس کی خدمت کریں تصنیف

اسا ڈراما آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں، اور اصحاب بھی لکھتے ہیں لیکن آپ
نے شکسپئر کو بھی مات کردیا ہے۔

یسی ہی لاثانی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیکسپئر نے جو کچھ لکھا روپے کے لئے لکھا
ہیں وہ بات کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو غرض سے پاک اہلِ کمال کا حصہ
ہے۔ اسی لئے کہ وہ روحانیت کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے۔ سعدی کی
ی لئے زندہ ہیں کہ اُن باکمالوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جسے
ـ ایک لفظ ایک ایک فقرے، ایک ایک بندش پر مہینوں صرف کرسکتا
یز جلدی سے ختم کرکے دوسری چیز شروع کردیں۔
کی محض اسی لئے ناقدری ہورہی ہے کہ ہم سب یا تو دولت کے لئے

ئیے۔ لاکھوں روپے کلاؤنتوں اور گاتکوں کی نذر کردیئے کہاں
ہنچا یا اس جانفشانی اور لگن کا صلہ کون دے سکتا ہے۔
ان کی ناقدری ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ ہے
ے ٹپک رہی ہے۔
انی مسرت ہے۔ شہرت تو اکثر ایسی چیزوں کو بھی مل جاتی
ہی اس کے پارٹ تقسیم کردیجئے۔ تین ہفتے کے اندر

ے اُٹھا لیا۔ گورپرشاد نے بے کسانہ نگاہوں سے

بنود کی طرف دیکھا۔ بنود نے امر کی طرف، امر نے رسک کی طرف، لیکن کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ سیٹھ جی نے گویا ہر ایک زبان پر مہر سکوت لگادی تھی۔ ڈراما نویس صاحب کتاب لے کر رخصت ہو گئے

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا "حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی۔ ڈرامے کا ریہرسل شروع ہوتے ہی آپ کو کچھ عرصے تک کمپنی کی مہمانی قبول کرنی پڑے گی۔ ہمارے ایکٹر زیادہ تر گجراتی ہیں اور وہ الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے۔ آپ کی نگرانی میں اُن کی ساری خامیاں دور ہو جائیں گی۔ ایکٹروں نے اگر پارٹ اچھے نہ کئے تو آپ کی ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔ بولئے! آپ لوگوں کے لئے سگار لاؤ۔

سگار آگیا۔ سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ احباب کو رخصتی کی دعوت تھی۔ پانچوں [illegible] سیٹھ جی آگے آگے دروازے تک آئے۔ پھر سب سے ہاتھ ملا کر کہا، آج آپ سب بخشیں۔ پھر یہ موقعہ نہ جانے کب ہاتھ آئے۔

گورپرشاد نے گویا کسی قبر کے نیچے سے کہا "ممکن ہوا تو آجائیں"

سڑک پر آکر پانچوں احباب ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔

بنود نے کہا "یہ تو ہم سب کا گرو گھنٹال نکلا۔

امر۔ صاف آنکھوں میں دھول جھونک دی۔

رسک۔ میں اُس کی خموشی سے پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ کوئی پتلے سر۔

مست رام۔ مان گیا اس کی کھوپڑی کو۔ یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی۔

گورپرشاد اس گفتگو میں شریک نہ ہوئے۔ وہ اس طرح ... کو سمجھ ہی نہ پائے ہوں۔

لڑکا (دکاندار سے) اگر میں آپ سے دو آنے کے پیسے بنے؟

دکاندار۔ ایک روپیہ۔

لڑکا۔ شکریہ۔ یہ سوال مجھے استاد۔

غزل

نالۂ دلخراش میں آہِ جگر گداز میں — کون ستم طراز ہے پردۂ سوز و ساز میں!

سکے حریم ناز میں — پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

دی سکھا — یا نہ کسی کو ساتھ لے اُس کے حریم ناز میں

باں — فردِ عمل تو چاہیئے دستِ کرشمہ ساز میں

ے — باغ و بہار بن گیا آئنہ دستِ ناز میں

ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں

ایک ادائے ناز ہے بے خودیٔ نیاز میں

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

نوحۂ سوز و غم نہیں میری شکستِ ساز میں

شناس ہے

جہانِ راز میں

اصغر گونڈوی

ہندوستان میں عورت کی موجودہ حالت

اسے ہندوستان کی بدقسمتی کہئے یا مردوں کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ کہ ملک کی آبادی کا نصف سے زائد حصہ آج تک ذلت اور جہالت کی تاریکیوں میں گھرا رہا۔ اور وہ فرقہ جس کی ترقی پر ملک کی ترقی کا حقیقی دارومدار تھا مدتوں تک پرانے تعصبات روایات اور رسم ورواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا۔

اگرچہ گزشتہ دس سال کے اندر ہندوستان میں عورتوں کی تعلیمی اور معاشر
ہیں لیکن یہ امر واقعی ہے کہ اس وقت بھی اکثر گھرانوں میں ہندوستانی عورت ک
ہے جس کے سننے اور بیان کرنے سے دل خون کے آنسو روتا ہے۔

عورت کی زندگی کے جن خاص پہلوؤں پر ہم اس مضمون میں
(۱) تعلیمی ترقی (۲) معاشری حالت (۳) حفظ صحت (۴) دیہا

تعلیم نسواں:۔ سب سے اول تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس میں
محسوس کرتا ہے لیکن اس ضمن میں جو ترقی ہونی چاہئے تھی وہ اب تک
تک بھی بہت تفاوت ہے جو بجائے کم ہونے کے روز بروز

سرکاری تعلیمی کمشن کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۹
صدی سے زیادہ نہ تھی۔ سکول جانے والے بچوں میں پرائمر
مڈل کی جماعتوں میں آٹھ گنا ہے۔ اور ہائی کلاسوں میں چونت
تعلیم پا رہے ہیں۔ اس تفاوت کے اسباب ظاہر ہیں۔ ا
خیال کیا جاتا ہے۔ دُوسرے لڑکیوں کی تعلیمی ترقی
کسی قدر زیادہ خرچ آتا ہے۔

سب سے بڑی رکاوٹ تو اس معاملے میں م
مشہور نظم چپ کی داد میں نہایت خوبی سے بیا

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرز

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق — تعلیم پاکر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں
یاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ — تم کو بھی دنیا کی کہن کا آ گیا آخر یقیں
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم — سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں

مقام شکر ہے کہ اب حالات بدل رہے ہیں اور مختلف شعبہ جات کی کوششوں سے جن میں نسوانی شعبہ جاتِ تعلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم روز بروز ترقی کر رہی ہے ۔

تعلیم نسواں کے راستہ میں دوسری رکاوٹ کم سنی کی شادی ہے جس کا رواج کم و بیش ملک کے سب حصوں میں پایا جاتا ہے ...
، (Age) کمیٹی کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ دس اور پندرہ برس کی عمر کے درمیان
تی ہے ۔ ایک ہزار میں سے ۱۱ لڑکیاں پانچ برس سے کم عمر میں بیاہی جاتی ہیں
میاں بیوی کہلاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں شادی کی عمر اتنی کم ہو وہاں
ئی تعجب کی بات نہیں ۔ اول تو سکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد ہی
ن میں سے اکثر اپنے نصابِ تعلیم کے ابتدائی مدارج بھی طے نہیں کر سکتیں
پے کی ہے ۔ تعلیمی رپورٹوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زنانہ
بلے میں زیادہ خرچ آتا ہے ۔ پرائمری سکولوں میں ایک لڑکے کی تعلیم
میں لڑکی کا گیارہ روپے سالانہ ہے ۔
ستانیوں کی کمی ہے ۔ اس کمی کے متعدد اسباب ہیں ۔ اول تو مختلف
لئے عام طور پر بہت موزوں خیال نہیں کیا جاتا اس لئے بہت کم
بعض اور پابندیوں کی وجہ سے وہ اپنے گھر اور شہر سے باہر نوکری
کرنے میں سب سے بڑی مشکل یہی پیش آتی ہے کہ اول تو وہاں
ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زنانہ سکول پر مردانہ سکول کے
ات میں آباد ہے لہذا وہاں کافی سکول نہ ہونے کی
۔ استانیوں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان
س بحث ۱۹۲۷ء تک سارے ملک میں کل سات زنانہ
اور ایک صوبجات متحدہ میں تھا ۔ ان کالجوں
ہندو اور دو مسلمان تھیں ۔ اسی طرح ٹریننگ
کی کمی ہے ۔ مدراس کے پرائمری سکولوں

میں ایک اُستانی کی اوسط تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار ہے۔ بنگال میں آٹھ روپیہ ماہوار۔ یو۔پی میں اٹھارہ روپیہ پنجاب میں پچیس روپیہ اور بہار میں گیارہ روپیہ ماہوار ہے۔ گویا ایک زنانہ پرائمری سکول کی ہیڈ معلمہ ایک آیا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معلمگری کا پیشہ ایک معزز اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی کے لئے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ بالخصوص جب کہ اُسے اپنے گھر سے باہر کہیں دور دراز مقام میں جاکر رہنا پڑے جہاں عموماً نہ اُس کا کوئی رشتہ دار ہوتا ہے اور نہ مددگار۔

منجملہ اور مشکلات کے جو لڑکیوں کی تعلیم کے راستہ میں حائل ہیں ایک مشکل ہمارا مروجہ پردہ بھی ہے اگرچہ اب تک مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پردہ کے اندر ہوتی رہی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ سکول جانے والی مسلمان لڑکیوں کی تعداد دوسرے مذاہب کی لڑکیوں سے مقابلتہً بہت کم ہے جس کا ذمہ دار بڑی حد تک ہمارا موجودہ پردہ ہے۔

تعلیمی ترقی کے راستہ میں ہندوستان میں اور بھی بہت سی مشکلات ہیں جن
شامل ہیں۔ ایک گاؤں میں جہاں مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ آباد ہوں وہاں اوا
کی جاتی ہے لیکن اگر سکول علیحدہ علیحدہ نہ ہوں تو کم از کم دو تین مختلف زبانوں کی تعـ
صرف احاطہ بمبئی میں اس وقت ساٹھ مختلف زبانیں موجود ہیں جن کی تعلیم سکولوا
غربت بہت ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان سکولوں کا خرچ برداشت نہ
وہاں دو تین سکولوں کا قیام ضروری سمجھا جائے۔ لہذا ایک طرف تو بچے تعا
اُن کی ابتدائی تعلیم پر اتنا خرچ آتا ہے جو ہندوستان جیسے غریب ملک

ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ پہلی سے دوسری اور دوسری ۔
ہے یہاں تک کہ چوتھی جماعت تک فی سکول اوسطاً صرف ۲ لڑکیاں ر
سکول ملا کر ایک پڑھی لکھی لڑکی کا اوسط نکلتا ہے۔ پنجاب میں جو بلحاظ تعلـ
ابتدائی جماعتوں میں چار لڑکیوں میں سے تین لڑکیاں دوسری
سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم
لڑکیوں کے لئے جو سکول قصبات میں قائم کئے
کی عمارات ردی اور خراب و خستہ حالت میں ہوتی ہیں۔ ایک
کہ جو مکان لڑکوں کے سکول کے لئے ناموزوں
بات نہیں ہے جس ملک میں بہن اپنے بھائی کا جھوٹا
کے لئے اس قسم کا انتظام کیا جانا کون سی اچنبھے کی
اکثر دیہاتی اور شہری سکولوں کی یہ حالت ہے کہ ایک تنگ

چٹائیوں پر بہت سی لڑکیاں کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک اُستانی دبک کر بیٹھ جاتی ہے جہاں اُسے حرکت کرنے کے لئے بھی مشکل سے جگہ ملتی ہے۔ سردیوں میں نمی اسیل، اور گرمیوں میں حبس کے مارے ان کمروں میں کھڑا ہونے کو دل نہیں چاہتا لیکن یہ ننھی ننھی بچیاں جنہیں شب و روز قدرت کی کھلی فضا میں سانس لینا چاہئے ان قید خانوں میں مجرموں کی طرح بند رہتی ہیں۔

ان سکولوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ انسپکٹرسوں کی تعداد میں خاص اضافہ کیا جائے۔ اس وقت جو انسپکٹرسیں موجود ہیں ان میں سے اکثر کو آٹھ دس ہزار میل کی طویل مسافت طے کرنی پڑتی ہے جو بہت زیادہ ور دور دراز قصبات کا دورہ کرنا پڑتا ہے اور راستہ میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا

ہیں اُن کے لئے ان انسپکٹرسوں کی موجودگی بہت تسلی اور تسکین کا باعث ہوتی
سر خود نہیں جاسکتے اس لئے وہاں انسپکٹرسوں کا اکثر جانا اور بھی زیادہ ضروری
مانا چاہئے۔ جو گاہے گاہے جاکر ان سکولوں کا معائنہ کریں اور جو امور اصلاح
کے اُن کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ت ملک میں مختلف رائیں ہیں۔ اکثر شعبہ جات اس کے خلاف ہیں
غیر ضروری ہے کیونکہ ابھی اس کے حصول میں بہت سی مشکلات
ہے کہ جب موجودہ زنانہ سکولوں کے لئے سند یافتہ استانیاں کافی تعداد
جو تعداد ضروری ہے وہ کہاں سے آئے گی۔ اس وقت پانچ صوبوں
رف دو صوبوں یعنی مدراس اور بمبئی میں اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے
وہ صحیح نصاب تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ سب محکمہ جات تعلیم اب اس بات
ہے جو اُن کو بجائے پڑھی لکھی فیشن کی گڑیا بنانے کے صحیح معنوں
نڈیا وومنز کانفرنس اس بارہ میں بہت سا مفید کام کر رہی ہے
تین قسم کے محکمے کام کرتے رہے ہیں۔ (۱) مشن۔
کام کا بیشتر حصہ مشنری کام کرنے والوں کی سرگرمیوں
ثر تعداد میں موجود ہیں۔

ری ہیں۔ ان تینوں کالجوں میں لڑکیوں کی ایک
وں کے پیش پیش رہا ہے اور اب بھی جہاں تک

اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے صوبۂ مدراس دوسرں صوبوں پر فوقیت رکھتا ہے ۔

بمبئی میں بھی لڑکیوں کی تعلیم بہت اچھے پیمانے پر ہو رہی ہے بمبئی کو یہ فخر حاصل ہے کہ بخلاف دوسرے صوبوں کے وہاں کی علمی اور معاشرتی سرگرمیوں میں زیادہ تر حصہ خود ہندوستانی سوسائٹیوں کا ہے ۔ پونا کی سیوا سدن سوسائٹی ۔ ہندوستانی عورتوں کا دارالعلوم ۔ اور بمبئی کی وڈنا داشرم سوسائٹی ان سرگرمیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں ۔ ہندوستانی شعبہ جات تعلیم نے جو سکول لڑکیوں کے لئے قائم کئے تھے ان میں سب سے زیادہ حصہ بمبئی کا تھا ۔ ۱۹۱۳ء میں بمبئی میں دس ہائی سکول موجود تھے ۔ بنگال میں دو تھے اور باقی صوبوں میں کوئی نہ تھا ۔ اس ساری ترقی کی ذمہ دار زیادہ تر پارسی قوم ہے اور یہ پارسیوں ہی کی سرگرمیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بمبئی میں عورتوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لئے بہت سے شعبہ جات قائم ہیں ۔ لڑکیوں کی جبری پرائمری تعلیم کو بھی بمبئی میں بہت فروغ حاصل ہوا ہے ۔

بنگال میں چھیانوے فی صدی لڑکیاں پرائمری تعلیم کے درجے تک رہ جاتی
لڑکیوں میں سے صرف ایک لڑکی پرائمری کے درجے کے بعد تعلیم پاتی ہے ۔ گو
کی پرورش گاہیں بن جاتے ہیں ۔ جو لڑکیاں ہائی سکولوں یا کالجوں میں تعلیم
حاصل کرنا ہوتا ہے چنانچہ بنگال میں آج تک کوئی ایسا طریقہ رائج نہیں ہو
کالج ہیں جن سے ایک کثیر تعداد لڑکیوں کی ہر سال گریجویٹ بن کر نکلتی ۔
میں متعدد ہائی سکول ایک سکول بیواؤں کے لئے اور چند صنعتی سکول
لیکن یہ امر واقعی ہے کہ بنگال میں لڑکیوں کی تعلیم صحیح طریقوں پر نہیں ہو
سی باتیں اصلاح طلب ہیں ۔

تعلیم نسوان کے معاملے میں صوبۂ پنجاب ایک خاص اہمیت
کی تعلیم بہت دیر سے شروع ہوئی مگر بمصداق دیر آید درست آ
ترقی کی ہے ۔ لاہور میں اس وقت تین زنانہ کالج اعلیٰ پیمانہ پر چل ر
ہر سال کئی لڑکیاں داخلے سے محروم رہ جاتی ہیں علاوہ ان کالجو
پرائمری سکول کھلے ہوئے ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں
ہیں ۔ ان شعبہ جات کے علاوہ جو سرکاری محکمۂ تعلیم کے زیر اہتما
جن میں سے بعض گورنمنٹ سے امداد حاصل کرتے ہیں اور بعض
کنیا مہاودیالہ جالندھر سرگنگارام کا ہندو بدھوا آشرم اور صنعتی
ماتحت ایک زنانہ یتیم خانہ اور کئی زنانہ سکول قائم ہیں جن میں

نسوانی مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

صوبجات متحدہ میں لڑکیوں کی تعلیم نے مقابلۃً بہت کم ترقی کی ہے۔ صرف ایک فی صدی لڑکیاں سکول میں تعلیم پاتی ہیں اور ان میں سے اکثر پرائمری کے درجہ تک رہ جاتی ہیں لکھنؤ میں صرف ایک زنانہ کالج اور چند سکول ہیں علی گڑھ میں ایک مسلم گرلز سکول اور کالج بہت اعلیٰ پیمانہ پر چل رہا ہے صوبۂ سی پی۔ بہار اور آسام تعلیم میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ان صوبوں میں لڑکیوں کے لئے کوئی کالج نہیں صرف چند ہائی مڈل اور پرائمری سکول موجود ہیں لیکن اُن میں بھی طالبات کی تعداد بہت کم ہے۔

اس سارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم اب ہر جگہ ترقی کر رہی ہے اگرچہ اُس کی رفتار بہت سست ہے اور بمقابلہ تعلیم
ماؤ... [illegible] تعلیم یافتہ عورتوں کی بہت کمی ہے تاہم مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اب خود عورتوں میں اپنی
...بات پر آمادہ نظر آتی ہیں کہ اپنے مردوں کے دوش بدوش میدان ترقی میں اپنی جگہ آپ تلاش کریں گی
...ورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ہر سال پچاس لاکھ آدمی ایسی ملک
...ہیں جن کا انسداد ہو سکتا ہے اور جو حفظ صحت کے اصولوں پر کاربند نہ ہونے کا نتیجہ ہوتی
...نی اور ناقص غذا ملنے کی وجہ سے اپنی صحت اور طاقت کھو بیٹھتے ہیں پچاس فی
...ما ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی متعدی اور مہلک بیماریاں مثلاً پلیگ ہیضہ چیچک اور پیچش پھیل
...یا جاتا بہت سی اموات کا باعث ہوتا ہے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں صرف بنگال میں ملیریا
...ہ ہے کہ ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں صفائی کا انتظام بہت
...بازار اور گلیوں میں غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں
...ہوتا ہے۔ جہاں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر ہر قسم کی غلیظ اشیا پھینکی
...لکا غیر محفوظ اور طرح طرح کی بیماریوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ ان حالات
...نا اس سے بہت بدتر ہے چونکہ اُن کے وقت کا زیادہ تر حصہ گھروں
...ہیں جو ایک کام کرنے والے مرد کو باہر جانے سے نصیب ہوتی ہے۔
...اور اکثر کمزور عورتیں ان ذمہ داریوں اور جسمانی تکالیف کی تاب
...ر دوسرے مہلک امراض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ طبی معائنہ
...میسر نہیں ہوتی ہڈیوں کا ایک خاص مرض ہو جاتا ہے
...ہ کے لئے بچہ کی پیدائش عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے
...ر جاہل دائیاں بھی ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ صفائی اور
...ہی وجہ سے اکثر عورتیں زچگی کے زمانے ہی میں

موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اکثر ہندو گھرانوں میں عورت اس زمانے
جگہ دی جاتی ہے جہاں تازہ ہوا اور روشنی کا گذر تک نہیں ہوتا۔
کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عورت
طرح وہ گھر کا ننھا سا مہمان بھی جو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے
زچہ اور بچہ دونوں کمزور اور بیمار رہتے ہیں۔ ان غفلتوں کا نتیجہ
ہندوستان میں ان امراض میں داخل ہو گئی ہے جو سرسا
کئے مریض چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کی خرا
کمیٹی نے ایک جگہ اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ کم
بچوں کی قبل از وقت موت کا سب سے بڑا سبب
مریض بنا دیتی ہے اگر سب واقعات پر غور کیا جائے تو یہ رسم
لئے ایک وحشت ناک سماں پیدا کرتے تھے۔ مگر اول تو
کم از کم یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ مرنے کے بعد وہ ایک جا
ایک کم سن بیوی کو عمر بھر طرح طرح کی روحانی اور جسمانی تکالیف
ایک لیڈی ڈاکٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایک بائیس
متواتر جسمانی تکالیف اور روحانی کلفتوں سے وہ ایک سایہ
اس واقعہ کے دو ماہ بعد وہ بغیر کسی خاص بیماری کے مر
رہ چکی ہیں ایچ آف کانسنٹ کمیٹی کے سامنے
ہو چکے تھے۔ آخر ایک دن انہی مصیبتوں میں وہ
کروں جو بحیثیت ایک لیڈی ڈاکٹر کے میری نظر
اگرچہ قانون ایسی بے جا کارروائیوں کی اجازت نہیں
والدین اپنے نام و ناموس کی خاطر ایسے واقعات کو ہمیشہ
سینکڑوں بیکس بچیاں اس قبیح رسم کے بھینٹ چڑھ
ہندوستان میں حفظ صحت کے لئے جو
اُن پر عموماً کاربند نہیں ہوتے اور اکثر لوگ
لیکن کچھ عرصہ سے گورنمنٹ نے اس معاملہ

یر کے متعلق ہر قسم کے مفید قوانین وضع کرنے شروع کئے ہیں
کئے ہیں ۱۹۲۷ء تک ہندوستان میں کل ۲۲۴۴ ہسپتال اور
ہسپتال موجود تھا عورتوں کے لئے اوّل اوّل کوئی علیحدہ
ہ ہذا اُن میں سے اکثر طبی امداد نہ ملنے کے باعث طرح
طوں نے آکر کام شروع کیا۔ اُن کے تجربات ظاہر کرتے ہیں
بریلی میں پہلا زنانہ ہسپتال امریکن مشن کے زیر
کونٹس آف ڈفرن فنڈ کی بنیاد ڈالی گئی جس
۱۹۰۰ء میں وکٹوریا میموریل فنڈ کھولا گیا جس کا
۱۹۱۸ء میں لیڈی چیمسفورڈ لیگ زچہ اور
حت کی تعلیم کے لئے سکول اور بچوں اور ماؤں کی

ں صرف مشن کے ماتحت کام کر رہی ہیں باقی جگہ جگہ
ملران میں سے اکثر روپے کی کمی کی وجہ سے اچھی حالت میں
توں نے بہت مفید حصہ لیا ہے۔ اور اب بھی لے رہی ہیں
دوستانی عورتوں کے لئے لیڈی ڈاکٹر کا پیشہ بھی دوسرے
کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو اپنی لڑکیوں کو کسی
تے ہیں۔
ہارڈنگ کالج دہلی) موجود ہے جس میں لڑکیوں کو
ے۔ ان سب میں کل چھ سو پچاس طالبات تعلیم

ا نہیں کیا جاتا تھا لہذا بہت کم ہندوستانی لڑکیاں
لڑکیوں کی ہے۔
اسٹوں کی بہت ضرورت ہے جو قصبات میں جا کر غریب
کی جماعتیں کھولی گئی ہیں جہاں عام عورتوں
لے جدید طریقوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اصلاحِ معاشرت۔ ہندوستانی عورت کو ذلت اور غلامی کی زنجیروں سے رہا کرنے اور اس کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اُن معاشری خرابیوں کا پورے طور پر انسداد کیا جائے جو اب تک اس ملک میں موجود ہیں اور جو ہماری روزانہ زندگی ہماری قومیت اور ہمارے مذہب کا جزو بن کر ہمیں تباہ و برباد کررہی ہیں۔ جس ملک میں لڑکی کی پیدائش ایک بہت بڑا منحوس واقعہ خیال کی جاتی ہو۔ جس میں ننھی ننھی بچیاں ہوش سنبھالنے سے پہلے شادی کے بھینٹ چڑھائی جاتی ہوں جس میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لائی جاتی ہو جس میں خاوند کی موت کا باعث غریب بیوہ کو قرار دیا جاتا ہو جس میں زندہ بیوی کو مردہ خاوند کے ساتھ دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنایا جا چکا ہو وہ ملک دنیا کی نظروں میں ذلیل نہ ہو تو کیا ہو۔ شکر ہے کہ اب حالات روز بروز بہتر ہو رہے ہیں اور ہندوستان اپنے ماضی سے نادم ہو کر اپنے حال اور اپنے مستقبل کو زیادہ شاندار بنانے کی کوشش کر رہا ہے خدا اس کا مددگار ہو۔ منجملہ ان خرابیوں کے جو اس ملک میں اب تک موجود ہیں ایک بڑی خرابی بچپن کی شادی ہے جس کے برے اثرات نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہیں۔ دوسری خرابی جس میں اصلاح کی بہت ضرورت ہے، اس ملک میں بیواؤں کی حالتِ زار ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں کل ۲۶۸۳۴۸۳۸ بیوائیں تھیں جن میں ۵۱۳۹ ایک برس کی عمر سے کم تھیں اور ۳۹۶۵۵۶ پندرہ برس سے کم عمر کی تھیں۔ چونکہ اس ملک میں نکاحِ ثانی ایک گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا ہے لہذا یہ ننھی ننھی جانیں جو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شادی کے بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں عمر بھر بیوگی کی مصیبت جھیلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اول کم سنی کی شادی دوسرے بیوگی کا رنج والم۔ تیسرے وہ ہولناک مصیبتیں جو ایک ہندوستانی عورت کو خاوند کے بغیر جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ سب مل کر عورت کی زندگی کو فی الحقیقت جہنم بنا دیتی ہیں۔ بقول مولانا حالی علیہ الرحمۃ

بیاہی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں — جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانوں اس طرح — جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گذری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ — بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا

پنڈتانی رام بائی لکھتی ہیں کہ پرانے ہندو گھرانوں میں بیوہ کی زندگی ایک حسرتناک منظر پیش کرتی ہے۔ اکثر گھرانوں میں وہ ایک مجرم کی طرح سمجھی جاتی ہے جو کسی بھاری گناہ کی پاداش میں ایک سخت سزا جھیلنے پر مجبور ہو۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت کم سن بیوہ کی ہوتی ہے۔ چونکہ عموماً اس کے کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے اُسے سوسائٹی اور کنبہ کے لوگ بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور گھر میں اس سے مثل لونڈی غلاموں کے کام لیا جاتا ہے۔ بیوہ عورت کے لئے کپڑا پہننا اور کھانا کھانا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے بجز اس مقدار کے جو اس کی مصیبت زدہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو چنانچہ اکثر بیوہ عورتیں کرتہ نہیں پہنتیں اور ایک وقت کا کھانا کھاتی ہیں بعض سر کے بال منڈا دیتی ہیں اور عمر بھر زمین پر سوتی ہیں۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بیوہ عورت کی زندگی کیسی کیسی کلفتوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اکثر عورتیں اس درد بھری زندگی پر رسم ستی کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگرچہ آنکھوں دیکھتے ہوئے آگ کے شعلوں میں

کودنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر یہ زندگی بھر جلنا اور جل جل کر مرنا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہے۔"

ایک اور رسم جو اصلاح طلب ہے ہمارا مروجہ پردہ ہے۔ پردہ اپنی موجودہ صورت میں دراصل کسی مذہب یا ملت کے عقائد کا حصہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں اس شدت سے اس کا رواج پایا جاتا ہے لیکن ملک ہند کی سرزمین جس طرح اور مذموم رسموں کی نشوونما کا باعث ہوئی ہے اسی طرح اس رسم کو بھی یہاں بہت فروغ حاصل ہوا ہے اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سختی کے ساتھ پردے کی پابندی عورتوں کی تعلیمی، جسمانی اور معاشرتی ترقی کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اور منجملہ اور وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مسلمان عورتیں ترقی کے ہر شعبہ میں اپنی ہمسایہ اقوام کی بہنوں کے مقابلہ میں کوسوں دور ہیں۔

عورت کی صحت پر پردہ دار زندگی کا جو برا اثر پڑتا ہے اس کی حقیقت اس بیان سے جو ڈاکٹر لینکسٹر نے مرض دق کے متعلق تفتیش کرتے ہوئے دیا تھا ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں تپِ دق کے مریضوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے دگنی تھی۔ کلکتہ میں مسلمان عورتوں کی شرح اموات ساڑھے پانچ فی صدی تھی اور باقی عورتوں کی تین فیصدی۔

عورتوں کی تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے جو انجمنیں اب تک ہندوستان میں قائم ہوئی ہیں اُن کا مختصر سا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اُن کی رپورٹوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں میں اب اپنی ترقی اور اصلاح کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔

سب سے اول ۱۹۱۷ء میں مدراس میں عورتوں کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی گئی جس کا مقصد عورتوں کی تعلیمی ترقی اور اُن کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ اس وقت اس ایسوسی ایشن کی ستر شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہیں ۱۹۲۵ء میں مدراس میں نیشنل کونسل آف ومن کی بنیاد ڈالی گئی جس کا مقصد ہر مذہب و ملت کی عورتوں میں باہم اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا اور ان کی تعلیمی اور معاشرتی حالت کا سنوارنا تھا۔ اس وقت پانچ صوبوں میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بنگال مدراس اور پنجاب میں ایسی انجمنیں قائم کی گئیں جن کے ماتحت عمر رسیدہ عورتوں کے لئے جگہ جگہ درس گاہیں کھولی گئیں۔ عورتوں کی تعلیمی تحریکات کی سب سے نمایاں کامیابی آل انڈیا ومنز کانفرنس کا قیام تھا جو ۱۹۲۷ء میں معرض ظہور میں آئی۔ اس کانفرنس کے چار اجلاس اب تک ملک کے مختلف حصوں میں ہو چکے ہیں۔ اس کانفرنس کا اولین مقصد عورتوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا اُن کے لئے حصولِ تعلیم کے وسائل مہیا کرنا اور عورتوں کی تعلیمی ترقی کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن کو دور کرنا تھا۔ مگر اپنے کام کے ابتدائی زمانہ میں ہی کانفرنس نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ اس ملک میں کوئی تعلیمی یا دوسری تحریک اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کی معاشرتی حالت کو درست نہ کیا جائے۔ اور ان خراب رسوم کی اصلاح نہ کی جائے جو اندر ہی اندر اس ملک کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ چنانچہ کانفرنس کے مقاصد میں اصلاحِ معاشرت کو خاص جگہ دی گئی اور اس غرض کے لئے ملک کے مختلف

حصوں میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اس وقت کانفرنس کی پینتیس ساخیں مختلف صوبوں میں قائم ہو چکی ہیں جو اپنی اپنی جگہ بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ اس کانفرنس کے ماتحت دہلی میں ایک آل انڈیا تعلیمی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس میں اس وقت چار لاکھ سے زائد روپیہ موجود ہے (اس میں دو لاکھ کی گرانقدر رقم ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام حیدر آباد دکن کا عطیہ ہے) تجویز ہے کہ اس فنڈ کے سرمایہ سے دہلی میں ایک زنانہ ٹریننگ کالج بڑے وسیع پیمانے پر کھولا جائے جس میں لڑکیوں کو جدید طریقوں کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اور اُن کے لئے ایک جداگانہ نصابِ تعلیم مرتب کر کے اُن کو خانہ داری حفظ صحت بچوں کے رکھ رکھاؤ، فنونِ لطیفہ مثل موسیقی تصویر کشی اور دیگر نسوانی مضامین کی تعلیم سے بہرہ اندوز کیا جائے۔ اور موجودہ نصاب کی وجہ سے جو نقائص اُن کی تعلیم میں پیدا ہو گئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ کانفرنس کے اغراض و مقاصد میں حسب ذیل امور پر خاص زور دیا گیا ہے۔ لڑکیوں کے لئے پرائمری اور اعلیٰ تعلیم کے وسائل مہیا کرنا، تعلیمی کمیٹیوں اور بورڈوں میں عورتوں کا تقرر۔

اصلاحی حصہ میں مفصلہ ذیل امور پر زور دیا گیا ہے۔ کم سنی کی شادی کی بیخ کنی، نکاح بیوگان کی تحریک اور اُن کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے تجاویز، تعدد ازواج کی مخالفت، عورت کے مالی و سیاسی حقوق کی حفاظت، عورت اور مرد کے لئے ایک مساوی معیار اخلاق کا قائم کرنا، لیجسلیٹو کونسلوں، صوبجاتی کونسلوں اور دوسری تعلیمی اور اصلاحی کمیٹیوں میں عورتوں کے تقرر کی ضرورت۔

اس کانفرنس کے قیام سے ملک میں عام طور پر ایک بیداری پیدا ہو گئی ہے اور نسوانی ترقی کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ علاوہ ان انجمنوں کے ملک میں اور بھی بہت سی انجمنیں، کانفرنسیں اور ادارات قائم ہیں جو اپنی اپنی جگہ مفید تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ ومنز انسٹی ٹیوٹ بنگال (جس کی بانی مسز جی۔ ایس دت صاحبہ تھیں) سیوا سدن سوسائٹی پونا۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس۔ انجمن صلیب احمر۔ سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن۔ بنگال میں مس بوس کے سکول اور صحت گاہیں۔ آل انڈیا سوشل کانفرنس اور بہت سی اور چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور قومی سوسائٹیاں ہر صوبے اور ہر شہر میں موجود ہیں۔

. . . .

عورت اور دیہاتی زندگی۔ ہندوستان کی آبادی کا تین چوتھائی سے زائد حصہ (۸۶ فیصدی) دیہات میں آباد ہے دیہاتی عورت کی زندگی سادگی اور محنت و مشقت کا نمونہ ہوتی ہے۔ اپنے خاص نسوانی فرائض ادا کرنے کے علاوہ ایک دیہاتی عورت کو مرد کے کاروبار میں بہت حصہ لینا پڑتا ہے۔ پنجاب کے قصبات میں جاٹ اور زمیندار عورتیں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ بنگال کے گاؤں میں عورتیں مردوں کے ساتھ غلہ بونے، بیج ڈالنے، اناج اکٹھا کرنے اور پانی دینے کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ جو عورتیں باہر نہیں جاتیں وہ گھر میں اسی طرح کا کام کرتی ہیں۔ مثلاً زمیندار کی بیوی غلہ جمع کرنے، گھاس اکٹھی کرنے اور مال مویشی کی حفاظت میں میاں کا ہاتھ بٹاتی ہے علاوہ اس کے اناج کا پیسنا، چرخہ کاتنا، اپنے اور اپنے بچوں اور میاں کے لئے کپڑے تیار کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ علاوہ

کی بیوی کپڑا بننے میں مدد دیتی ہے۔ تیلی کی بیوی کولھو پر کام کرتی ہے۔ درزی کی بیوی سلائی میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ موچی کی بیوی کھالیں اکٹھی کرتی ہے۔ دھوبن تو اپنے میاں کا آدھا کام خود کرتی ہے اور اکثر بھاری بھاری گٹھڑیاں اٹھا کر گھروں میں کپڑے لے جاتی ہے۔ کمہار کی بیوی مٹی ڈھوتی ہے اور برتن ڈھالنے میں میاں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ دیہات میں عورتوں کا ایک خاص کام گوبر اکٹھا کرنا بھی ہے۔ جو ایندھن کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

حفظِ صحت کے لحاظ سے دیہاتی گھروں کی حالت بہت خراب ہے۔ عموماً ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں جہاں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہوتا ایک بڑا کنبہ رہتا ہے۔ مگر دن بھر کھیتوں کی تازہ ہوا میں رہنے اور قدرت کی کھلی فضا میں کام کرنے سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ان دیہاتیوں کی صحت عموماً شہری لوگوں سے بہتر ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا دور دراز دیہات میں کوئی خاص انتظام نہیں ہے اور ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ یونہی جہالت اور لاعلمی کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے۔

عورت اور صنعت و حرفت۔ ہندوستان کی خاص صنعتیں تین قسم کی ہیں۔ پارچہ بافی کے کارخانوں میں مزدوری، کان کنی اور کھیتی باڑی۔ بنگال اور بمبئی میں ۲۵۲۹۳۳ عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ جن میں ۵۸۱۵۰۶ روئی کے کارخانوں میں اور ۵۵۰۴۰ سن (jute) کے کارخانوں میں ہیں۔

کانوں میں بھی جگہ جگہ عورتیں زمین کے اندر کھدائی کا کام کرتی ہیں۔ اس وقت ۸۱۰۸۱ عورتیں مختلف کانوں میں کام کر رہی ہیں۔ کانوں میں عورتوں اور بچوں سے کام کرانے کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ اکثر لوگ اس کے مخالف ہیں کیونکہ زمین کے اندر کام کرنے سے اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور چونکہ غریب عورتیں بچوں کو گھر پر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس لئے وہ شیر خوار بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ اور وہ گھنٹوں زمین کے نیچے گندی ہوا میں سانس لیتے ہیں جو اُن کی نشوونما کے لئے بہت ضرر رساں ہے۔

بنگال اور آسام میں چائے کے کھیتوں میں بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ صرف آسام میں اڑھائی لاکھ کے قریب عورتیں اس کام میں مصروف نظر آتی ہیں۔ جنوبی ہند میں عورتیں چائے۔ کافی اور ربڑ کے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں عورتیں چاول، ریشم، اُون اور برتنوں کے کارخانوں میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ اکثر کارخانوں میں قلی کا کام عورتوں سے لیا جاتا ہے اور کئی جگہ عورتیں عمارات پر بطور مزدور کے کام کرتی ہیں۔ اور عموماً مردوں کی بہ نسبت کم مزدوری لیتی ہیں۔

بعض وقت نوجوان عورتوں پر ایسے کاموں کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے جو اُن کی جسمانی صحت کے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہوتا ہے بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ اُن کو بچوں کی پیدائش اور پرورش کی خدمات بھی انجام دینی ہوں چنانچہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے والی عورتوں میں ننھے بچوں کی شرح اموات دوسری عورتوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ اس خرابی کا انسداد کرنے کے لئے جگہ جگہ ایسے ادارات کھولے جانے چاہئیں جو ان کام کرنے والی عورتوں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کریں اور ان کو طبی اور دوسری امداد دیں۔ نیز کارخانوں کے کام اور وقت کے متعلق عورتوں کے

لئے مناسب قوانین بنانے پر زور دیں۔

سیاسی اور قانونی حقوق - ہندوستان میں اس وقت تک ۲۶۸۰۰۰ عورتوں کو رائے دہندگی کا حق مل چکا ہے۔ رائے دہندگی کے لئے عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں شرائط ہیں۔ اکثر صوبوں میں عورتوں کو کونسل کی ممبری کا حق مل گیا ہے۔ اور لیجیسلیٹو کونسل کی ممبر بھی بن سکتی ہیں۔ مدراس میں ایک خاتون ڈاکٹر متو لکشمی ریڈی وہاں کی کونسل کی ڈپٹی سکرٹری بھی رہ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں کئی صوبوں میں عورتیں میونسپلٹیوں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور لوکل بورڈوں کی ممبر مقرر ہوتی ہیں۔ تعلیمی اور طبی محکموں میں عورتوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے ہیں۔ چند عورتوں نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا ہے۔ اور بطور وکیل کے کام کر رہی ہیں۔ بعض مقامات میں عورتوں نے مجسٹریٹ کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ حال ہی میں ہماری تین قابل خواتین مسز سروجنی نیڈو، مسز شاہنواز اور مسز سبرائن گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ جنگ آزادی میں جو حصہ ہندوستانی عورتوں نے لیا ہے اُس کا کچھ اندازہ اُن الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو مہاتما گاندھی نے گزشتہ فروری کو دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں کہے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "موجودہ سیاسی تحریک میں عورت نے جو حصہ لیا ہے اُس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ جب ہندوستان کی اس تحریک کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہندوستانی عورت کی جانفشانی اور اُس کے ایثار کے کارنامے صفحۂ اول پر جگہ پائیں گے۔ اُن کے حیرت انگیز احساس اور اُن کی بیداری نے مجھے اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ خدا اس تحریک کے ساتھ ہے۔ اگرچہ عورتوں اور بچوں کو کوئی خاص سیاسی تعلیم نہیں دی گئی۔ اور نہ کبھی اُن کو ایسے کاموں کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ مگر اُن کی سرگرمی اور اُن کا جوش سب کو حیرت میں ڈال رہا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کون سی طاقت ہے جو اس راستہ پر اُن کی رہنمائی کر رہی ہے۔ بجز خدا کے کون کر سکتا ہے۔"

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے ہندوستانی عورت کی حالت بہت کچھ قابلِ اصلاح ہے۔ شادی، بیاہ، طلاق، جائداد اور وراثت کے متعلق اُسے مرد کے مقابلے میں بہت کم حقوق حاصل ہیں۔ ہندو عقاید کے مطابق ایک ہندو عورت عمر بھر کسی نہ کسی مرد کی محتاج رہتی ہے۔ شادی سے پہلے اُس پر باپ کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ شادی کے بعد خاوند کی اور بیوہ ہونے پر اُسے اپنی بقیہ زندگی اپنے بیٹے کے زیر اطاعت بسر کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ اُسے باپ یا خاوند کی جائداد پر کوئی خاص حق حاصل نہیں ہوتا لہذا وہ کبھی ایک آزاد اور خود مختار انسان کی طرح زندگی نہیں گذار سکتی۔ برخلاف اس کے اگرچہ ایک مسلمان عورت کو اُس کے مذہب کی رو سے ہر قسم کے حقوق اور آزادی حاصل ہے مگر افسوس کہ مسلمان مردوں کی خود غرضی اور ملکی رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے ہندی مسلمان عورت اپنے اکثر حقوق سے محروم کر دی گئی ہے۔

ہندوستان کے مردوں کو اس بات پر ناز ہے کہ انہوں نے اپنی عورتوں کو ہمیشہ غلامی اور محکومی کی حالت میں رکھا۔ اُن کو اُن کے حقوق سے محروم کیا۔ اور اُنہیں کبھی دوسرے مہذب ممالک کی عورتوں کی طرح آزادی کے میدان میں گامزن نہ ہونے دیا

اُن کا یہ فخر بجا، اُن کا یہ ناز درست سہی، لیکن اُس کا نتیجہ کیا ہوا، یہی کہ اپنی عورتوں کو ذلیل کر کے خود دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ اور اُن کو اُن کے حقوق اور آزادی سے محروم کر کے خود قیدِ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔

برادرانِ وطن! تمہاری خواہش ہے کہ تم اس غلامی سے رہائی پاؤ۔ تمہیں ملک کی حکومت میں حصہ ملے۔ تمہیں سلف گورنمنٹ اور کامل آزادی نصیب ہو۔ ہاں خدا کرے ہو اور جلد ہو۔ ہماری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ ہماری دعائیں تمہارے شامل حال ہیں۔ مگر ذرا سوچو اور غور کرو کہ جب تم نے اپنی عورتوں کو اپنی زندگی کی رفیقوں کو اپنی نسلوں کی ماؤں کو اُن کے جملہ حقوق سے محروم کر کے اُنہیں ذلت اور غلامی کے گڑھے میں گرا رکھا ہو تو تم کس منہ سے دوسروں سے حصولِ آزادی اور مطالبۂ حقوق کے دعوے دار ہو سکتے ہو۔ یاد رکھو کہ جب تک تم اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو وہ حقوق اور وہ آزادی نہ دو گے جس کی وہ صحیح معنوں میں حقدار ہیں۔ تمہیں ملک کی حکومت میں یہ چیزیں ہرگز نصیب نہ ہونگی۔ اور کیونکر نصیب ہو سکتی ہیں جب تمہیں یہ سب باتیں عورت کی زبان سے سیکھنی اور اُسی کے زیرِ تعلیم حاصل کرنی ہیں۔ وہ بحیثیت ماں کے تمہاری اولیں استاد اور بہترین رہنما ہے۔ جب تم نے اپنی ماں کی گود میں آزادی کا سبق نہ سیکھا جب تم نے اپنے اولیں استاد سے سلف گورنمنٹ کی تعلیم حاصل نہ کی جب تم نے اپنے بہترین رہنما سے ملک گیری کے قوانین نہ سیکھے تو تم بڑے ہو کر ملکی حکومت کی باگ ڈور کیونکر سنبھال سکو گے۔

اس وقت ساری دنیا کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں جس مشکل کام کا بیڑا تم نے اُٹھایا ہے خدا تمہیں اُس میں کامیاب کرے اور وہ دن جلد لائے کہ ہم اور تم مل کر حبِّ وطن کے راگ گائیں اور اس اجڑے گلستانِ ہند کو ایک دفعہ پھر شاد و آباد کریں۔

اصغری خانم

دل بہترین واعظ ہے، زمانہ بہترین استاد ہے، دنیا بہترین کتاب ہے، خدا بہترین دوست ہے!

مجھے کرنا چاہیئے، میں کر سکتا ہوں، میں کروں گا!

گلچیں

سودائے سنگیں

پردہ رُخِ جاناں سے اک روز اُٹھاؤں گا — میں اپنی طرح سب کو دیوانہ بناؤں گا

ہر لب سے سنُوں گا میں چرچا تری خوبی کا — نغمے تری الفت کے ہر بزم میں گاؤں گا

"تم بھولنا مت مجھ کو" کیوں تم نے کہا مجھ سے — میں بھُول نہیں سکتا، ہرگز نہ بھُلاؤں گا

قرباں تری راہوں پر تاحشر رہوں گا میں — مٹی ترے قدموں کی آنکھوں سے لگاؤں گا

جی بھر گیا دنیا سے، دل بُجھ گیا دنیا میں — میں سارے زمانے کو افسردہ بناؤں گا

سُن لی مرے مالک نے فریاد اگر میری — نالوں سے قیامت میں سو حشر اُٹھاؤں گا

کیسی یہ سزائیں ہیں؟ اے عجزِ محبّت کیا — میں خاک میں مل کر بھی یہ بھید نہ پاؤں گا؟

جب یاد کیا اُس کو، تب جان پہ بن آئی — یا اُس کو بھُلاؤں گا، یا جان سے جاؤں گا

اب میرے لبوں پر ہے، اے میرِ فغاں تیری

"آئندہ کسی سے میں دل کو نہ لگاؤں گا"

حامد علی خاں

جنگ و جدال

(نثری ڈراما)

فصل اوّل

اشخاص ڈراما

سنیحہ خانم	عمر ۵۵ سال
نعیم بک	سنیحہ کا لڑکا عمر ۳۹ سال
فرخندہ خانم	سنیحہ کی لڑکی عمر ۳۵ سال
بہیجہ	سنیحہ کی بہو عمر ۲۳ سال
نسیمہ	سنیحہ کی چھوٹی لڑکی عمر ۱۸ سال
ممدوح بک	سنیحہ کا داماد عمر ۳۸ سال
مجدی بک	سنیحہ کا بھانجا عمر ۳۲ سال
جمال	محلسرا کی منتظمہ
آنیقہ	خادمہ
ولی	مجدی بک کا خدمت گار

سنیحہ خانم کے کو شک (کوٹھی) میں ایک بڑا ڈرائنگ روم۔ بائیں جانب، ایک پیانو جس کی پشت ڈراما دیکھنے والوں کی طرف ہے۔ داہنی جانب، پیانو کے مقابل، ایک چوڑا سوفہ۔ بائیں جانب، پیانو کے پیچھے ایک دروازہ۔ دو بڑی کرسیوں کے بیچ میں ایک چھوٹی میز۔ اسٹیج کے پیچھے کی طرف دو بڑی کھڑکیوں کے درمیان، ایک شیشوں دار دروازہ جو ایک شاہ نشین کی طرف کھلتا ہے جہاں سے سمندر اور باغیچہ کے درخت نظر آتے ہیں۔ بائیں طرف کے دروازے کے مقابل میں ایک اور دروازہ۔

پردہ اُٹھنے سے پہلے، اندر سے پیانو کی آواز آتی ہے۔ پردہ اُٹھتے وقت، سوفے پر

سنیحہ خانم، پیانو کے قریب فرخندہ شہ نشین کی
سلاخوں سے ٹیک لگائے نسیمہ و بہیجہ کھڑی
نظر آتی ہیں۔ فرخندہ پیانو بجا رہی ہے، سنیحہ
عینک لگائے سوزن کاری کے کام میں مشغول
ہے

نسیمہ (یکایک لوٹ کر، خوشی کی آواز میں) اماں جان وہ
لیجئے جہاز نظر آنے لگا۔

فرخندہ۔ (پیانو سے فارغ ہو کر، اور کرسی کو پھرا کر) سچ؟"
(پوری طرح گھوم کر، سنیحہ سے) اماں جان، دیکھئے
جہاز نظر آنے لگا۔

بہیجہ (کھڑے ہو کر) مگر میرا خیال ہے ممدوح بک جہاز تک
نہ پہنچ سکیں گے

سنیحہ۔ مجدی نے بھی عجیب حرکت کی۔ تین سال پیرس
میں گذار کر استنبول لوٹتے ہیں، مگر اتنا نہ ہوا کہ ایک
تار ہی بھیج دیتے اور تار بھیجا بھی تو آخر وقت جس میں صرف
یہ لکھا ہے کہ "شام کو پہنچا" وقت کچھ نہیں لکھا۔

فرخندہ۔ خاص کر یہ خیال کر کے کہ ہمارے تار والے جس
قدر تار پہنچانے میں جلدی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ
میں وہ تار آٹھ گھنٹے سونے کے بعد پہنچا۔ ممدوح بک
کو کس قدر پریشانی تھی، کہ جہاز پر جا کے اُن کا استقبال
کس طرح کر سکیں گے۔

بہیجہ۔ مگر اس میں جس کا قصور ہے وہ اس کی سزا بھگتے گا
مجدی بک جس وقت جہاز سے اتر کے کنارے پر
پہنچیں گے، تو متوقع ہونگے کہ ممدوح کھڑے ہوئے
اُن کا انتظار کر رہے ہونگے۔ اُنہیں نہ پائیں گے تو
پریشان ہونگے۔

نسیمہ۔ ہاں، بے شک (شہ نشین کے دروازے میں کھڑے
ہو کر) وہ خیال کریں گے کہ کہیں خدانخواستہ کوئی
واقعہ پیش نہ آگیا ہو۔ کیوں باجی؟

فرخندہ۔ مگر کیوں ایسا خیال کریں، بک کو یہاں سے گئے
دس منٹ ہوتے ہونگے۔ جہاز ابھی ابھی پہنچا ہے نا۔
بس بک بھی پہنچ گئے ہونگے۔ ضرور ساحل پر
کھڑے ہونگے۔

نسیمہ۔ مگر بھائی جان کی اور اُن کی ملاقات نہ ہوئی تو
کیسا غضب ہوگا"

سنیحہ (مسکرا کر) یہ بھی بچپن کی بات ہے۔ ہر بات کو بڑھا
ہر بات میں مبالغہ! آخر اس قدر گھبراہٹ کا ہے
کو ہے۔ مجدی بک یہاں آئیں گے، اور نعیم جب
لوٹیں گے تو اُن سے مل لیں گے۔ اور "انہا لینگے
کہ تم سب کا جی بھر جائیگا۔ بلکہ تنگ جائیں گے
اور تمہارا منہ دیکھنے سے بھی بیزار ہونگے۔

نسیمہ۔ کیوں؟

سنیحہ۔ وہ اسی طبیعت کا آدمی ہے۔ اپنی عمر کا شاید
دسواں حصہ بھی اپنے گھر اپنے خاندان میں نہیں گذارا
اور اس کے بعد بھی نہ گذار سکا، اس کے نصیبے
میں یہی ہے۔

بہیجہ۔ (غور سے ان باتوں کو سنتی ہے، پھر یکایک
پیانو کے پاس جا کر، فرخندہ کا بازو پکڑ کے ہنستی
ہوئی، شہ نشین کی طرف لے جاتی ہے) باجی،
کیا سچ کہتی ہو؟ (فرخندہ کی باتوں کو جو وہ ہنس

ہنس کے اور آہستہ آواز سے کہتی ہے بنتی ہے،

اتنے میں نسیمہ اپنی ماں کے پاس آکے کہتی ہے:۔
نواب مجدی بک آئیں گے تو ہمارے پاس نہ ٹھیریں گے۔
کیوں اماں جان؟

سنبیحہ۔ یہ وہ جانتے ہیں میں نے جمال بی سے کہہ دیا ہے کہ اُن کا کمرہ درست کردے۔ اگر اُس کا دل چاہے تو یہاں ٹھہرے ورنہ اگر ہمارے ساتھ قید ہوکر رہنا اُسے پسند نہ ہو، تو ہم اُسے باندھ کر رکھنے سے تو رہے۔

بہیجہ (شہ نشین میں فرخندہ کی باتیں سن سن کر لوٹ ہوئی جاتی ہے، اور ایک بلند قہقہے کے ساتھ اونچی آواز سے کہتی ہے) آپا، آپ بھی غضب کرتی ہیں، کیا عجیب باتیں کہہ رہی ہیں۔ کس قدر عجیب آدمی ہے۔

نسیمہ (بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ، اپنی ماں کے پاس سے اُٹھ کر شہ نشین کی طرف جاتی ہے) ایسا ہو ہے۔ میں خوش تھی کہ آئیں گے تو میں خوب اُن سے تصویر کشی سیکھوں گی۔ مگر اس امید کو بھی الوداع کہنا چاہیئے۔

سنبیحہ۔ اگر صرف اتنے ہی کا رنج ہے تو گھبراؤ مت کیونکہ اگر وہ ہمارے پاس نہ بھی ٹھہرے تو بھی جب تک شہر میں رہیں گے میرے پاس روز نہیں تو ہفتے میں دو ایک مرتبہ مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔ اس لئے کہ دنیا میں اس وقت سوائے میرے اُن کا اور کوئی عزیز قریب نہیں۔ قطعاً اور بلازمی طور پر آئیں گے۔ ملنا اُسے لئے کیا یہ کافی نہیں۔

نسیمہ۔ (چلتے چلتے رک کر اور آدھا پھر کر اور مسکرا کر) اگر ایسا ہو تو کیا ہی اچھا ہے۔ (شہ نشین پر جاکے اور سلاخوں سے ٹیک لگا کے، داہنی طرف دیکھتی ہے) اے لو، وہ دیکھو جہاز کے مسافر نکل رہے ہیں۔ غالباً جہاز بھی اب روانہ ہونے کو ہے (دوڑ کے ایک چھوٹی میز سے دوربین اٹھا کے پھر سلاخوں کے پاس جاتی ہے اور داہنی طرف دوربین سے دیکھتی ہے)

بہیجہ۔ نسیمہ خانم مجدی بک کے آنے سے کس قدر خوش ہیں، کیوں آپا؟

فرخندہ (نسیمہ پر نظر ڈال کر) ہاں، مجدی تصویر خوب بناتے ہیں اس وجہ سے۔ وہ یوروپ تصویر کشی ہی سیکھنے کے لئے گئے تھے۔ ہماری چھوٹی خانم بھی کیوں نہ خوش ہوں۔ سوچتی ہیں نا کہ خوب دل بھر کے ان سے اپنی محبوب صنعت یعنی تصویر کشی سیکھیں گی۔

بہیجہ (مذاق میں) ہاں اپنی صنعت (نسیمہ کی طرف پھر کے) کیوں کچھ دکھائی دیتا ہے۔

نسیمہ۔ اس بھیڑ میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ یہ وقت اطہ کی بھیڑ بھاڑ اور اژدہام کا ہے۔ اس انسانی سیلاب میں کسی ایک آدمی کو پہچاننا ممکن نہیں۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ میں دولھا بھائی کو پہچان گئی (فرخندہ کی طرف) کیا وہ سفید کوٹ پہنتے ہیں؟

فرخندہ۔ معلوم نہیں، اُسے بدل کے گئے تھے یا اُسے ہی پہنے چلے گئے میں کہہ نہیں سکتی۔

بہیجہ۔ اُنہیں بدلنے کا وقت ہی کب ملا جس وقت تار ملا ہے، جہاز نکیہ لی سے روانہ ہو چکا تھا۔ بک جو کپڑے پہنے تھے وہی پہنے ہوئے بھاگے۔ (سب ہنستی ہیں)

ذرا مجھے عنایت کیجئے، (نسیمہ خانم دنسیمہ کے ہاتھ سے دوربین لے کے دیکھتی ہے)

فرخندہ۔(سنیحہ کے قریب آکر) آپ کیا دیکھ رہی ہیں، اماں جان؟

سنیحہ (شفقت آمیز آواز سے) بیٹی میں اُس ماں کی طرح دیکھ رہی ہوں جس نے اپنی تمام عمر اپنی چہیتی اولاد کی خوشیوں میں گزاری ہو، اور اپنی اس خوش قسمتی پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتی ہو، تم اسے اُس وقت سمجھ سکتی ہو جب کہ تمہارے بچوں کی بھی بہوئیں ہوں، اور وہ اپنی جوانی کی نازگی میں پُر مسرت زندگی بسر کرتے ہوں، اُنہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں اپنا شباب یاد آئے، اور تم اپنے شباب کو یا دوبارہ بسر کرتی ہو۔ مگر یہ بات اُنہیں نصیب نہیں جنہوں نے زندگی کے خراب رستے کو اختیار کیا ہو، اور زندگی کی راحت و سعادت سے محروم ہوگئے ہوں، یہ اُن کا حصہ ہے جنہوں نے چاہنے والے خاوند کے آشیانِ محبت میں خوش بسر کر زندگی کاٹی ہو۔

فرخندہ (اُس کے پاس جاکر جھک کے اُس کے ہاتھوں کو لے کے بوسہ دیتی ہے) آہ! میری پیاری اماں جان

سنیحہ۔ (اپنے ہاتھوں سے سلائی کا کام چھوڑ کے، رومال سے آنکھوں کو پونچھتی ہے، اور تھرائی ہوئی آواز سے) بیٹی، ایسی زندگی کے غموں میں بھی، کن الفاظ میں اپنا مطلب ادا کروں، گویا ایک دردآمیز لطف ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے خیال آرہا ہے۔ تمہارے والد اللہ بخشے اگر آج زندہ ہوتے، تو جس طرح انہوں نے مجدی کا سفر دیکھا، آج سفر سے اُن کی واپسی دیکھتے۔ کاش وہ آج ہم میں ہوتے اور خاندان کی آج کی مسرت میں شریک ہوتے یہ ممکن نہیں۔ مگر میں اس وقت اس سے مایوس نہیں ہوئی، بلکہ یہ سوچتی ہوں اور خوش ہوتی ہوں کہ میں تم سب کو اس طرح خوش و خرم دیکھ کر اُن کے پاس جاؤں گی۔

فرخندہ (متفکرانہ) اماں جان! (فرخندہ کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں)

بہیجہ (شہ نشین سے) جہاز روانہ ہوگیا۔

سنیحہ (اُس کے پاس جاکر) کیوں تم کسی کو دیکھ سکیں۔

بہیجہ (جہاز کے آدمیوں کو دیکھنے کے لئے جس طرح کھڑی تھی اُسے بدل کر، نسیمہ سے مسکراہٹ کے ساتھ) تم نے کچھ زیادہ ہی دیکھ لیا۔ (نسیمہ اُس سے دوربین لینا چاہتی ہے) اب کیا دیکھتی ہو ساحل پر اب کوئی نہیں رہا۔

نسیمہ (دوربین لگا کے) بیشک سب چل دیئے۔ جہاز بھی روانہ ہوگیا (دوربین کو میز پر رکھ دیتی ہے)

بہیجہ (شہ نشین میں سے) لو آگئے (نسیمہ و فرخندہ مڑکر شہ نشین پر آتی ہیں۔)

سنیحہ۔ خوشی کا شور

بہیجہ۔ آپا انہیں دیکھ لیا۔ ہاتھ سے سلام کر رہے ہیں۔

فرخندہ (نیچے دیکھ کر ہنستی ہوئی) خوش آمدید خوش آمدید

جمال بی (داہنی طرف سے داخل ہوکر) آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔ مبارک، مجدی بک تشریف لے آئے۔

سنیحہ۔ اُن کا کمرہ بالکل درست ہوگیا نا، بی؟

جمال۔ بالکل تیار ہے۔ اپنے مہمان کا انتظار کر رہا ہے۔

میری خانم۔

ممدوح بک۔ (دالان کے دروازے سے مجدی بک کو پکڑے ہوئے سنیحہ کے پاس لاتا ہے) لیجئے اماں جان! آپ کے آوارہ اور شریر بیٹے کو لے آیا (مجدی سنیحہ کے ہاتھ اور آنکھوں کو بوسہ دیتا ہے۔) مجھے اس قدر گھبراہٹ تھی کہ جہاز آجائیگا، اور میں استقبال کے لئے نہ پہنچ سکوں گا، آدھے راستے ہی میں رہ جاؤنگا۔

مجدی۔ (لوٹ کے) میں اچانک پہنچنا چاہتا تھا (فرخندہ کے ہاتھ لے کر ہونٹوں تک لے جاتا ہے) باجی جان! (نسیمہ کو دیکھ کر) اوہو! نسیمہ خانم تو تین برس میں پوری بڑی خانم ہوگئیں۔ غالباً اگر میں سڑک پر نقاب میں دیکھتا تو پہچان نہ سکتا لیکن اگر وہ یہ نہیں بھول گئیں کہ وہ مجھ سے چھوٹی ہیں، اور میں اُن کا بڑا بھائی ہوں تو انہیں معلوم ہوگا کہ اُنہیں میرا ہاتھ چومنا چاہئے (نسیمہ شرمائی ہوئی آتی ہے اور اُس کا ہاتھ چومتی ہے)

سنیحہ۔ رسموں کا آخری حصہ میں پورا کردوں تاکہ تم پھر آرام کرو۔ یہ کام تو نعیم کا تھا، مگر وہ چونکہ یہاں نہیں لہٰذا میرے ذمے ہوا۔ بہیجہ خانم... بیٹی۔ لو یہ تمہارے دیور ہیں (مجدی ادب سے سلام کرتا ہے وہ سلام کا جواب دیتی ہے)

مجدی۔ تو کیا نعیم بک یہاں نہیں ہیں؟

ممدوح۔ اس وقت شاید ازمیر کے قریب ہونگے، نہ معلوم کس شکار کی تیاریاں ہو رہی ہونگی۔ وہ کبھی خالی بیٹھ سکتے ہیں۔ اُنہیں جس چیز کا شوق ہوتا ہے اُسے خبط کے درجے تک پہنچاتے ہیں۔ ایک اسپورٹسمین، کہ انگریز بھی اسی قدر ہوتے ہونگے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شوق کی اس افراط میں انہوں نے انگریزوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مجدی۔ (فرخندہ سے) تم کیسی ہو، پیاری بہن۔ اس نٹ کھٹ ممدوح سے اب کوئی شکایت وغیرہ تو نہیں (ممدوح سینہ ابھار کے اپنی مونچھوں کو درست کرتا ہے) اوہو اب کیا تنتے جاتے ہیں۔ اس قدر عظمت فروشی

ممدوح۔ عظمت وظلمت تو میں جانتا نہیں صرف اس جسارت کا انتظار کر رہا ہوں کہ میری کوئی شکایت تو کرے۔ کیونکہ پورے اطمینان کے ساتھ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ دنیا کے تمام شوہروں سے بہتر ہوں، اور (سنیحہ کے قریب جاکر) دنیا کے تمام دامادوں سے اچھا ہوں۔ اس دعوے پر اکڑ بھی سکتا ہوں اور اگر اس کی تصدیق چاہتے ہو، تو دنیا کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ مقدس وواجب الاحترام پیاری اماں جان سے پوچھو۔

سنیحہ۔ ہاں میں بھی نہایت خوشی سے اس کی تصدیق کرتی ہوں۔ اور اگر سچ کہنا ضروری ہے تو میں اپنے بیٹے کے مقابلے میں، اپنے داماد سے زیادہ خوش ہوں، آہ! نعیم۔ وہ اس وقت موجود نہیں، نہ معلوم کن خطروں میں سے گزر رہا ہوگا۔ میری زندگی میں اگر مجھے کوئی غم ہے تو یہ ہے کہ وہ یہاں نہیں۔ کاش کوئی اس وقت مجھے اُس کا چہرہ دکھادے تو جو مانگے میں دوں۔ مگر یہ کہاں ممکن۔

فرخندہ (ایک طرف کو خاموش اور غمگین بیٹھی ہوئی بھیجی کی طرف آنکھ کا اشارہ کر کے مجدی سے) کہئے ان تین سال میں آپ کیسے رہے۔ کیا کیا کیا۔

مجدی۔ (سگرٹ جلا کے) بے حد اچھا رہا اور بے حد اپنے کو فائدہ پہنچایا۔ نہ معلوم تم جانتی ہو کہ نہیں، میں جب تک یہاں تھا۔ نہایت برا آدمی تھا۔ بہت سے واقعات کی بنا پر میں بدبیں اور مردم گریز ہو گیا تھا۔ مگر دیار غربت کی تنہائی میں جن مناسبات جن تعلقات سے میں خوشیوں کی توقع کرتا تھا۔ اُن سے مجھے غم و غصہ کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور انہوں نے مجھے سکھایا کہ انسان کی خوشی ماں باپ، بھائی بہن اور عزیزوں سے مشکل ایک چھوٹی سی جماعت پر منحصر ہے۔ وہ مختصر جماعت جسے خاندان کہتے ہیں۔ اور میں اچھے خیالات کی طرف پھر لوٹ آیا۔

سنیحہ۔ مبارک مبارک مجدی تم، میں دیکھتی ہوں کہ طریق رحمان کی طرف لوٹ آئے یعنی اب تم میں وہ اگلی تباہی پن کا اثر نہ رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے کہو گے کہ میرا بیاہ کر دو۔

فرخندہ۔ (ہنس کر) میں اُس کے لئے بالکل تیار ہوں یقین مانو کہ جیسی بیوی تم چاہتے ہو میں ہی انتخاب کر سکتی ہوں اور میں اس تلاش میں تھکوں گی بھی نہیں۔

مجدی۔ اچھا تو آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ جلدی نہ کیجئے۔ کیونکہ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مجھے ہی آپ گھبرا دیں گی۔ شادی کی خواہش کرنے سے زیادہ آسان کون سی چیز ہے؟ لیکن شادی کی خواہش کرنے اور ایک معقول عورت سے شادی کرنے میں اتنا فرق اور اتنا فاصلہ ہے کہ انسان کو ایک دم ڈرا دیتا ہے۔ یہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی خاتون کا دستیاب ہونا جو تمہاری طرح ہر نسوانی خوبی کی مالک اور ہر طریقہ سے لائق عزت و احترام ہو مشکل ہی نہیں محال ہے۔ اور بھتی بات تو یہ ہے کہ تھوڑا سا مجھے سستا لینے تو دو۔

فرخندہ۔ (ہاتھ کے اشارہ سے بات کاٹ کر) آپ کی عنایت۔ آپ کے حسن توجہ کا شکریہ اور یہ بطور جواب کے نہیں بلکہ بطور اپنی رائے کے کہتی ہوں کہ ہمارے مردوں میں آپ بھی اس قدر (مسکرا کر) میں اپنے بھائیوں کو شامل کر کے کہتی ہوں نادر اور قیمتی موتی ہیں کہ آپ کے قابل عورت کا ملنا استنبول میں مشکل ہے کیوں اماں جان؟

ممدوح۔ (ہنس کر) تسلیم اس عنایت خاص کا شکریہ اور آپ کی عمر میں گو وہ ایک ہی دفعہ نکلی ہے مگر سچی بات کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

سنیحہ۔ نہیں فرخندہ تم ان سب مردوں کو مغرور کر دو گی اور اُس کی تو خبر نہیں مگر دوسرے کو مغرور کر دینے کی سزا بھول مت جانا تمہیں ہی بھگتنی پڑے گی۔

ممدوح۔ کیوں اماں جان کیا آپ میرے متعلق کہہ رہی ہیں؟

فرخندہ۔ اور نہیں تو تم کیا خیال کرتے ہو۔ بیشک تمہارے ہی متعلق تو گفتگو ہے۔ مگر تمہیں معلوم نہیں کہ جس بات کا اماں جان کو خوف ہے وہ تو واقع ہو چکی یعنی آپ کا غرور حد معروف سے دیر ہوئی آگے نکل گیا (ہنس کر

(اپنے شوہر کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے)
مجدی (نسیمہ کے قریب جاکر) آپ لوگ اجازت دیجئے
ذرا چھوٹی خانم سے بھی تو بات کروں۔ لیکن آپ کو خبر
ہے کہ وہ اب تک میری نظر میں چھوٹی خانم ہی ہیں
مجھے تو اب بھی وہی نظر آرہی ہیں، جو جب میں
کسی تصویر کے بنانے میں مشغول ہوتا تو میرے
پاس پھر کر مجھے ستاتیں۔ اور میں کہتا نسیمہ دیکھو برش
کو مت چھوؤ۔ سیاہ رنگ کو ہاتھ مت لگاؤ نسیمہ
تم ساری تصویر برباد کردو گی۔ تمام رنگ ملادوگی۔
ممدوح لیکن نسیمہ خانم کو اب تمہیں دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا
ہوگئی ہیں۔ شاید تمہارے رنگوں کو ملا ملا کے اور
گڑبڑ کرنے ہی کی وجہ سے اب ایسی ایسی اچھی
تصویریں بناتی ہیں کہ میں خود ان کی قابلیت و استعداد
پر حیرت کرتا ہوں۔
مجدی۔ کیا کہتے ہو۔ نسیمہ خانم یہ سچ ہے؟
نسیمہ۔ محض مبالغہ۔ بے شک اگر مجھ میں کچھ استعداد ہے
تو آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور آپ ہی کے
طفیل سے ہے۔
مجدی۔ مجھے کس قدر خوشی ہوئی تم نہیں جان سکتیں۔
سنیحہ۔ ہمارے باغ میں اس نے ایسی اچھی تصویر بنائی۔
مجدی۔ ہاں! میری دلی مبارکباد قبول کرو۔ چھوٹی خانم
(یکایک سنجیدگی کے ساتھ) لیکن میری بے تکلفی معاف
کرنا میں تمہیں بھی ایک سنجیدہ بھاری بھرکم خانم کی طرح
نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس سے تو بس مجھے بچاؤ۔
نسیمہ۔ آپ کی جو خوشی ہو۔

مجدی۔ آپ کی عنایت۔ اچھا اب ذرا ہم آپ کی بنائی ہوئی
تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ نہیں؟
نسیمہ۔ بڑی خوشی سے۔
سنیحہ (سیدھی کھڑی ہوکر) مجھ سے سنو! ان باتوں کو تو
ابھی رہنے دو جمال بی نے جو تمہارے لئے کمرہ درست
کیا ہے۔ وہ دیکھو۔
مجدی (کھڑے ہوکر) اوہو جمال بی تم بھی آگئیں۔ (خادمہ
مسکراکر تسلیم کرتی ہے) کیسی ہو۔ اوہو اب بھی ویسی ہی
گول گپا۔ یہ بوڑھے لوگ بھی نوجوان رہنے میں کس قدر
کامیاب رہتے ہیں۔
جمال بی۔ حضور کیا اب بھی میں جوان کہلا سکتی ہوں؟ اب
جمال بی وہ پرانی جمال بی نہیں ہے۔
مجدی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری آنکھوں میں اب وہ پہلی
سی چمک نہیں۔ مگر ذرا جھکی ہوئی ہے۔ اور ہاں یہ تو
بتاؤ۔ علیم وسیم کیا نام تھا اس کا۔ وہ کہاں ہے۔ جیتا ہے؟
(جمال اپنا سر ہلاتی ہے) شائد اُس نے تمہیں بہت
جلا رکھا ہے کہ خواہ مخواہ اس طرح سر ہلا رہی ہو۔ لو اب
چلو اپنا کمرہ دیکھیں (پھر کر سب کو مخاطب کرکے)
اجازت دیجئے (داہنی طرف کے دروازے سے سیدھا
جاتا ہے)
جمال بی۔ اس طرف سے حضور! آپ غلط رستے سے جارہے ہیں
مجدی (دائیں طرف کو پھر کر) جمال بی کو تک کو میں بھول گیا۔
غالباً تمہارے بجائے میں بڈھا ہوگیا ہوں۔
فرخندہ (ہنس کر) واہ مجدی بے (دبیجہ کی طرف مخاطب
ہوکر) آپ نے کیسا پایا انہیں؟

بہیجہ ۔ بہت اچھا ۔ خاص کر بہت خوش مزاج ۔

فرخندہ ۔ اس قدر کہ انسان ہفتوں اُن کے پاس رہے تو بھی نہ اکتائے ۔

سنیحہ ۔ بچو سیر کو نہ جاؤ گے، کھانے کے وقت تک ذرا ہوا خوری کر آؤ ۔

فرخندہ ۔ سچ تو ہے ۔ بہت اچھا ہوگا (بہیجہ سے) باجی تم بھی آؤ گی ؟

بہیجہ ۔ میں فیصلہ ہی نہیں کر سکتی، شاید میرے جانے کے بعد سب آجائیں ۔ یہیں ٹھہروں تو اچھا ہے ۔

نسیمہ ۔ بھائی جان نے کہا تھا کہ میں جمعرات تک آؤں گا

ممدوح (شہ نشین میں سگار پیتے ہوئے) ہاں نعیم بے پنجشنبہ تک آئیں گے ۔

فرخندہ ۔ آپ بھی چل رہے ہیں نا، اگر کوئی امر مانع نہیں ۔

بہیجہ ۔ کیا امر مانع ہوگا ۔ آؤ باجی چلیں ۔

ممدوح (گھنٹی بجا کے، انیقہ سے جو اندر داخل ہوتی ہے) اخبار استنبول آگیا ؟

انیقہ ۔ ہاں حضور، نیچے ڈرائنگ روم میں ہوگا ۔

ممدوح ۔ مہربانی کر کے اٹھا لاؤ (انیقہ جاتی ہے)

سنیحہ ۔ ممدوح بک، چاہو تو تم بھی مجدی کے ساتھ سیر کر آؤ کیوں ؟

ممدوح ۔ اسے، جو دق ہو وہ جائیں (عورتیں باہر جاتی ہیں۔ ممدوح سگرٹ پیتا ہوا بالاخانے میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہے ۔ اتنے میں انیقہ اخبار لاتی ہے ۔ ممدوح اخبار لے کر دروازے سے ٹیک لگا کر، اخبار پر نظر ڈالتا، اور انیقہ سے، جو واپس جانے کو ہے کہتا ہے) انیقہ

دیکھو، مجدی بک سے کہو میں یہاں ہوں ۔ جب تیار ہو جائیں تو یہاں آجائیں ۔

مجدی (کپڑے بدل کر، بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے) کیوں، بیبیاں کہاں ہیں ؟

ممدوح (جھک کر، سگرٹ کو راکھ دانی میں بجھاتے ہوئے) سب ہوا خوری کو نکل گئی ہیں ۔ چاہو تو ہم بھی ذرا ہو آئیں ۔ مگر ذرا اجازت دو، اس اخبار کی دو تین سطریں اور پڑھ لوں ۔

مجدی ۔ تمہارا دل چاہے، تو سارا ختم کر دو [وہ بھی بالکونی (شہ نشین) میں آتا ہے] او ہ کیا اچھا منظر ہے ۔ ہاں وہ دیکھو جا رہی ہیں ۔ وہ اپنی چھتریوں کو ہماری طرف ہلا رہی ہیں ۔

ممدوح ۔ (اخبار کو ایک طرف ڈال کے) لیجئے، اب میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں ۔

مجدی ۔ (آگے بڑھ کے) کہئے ۔ کیا کہتے ہیں آپ کہاں چلیں ۔ کون سی جگہ جانے کے قابل ہے ۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے ۔

ممدوح ۔ چلئے بندرگاہ پر چلیں، تاکہ آخری جہاز کی واپسی دیکھیں ۔ کچھ گانا سنیں اور اوپیرا دیکھیں

مجدی ۔ بس ۔ اسی قدر ؟

ممدوح ۔ اور کیا چاہتے ہو ۔ یہ پیرس یا پلازا تو نہیں محض چالیس ہزار کی آبادی کا ایک مسکین غریب شہر

مجدی ۔ پھر مجھے تو یہ ہزار درجہ پسند ہے کہ سمندر کے کنارے بندرگاہ دیکھ، نہایت معمولی گانا سننے اور اوپیرا دیکھنے کے بجائے اس بے مثل منظر کو، اس دھندلکے اُفق

میں، محزوں مگر آتشیں غروب کی سیر کروں۔ اور یہیں
شہ نشین میں بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کروں۔

ممدوح۔ شاید تمہاری تصویر کشی کی رگوں میں پھر خون کا جوش
ہونے لگا۔

مجدی۔ انسان سیاحت میں کیسے ہی لطیف مناظر، کیسے ہی
شاعرانہ گوشے، دیکھے، اُن مقامات پر جس کہ میں وطن
سے دور ہوں اُس کے دل میں اس قدر جاگزین
ہوتی ہے کہ مدتوں وہاں رہنے پر بھی اپنے ملک کی
دلآویزی، اور مناظر کی شعریت کو نہیں بھول سکتا۔

ممدوح۔ نہایت شاعرانہ اور ادیبانہ بیان ہے، لیکن اس
کے سننے کے لئے بہیجہ خانم ہی کو ہونا چاہئے۔

مجدی۔ بہیجہ خانم۔ خاص طور پر وہ کیوں؟

ممدوح۔ کیونکہ تمہاری تقریر کی شعریت و لطافت کو صرف
وہی بخوبی جان سکتی ہیں۔

مجدی۔ اوہو، وہ شاعر بھی ہیں۔

ممدوح۔ واقعہ یہ ہے، کہ جیسا ہمارے ایک شاعر نے کہا ہو
شاعر تو نہیں، مگر بہت شاعرانہ ہے۔

مجدی۔ یہ بات۔ اچھا بھائی۔ ذرا میرے یہاں سے جانے
کے بعد کے حالات تو سناؤ (ایک سوفے پر دراز ہو
جاتا ہے)

ممدوح۔ (جیب سے سگرٹ کیس نکال کے اور مجدی کو
سگرٹ پیش کرکے) ہاں ضرور، اصل میں میں سمجھتا ہوں
یہ میرا فرض تھا۔

مجدی (سگرٹ، سگرٹ کیس میں سے اٹھا کر، اور دیاسلائی
کے بکس کے لئے ہاتھ بڑھا کر) کیوں نہیں۔ سب سے
پہلے گھر میں جو نئی دلہن آئی ہیں اُن کا حال سناؤ۔
(دیا سلائی جلا کر ممدوح کی طرف بڑھاتا ہے، ممدوح
اُس سے اپنا سگرٹ جلاتا ہے) کون ہیں؟ کس گھر کی
ہیں۔ کیسی عورت ہیں۔ (اپنا سگرٹ جلاتا ہے، اور
دیاسلائی کا بکس ممدوح کی طرف پھینکتا ہے) اور یہ
ہوا کیسے؟ نعیم بک، اپنے تمام مشاغل چھوڑ کے کس
طرح اس شادی کے لئے راضی ہو گئے؟ اور پھر کیوں
اس بیچاری عورت کو تنہا چھوڑ کر عرصے کے لئے
چلے گئے؟

ممدوح۔ یہ سب ایک قصہ ہے۔ اور ایسا کہ جس کی توقع نہیں
کی جا سکتی تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ نعیم بک
عاشق ہیں اور دیوانگی کی حد تک عاشق، اور ایسا عاشق
جو ہر قربانی کے لئے تیار ہو۔ تم اسے یقین کر سکتے ہو؟
ایسا عاشق جو اپنے تمام کھیل تماشے اپنے تمام سیر و
شکار کو بھول گیا ہو۔ یوں سمجھو کہ ایک عاشق شیدا مگر
لڑکی ہے کہ کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتی، اور کہا
یہ جاتا ہے کہ یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ نعیم بک خوش
شکل نہیں، بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ لڑکی کسی دوسرے
کو دل دے چکی تھی یا وعدہ کر چکی تھی۔ یہ خبر پا کر بھی نعیم بک
تھے کہ لڑکی کے باپ سے درخواست پر درخواست
کئے جاتے تھے۔ لڑکی کا باپ نہایت مالدار آدمی تھا اور
درخواستیں بھی نہایت دل نرم کرنے والے طریقوں
سے کی جاتی تھیں۔ مگر کامیابی نہ ہوتی تھی۔ آخر بہت
کوششوں کے بعد ہمارے نعیم نا امید ہو گئے لیکن
تمہارے جانے کے شاید برس ڈیڑھ برس کے بعد لڑکی

کا باپ حرکتِ قلب بند ہوجانے سے یکایک مرگیا۔
معلوم ہوا کہ اُس نے ترکے میں پانچ پیسے بھی نہیں
چھوڑے۔ لڑکی کو کچھ سرکاری باپ کی پنشن کے عوض
وظیفہ مقرر ہوگیا۔ لڑکی کی ایک بوڑھی خالہ تھی، وہی اس
کی تنہا رشتہ دار تھی۔ بدقسمتی سے وہ بھی تہی دست ہی تھی
بہر حال لڑکی جواب ہر طرف سے مایوس ہوئی تو اُس
نے ایک دن نعیم بک کی درخواست قبول کرلی۔
اُس وقت نعیم کا حال قابلِ دید تھا، مارے غرور اور
خوشی کے اُن کا قدم زمین پر پڑتا ہی نہ تھا۔ بالآخر
بیاہ ہوا اور دلہن گھر آئی۔ چند مہینوں تک تو ہر ایک
نے دیکھا کہ نعیم بک ہر چیز کو چھوڑ کر محض اپنی بیوی
کے ہوگئے۔ اتفاقاً ایک دن ایک بادبانی چھوٹی کشتی نظر
آئی یہ اتنی پسند آئی کہ نعیم نے اُسے خرید لیا۔ اور اس
کا نام بہیجہ رکھا۔ لیکن جس خانم پر اس کا نام رکھا گیا
تھا اس کشتی نے اس خانم کے ساتھ اتنی بھی وفا
کا اظہار نہ کیا۔ جتنا کہ خانم کے شوہر نے کیا تھا۔ یہ
کشتی ہی خانم کی مصیبتوں کا باعث ہوگئی۔ اس کا
خریدا جانا تھا کہ نعیم بک کو پھر اسپورٹ، پھر شکار،
سیر و تفریح، پھر آوارہ گردی کا خبط اچھلا، اور آہستہ
آہستہ نوجوان عورت نے ایک دن اپنے تئیں گوشۂ
نسیان میں تخت نشینِ بے التفاتی پایا۔

مجدی۔ بیچاری لڑکی! اگر یہ چیز نعیم کو کسی اچھے نتیجے پر
پہنچائے گی۔

ممدوح۔ بیچاری لڑکی اپنی مصیبت کا بہت کچھ مقابلہ کر
رہی ہے۔ اپنے زخمِ جگر کی اُس کے لب پر شکایت
نہیں۔ نسوانی نخوت کے زیر جبر و اثر ہوکر، وہ غمزدہ
عورت اس کی کوشش کرتی ہے کہ مجروح نظر نہ آئے
مگر اُس کا دردِ پنہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز اس
کی حالت خراب کر رہا ہے۔ وہ جو میری طرح نظر رکھتے
ہیں اُن سے یہ باتیں چھپ نہیں سکتیں۔

مجدی۔ اُس کے عادات و اطوار کیسے ہیں۔

ممدوح۔ حال تو تم دیکھ رہے ہو اور دیکھو گے۔ عادات
و اطوار ابھی غیر معین ہیں۔ کبھی تو ایسی خفیف الحرکات
نظر آتی ہے کہ انسان اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے
آخر نیچے گھرانے ہی کی اور گرے ہوئے اخلاق کی معلوم ہوتی ہے
لیکن پھر اس کی خفیف الحرکاتیوں ہی میں ایسا تغیر ہوتا
ہے، اور اُس کے غمگیں چہرے پر ایک ایسی سنجیدگی
چھا جاتی ہے کہ میں اُس کی دیوانگیوں کو حق بجانب
سمجھنے لگتا ہوں۔ ایسی نوجوان اور بلاشبہ امنگوں بھری عورت
کو اس عمر میں اُسے تنہا نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

مجدی۔ (کھڑے ہوکر) اپنا شام کا وقت کس طرح گذارتے ہو
(سگرٹ کو راکھ دانی میں بجھنے کے لئے رکھنے کو اس
طرف جھکتا ہے)

ممدوح۔ کبھی میں بندرگاہ پر محض تفریح کو اور باجا سننے چلا جاتا ہوں
کبھی ادھر اُدھر دوستوں کے گھروں پر ملنے چلا
جاتا ہوں۔ ایسی بہت پرلطف زندگی نہیں ہے سہی
تو بالکل بے مزہ بھی نہیں۔ ذرا ٹھہرو تو، میں تمہیں چند
ایسے خاندانوں سے ملاؤں گا کہ تمہارے سینۂ ساکن
میں طوفان برپا ہوجائے گا۔ ان میں تم ایسی ایسی
لطیف چیزیں پاؤ گے جو تمہارے فضیلت کے قلعے

آسانی سے منہدم کر سکتی ہیں۔ (کھڑے ہو کر) آہ، یہ عورتیں!

مجدی۔ آپ کا خیال غلط ہے، آپ یقین مانئے ایسی آسانی سے نہیں۔ مگر کوئی ایسی قیامت انگیز، فتنہ زا چیز ہو تو میرے پائے ثبات کو ڈگمگا دے تو وہ اور بات ہے۔

ممدوح۔ آپ کے فلسفۂ حیات کے ہی متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا یہ تو بتائیے ایک لمبی مگر بے ہیجان و یکساں، حیاتِ استراحت اچھی یا ایک لمحے کی بنیاد اور زیر و زبر کر دینے والی آتشیں پر لطف زندگی۔

مجدی۔ میں دوسری شق کی زندگی پر اپنی عمر فدا کرنے کو تیار ہوں۔ یہ لاکھوں انسان جو ایک دوسرے سے بے پروا، یا اکثر ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ان انسانوں میں دو ایسے انسان بھی مل جانے جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں، ایک دوسرے پر جان فدا کرتے ہوں، ایسی نادر خوش قسمتی ہے کہ انہیں دیکھنے اور اُن تک پہنچنے کے لئے ہر امکانی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر خود اپنے کو محبت کی یہ ثروت مل جائے تو اس پر ہر چیز کو فدا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے سب کچھ جائز و مشروع ہے۔

ممدوح۔ (مسکرا کر) بیشک، لیکن فضیلت و سنجیدگی کا دامن نہ چھوڑ کر

مجدی۔ ہاں بے شک، لیکن اس میں جائے تعجب کیا ہے۔ ہر شخص زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے

ممدوح۔ مبارک ہو۔ یورپ نے آپ کو (آپ کے ادعا کے مطابق) ایک صاحب فضیلت درویش نہیں بنایا

بلکہ ایک دہشت انگیز خود کام و خود غرض انسان بنا دیا ہے۔

چونکہ میں مناہی میں شاید موقع نہ پانے کی وجہ سے پڑا ہی نہیں، اس لئے میں اُن کے مزے اور لطف سے بھی بے خبر ہوں۔ کیا ساری برائیاں، سارے گناہ، لذات ممنوع کی طرف دوڑنے ہی کی وجہ سے نہیں وجود میں آتے۔ جن گناہوں سے لطف اُٹھا چکے اُن کے مقابلے میں اُن گناہوں سے، جن سے کوئی حظ کی امید ہی نہیں، کسی کا فضیلت و اتقا کا دعوے کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

مجدی۔ اس بحث کو چھوڑیئے، کیونکہ اس بحث میں طول ہو جانے کی بہت قابلیت ہے (نیچے کی طرف دیکھ کر) لو بیبیاں بھی آگئیں۔ (نیچے مخاطب ہو کر) ہم بھی آتے ہیں۔ (پھر کر) ہمیں بلا رہی ہیں، چلئے نیچے چلیں۔

نسیمہ (داہنے دروازے سے داخل ہوتی ہے) مجدی بک ہاں جان آپ کو بلا رہی ہیں۔ اپنے باغ کے پھول آپ کو دکھائیں گی۔ لیے استنبول آگیا (اخبار کو لے کر) مگر پڑھا تو جاتا نہیں۔ (لمپ جلانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ یہاں دق نہیں ہوتے۔

مجدی۔ ایک لطیف غروب کے وقت، آپ کے بہنوئی جیسے پرانے دوست کے ساتھ بیٹھنے سے کوئی دق ہو سکتا ہے (اتنے میں داہنے دروازے سے ہاتھ میں لیڈیز کی چھتری لئے بہیجہ اور ممدوح داخل ہوتے ہیں)

ممدوح (دو منٹ باتیں کر کے، مجدی سے) نیچے چل رہے ہیں؟

مجدی۔ (نسیمہ کو اپنے جلائے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اخبار کے پڑھنے میں مشغول، اور بہیجہ کو غمگین اور اداس ایک کرسی پر پڑا دیکھ کر) ابھی آیا، آپ چلئے (ممدوح جاتا ہے۔ مجدی بہیجہ کے قریب جاکر چھوٹی میز سے ٹیک لگا کے کھڑا ہوتا ہے) آپ کو معلوم ہے کہ میں نعیم بک کو کس قدر قابل مبارکباد خیال کرتا ہوں۔ (بہیجہ کی تبسم آمیز اور مستفسرانہ نظر کے جواب میں) نعیم بک کو اور نیز اپنے کو۔ نعیم بک ایک مردانہ دل، ایک بلند حوصلہ سینہ رکھتا ہے۔ ایسے انسان کے لئے آپ ہی جیسی فوق العادت خوبیوں کی بیوی کی ضرورت تھی بعض اوقات محض اتفاقاً ایسی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ جو سالہا سال کی کوششوں سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔

بہیجہ۔ (ہنس کر) یہ محض آپ کی لطف و عنایت ہے ورنہ آپ نے محض اپنے حسن ظن سے جن باتوں کا مجھ میں ہونا لازمی قرار دے دیا ہے۔ یہ خیال نہ کر لیجئے کہ وہ مجھ میں ضرور موجود ہیں۔ کیونکہ جب ہم آپ کے ساتھ رہینگے اور آپ اُن چیزوں کی پرچھائیں بھی مجھ میں نہ پائینگے تو پھر آپ کو افسوس ہوگا۔ اور یہ آپ پر ظلم ہوگا۔ بر عکس اس کے مجھے اپنے تئیں خوش قسمت خیال کرنا چاہئے کہ میں ایک ایسے خاندان میں آئی جس میں آپ جیسے اعلیٰ قابلیت و اعلیٰ خصائل کے افراد شامل ہیں

مجدی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں جب آیا تو مجھے امید نہ تھی کہ میں اپنے تئیں ایسے ماحول میں پاؤں گا جو میرے خیالات و افکار سے اس قدر موافق ہوگا۔ (اور گویا وہ ایسے کن رہی ہے (نسیمہ کی طرف متوجہ ہوکر) بالخصوص یہ معلوم کرکے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ نسیمہ خانم کا تصویر کشی کا شوق اور بڑھ گیا ہے۔ اُن خوبصورت ممالک سے لوٹنے کا جتنا مجھے افسوس تھا سب جاتا رہا۔

بہیجہ۔ ہماری وجہ سے جاتا رہا۔ کس قدر مبالغہ ہے

انیقہ (داخل ہوکر) کھانا میز پر ہے۔

نسیمہ۔ لو بہن، ہم بھی ایسے بھولے کہ سیر سے آکر سر کا رومال بھی نہیں اتارا۔

بہیجہ۔ چلو۔ جلدی چلو۔ کھانے پر انتظار ہوگا۔ (سب سے آگے بہیجہ اُس کے بعد نسیمہ، سب سے پیچھے مجدی جاتے ہیں)

(انیقہ تھوڑی دیر بالکونی میں رہتی ہے۔ ایک میز پر امریکا کا بنا ہوا بڑا لمپ رکھا ہے۔ اُسے جلاتی ہے۔ آرام کرسیوں اور کوچوں کے گدّوں اور تکیوں کو درست کرتی ہے، اخبار تہ کرکے میز پر رکھتی ہے۔ میز پر ممدوح کے سگرٹ کیس کو پڑا پاتی ہے، خوش ہوکر اُسے کھولتی ہے اور مسکراتی ہے۔ چاروں طرف دیکھ کر، جلدی جلدی سات آٹھ سگرٹ سگرٹ کیس میں سے چرا کر اپنی جیب میں ڈال لیتی ہے پھر سگرٹ کیس ہاتھ میں لے کر، اس میں سے ایک سگرٹ اور نکالتی ہے، اور دیا سلائی رگڑ کر سگرٹ جلاتی ہے اور بڑے مزے لیکر سگرٹ کے کش کھینچتی ہے۔ سگرٹ پیتی ہوئی پھر بالاخانے پر جاتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ بتی اونچی ہوکر دھواں دینے لگی ہے۔ اسے نیچا کرتی ہے) ہائے بتی بڑھ گئی میں نے دیکھا ہی نہیں (جھک کر سونے کے تکیے اٹھاتی ہے) اُف یہ تو لمپ کے دھوئیں سے سیاہ ہوگئے۔ خانم دیکھیں گی تو

قیامت برپا کر دیں گی۔ زلفوں کو اٹھا کر جھٹک کر جھاڑتی
ہے اور پھر اپنی جگہ رکھ دیتی ہے۔ اب اُس کا سگرٹ
ختم ہوجاتا ہے، اسے نیچے باغیچہ کی طرف پھینک دیتی ہے)
کھانا اب ختم ہو چکا ہوگا۔ (داہنے دروازے سے ذرا باہر جاتی
ہے، دس سیکنڈ کے بعد پھر لوٹ کر آتی ہے) ابھی کھا رہے
ہیں۔ اب آنے ہی کو ہیں۔

سنیجہ۔ (تھوڑی دیر بعد داخل ہو کر) انیقہ دیکھو، جمال بی
کو ذرا میرے پاس بھیج دے۔

انیقہ۔ بہت اچھا (نکلتے ہوئے دیکھتی ہے کہ مجدی اور فرخندہ
ساتھ آرہے ہیں۔ اُن کے لئے راستہ دیتی ہے، وہ
داخل ہوتے ہیں، پھر نکلتے ہوئے نسیمہ و بہیجہ و ممدوح
کو ساتھ آتا دیکھتی ہے، اُن کے لئے بھی راستہ چھوڑتی
ہے، پھر جاتی ہے۔)

مجدی۔ آج رات آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے میں
جو لطف اُٹھایا ہے، اُس سے میں عرصے سے محروم
تھا۔ ہاں، یورپ، پیرس اچھے ہیں۔ حتیٰ کہ کہہ سکتا
ہوں کہ اعلیٰ ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش
سے، روح انسان غربت و تنہائی سے اس قدر متنافر
ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھے پُرلطف اشغال بھی اُسے
عالم غربت میں بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔

ممدوح۔ آپ ہمیں بہت یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فرخندہ۔ بک، مجدی بک محض ہمیں خوش کرنے کے لئے
جو باتیں کہہ رہے تھے، آپ نے بے صبری سے انہیں
کاٹ دیا۔

مجدی۔ خوش کرنا، چاپلوسی، رشک کیوں تو بجا ہے۔ مجھے
محض تصنع اور بناوٹ کی باتوں سے خوش کرنے کی کیا
ضرورت ہے۔ میرے دل میں جو آپ سب کی محبت اور
عزت ہے، اُس کے ہوتے ہوئے مجھے چاپلوسی اور تصنع کی
کیا حاجت ہے۔ اور کیا تصنع محبت سے بڑھ کر ہے۔
(ممدوح اُس کی طرف سگرٹ کیس بڑھاتا ہے، وہ اس
سے ایک سگرٹ لے کر، اور ممدوح کی جلائی ہوئی دیا
سلائی سے اپنا سگرٹ جلا کر، اور اُسے سلام کر کے
ایک طرف کو بیٹھ جاتا ہے، اور فرخندہ کو جو سنیجہ کے پاس
اور نسیمہ کو جو کھڑکی کے پاس صوفے پر دراز ہے اور بہیجہ
کو جو بالکونی کے دروازے میں کھڑی ہے، اور ممدوح
کو جو ایک جھولنے والی آرام کرسی میں بیٹھا جھول رہا ہے
مخاطب کر کے اور اُن پر نظر ڈال کے) نہیں میں آپ
کو یقین دلاتا ہوں یہ محض چاپلوسی نہیں رشک لغت ہے،
اپنے قلب یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اپنی روح، اپنی آفت
کی تسلی اور فریضۂ منت ادا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ جو کچھ
کہہ رہا تھا۔ میں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک
اپنے تئیں اس قدر مستحق محبت و شفقت نہ سمجھتا تھا
آہ! آپ کو کیا معلوم جب میں یہاں سے پیرس گیا
تھا، ایسا مایوس دل لے کر گیا تھا کہ لوگوں سے نفرت
کرتا ہوا گیا تھا۔ لیکن تین سال ایک غیر ملک میں، ایک
غیر قوم میں رہ کر جو اپنی ہر حرکت، ہر حالت سے مجھے
جتاتے تھے کہ میں اُن میں کا نہیں، اور اُن میں زندگی
بسر کرتے وقت میں ہر روز ہزاروں علامتیں اس کی
پاتا تھا کہ میں تنہا ہوں اور اُن سے علیحدہ ہوں۔ آج
اپنے ملک، اپنے خاندان میں پا کر جس کے کل افراد

اپنے خیالات اپنے حرکات وسکنات سے یہ ظاہر
کرتے ہیں کہ میں ویسا ہی ہوں۔ جیسے وہ ہیں اور
وہ ویسے ہی ہیں جیسا میں ہوں۔ آج اپنے تئیں ان
میں پاکر، میں وہ رقتِ قلب محسوس کرتا ہوں کہ میری
آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔

(سلیمہ اتنے میں داخل ہوتی ہے اور جمال سے کہتی
ہے۔ جمال ذرا آؤ دیکھوں تم نے مجدی بک۔ کے
لئے کمرہ کیسا درست کیا ہے۔ کیا کیا ہے۔)

جمال بی۔ بہت اچھا، تشریف لے چلئے (بائیں جانب
سے دونوں جاتی ہیں)

ممدوح (قہوہ کی پیالی کے آخری قطرے کو پی کر، اور پیالی
کو پاس کی میز پر رکھ کر) فرخندہ! فرخندہ ذرا ہمیں پیانو
نہیں سناتیں؟

فرخندہ (ہنس کر اور پھر بیٹھ کر) کیا آپ مجھے پیانو کا ایسا
استاد سمجھتے ہیں کہ میں مجدی بک کے سامنے پیانو
بجانے کی جسارت کروں۔ جو تین سال تک پیرس
میں رہ کر اور اپنے موسیقی کے شوق کی وجہ سے نہ
معلوم کیسی نادر محفلوں میں شریک ہو کر آئے ہیں۔

مجدی۔ اوہو، تم نے اظہارِ استغنا و انکار کے لئے محض
بہانہ تو نہیں ڈھونڈا۔ بیشک میں یہ تو نہ کہوں گا کہ پیرس
کے سہ سالہ قیام میں، میں اپنا زیادہ وقت وہاں کے
استادانِ موسیقی کے کمال کے دیکھنے میں نہیں گذارا۔ اگر
یقین مانئے کہ وہاں کے کمال کو دیکھ کر میں اپنے ملک کے
لئے ہر وقت یہی تمنا کرتا تھا کہ کاش ہمارا ملک بھی اسی
کی طرح بام ترقی پر پہنچے۔ اور یہ بھی یقین مانئے کہ یہاں
کی مشکلات اور بے پروائی کے محیط میں رہ کر کسی ترک
خانم کا موسیقی کی آرزو کرنا اور اس آرزو کو قوت سے
فعل میں لانا مجھے رہین منت ومسرت کرتا ہے۔
آپ نہیں جان سکتیں کہ موسیقی سے محروم رہ کر،
ہم کن بڑی خوشیوں اور کن محاسن سے محروم رہتے
ہیں۔

ممدوح۔ میں اس معاملے میں آپ کا ہم فکر ہوں۔ واقعہ یہ
ہے کہ اگر میں نہ ہوتا، اور یہاں میری جگہ کوئی اور ہوتا
تو جو پیانو آج آپ کو کھلا نظر آرہا ہے وہ بند نظر آتا۔

مجدی۔ بے شک وہی ہوتا جو ہمارے اور گھروں کے پیانوؤں
کا حال ہے۔ اور پھر یہ اُن کی کتنی بڑی عنایت ہے
کہ آپ کی خاطر وہ پیانو کھولتی ہیں۔ موسیقی سننے اور سنانے
ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ تنہا گانے سے کوئی
لطف نہیں آتا۔ اور اگر آتا ہے تو وہ اس کے مقابلے
میں کس قدر حقیر ہے جو کسی کو سنانے سے آتا ہے۔
حال آنکہ ہماری زندگی ایسی ہے کہ چاہے کوئی دلدادۂ
موسیقی ہو یا اس سے بے پروا وہ کسے موسیقی سنائے
اس کے نکات کون سمجھے گا۔ اور کہاں سننے اور
سمجھنے کے لئے جائیں۔

فرخندہ۔ بیشک، اور انسان، وہی چیز ہمیشہ انہیں
آدمیوں کو سناتے سناتے تھک جاتا ہے۔

مجدی۔ میری درخواست معلوم نہیں قبول ہوگی کہ نہیں
میں چونکہ نیا آیا ہوں، لہذا میرے نئے پن کی خاطر
مجھے امید ہے کہ آپ سنانے سے گریز نہ کریں گی۔

فرخندہ ہنس کر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر آپ کے سامنے

کچھ سناؤں بھی تو بہیجہ خانم سے پہلے اس کی جسارت نہیں کرسکتی۔

بہیجہ (جو نسیمہ سے باتیں کررہی ہے، اپنا نام سُن کر) کیا کہا بہن۔

ممدوح۔ ضرور، بہیجہ خانم، یقیناً فرخندہ خانم سے بہتر پیانو بجاتی ہونگی۔ ایسی حالت میں بقول فرانس والوں کے، جو سب سے قابل ہو وہ سب سے پہلے آئے۔ اس وقت کے جلسے میں سب سے پہلے لطفاً آپ کو آنا چاہئے۔

بہیجہ (اُٹھ کر) توبہ توبہ۔ مگر چونکہ آپ حکم دیتے ہیں لہٰذا تعمیل ضروری ہے۔ (پیانو کے پاس جاتی ہے، مجدی دوڑ کر موم بتیاں جلاتا ہے) تسلیم (بیٹھتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتی ہے، پھر لوٹ کے اور ہنس کے) میں نہیں جانتی کیا شروع کروں آپ کی کیا فرمائش ہے۔

ممدوح (مجدی سے) ہاں بتائیے، آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟

(مجدی فرمائش کرتا ہے۔ بہیجہ گانے کے نوٹ کے اوراق الٹ پلٹ کرکے انتخاب کرتی ہے اور شروع کرتی ہے

مجدی اُس کے کمال سے متعجب ہوتا ہے، اور زبانِ حال سے گویا یہ کہتا ہوا کہ کتنا اچھا گاتی ہے ممدوح کے پاس جاتا ہے۔ دونوں بالکونی میں کھڑے ہوتے ہیں۔ فرخندہ اور نسیمہ بھی وہاں ہیں تھوڑی دیر موسیقی، مجدی دروازے میں کھڑے ہو کر اور استغراق سے سن کر) آہ یہ کس روحِ نالاں کا نالۂ دلکش ہے۔ کیوں ممدوح بک؟

ممدوح۔ اس میں کس شبہ کی گنجائش ہے؟ لیکن مصنف کی پُرغم زندگی سے بڑھ کر کوئی زندگی پیش بھی نہیں کی جاسکتی۔

مجدی۔ آہ اس گانے میں اک پُراز فریاد و پُراز شکوہ و شکایت عورت کی جگر دوز لطافت و نزاکت ہے۔

(فرخندہ، ہنستی ہوئی بالاخانے سے ممدوح کو بلاتی ہے۔ مجدی اب کمرے میں تنہا رہ جاتا ہے پیانو کے قریب مفتونانہ جاکر، بہیجہ کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے، پیانو ختم ہوتے ہی) میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے کس قدر استادانہ بجایا ہے، کیسی کامیابی سے، عدیم المثال اور عدیم النظیر کامیابی کے ساتھ آپ بجا رہی تھیں مجھ پر حالتِ غشی طاری ہوگئی۔

بہیجہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ موسیقی کے عاشق ہیں۔

مجدی۔ دیوانہ وار عاشق۔ اس ۳۲ سالہ زندگی میں میں نے جس حرارت سے موسیقی کو چاہا کسی چیز کو نہ چاہا۔ خاص کر اور جس چیز کو چاہا ہو اُس سے سینکڑوں ظلم و ستم کی توقع رکھو، لیکن موسیقی تمہیں لطف و لطافت کے سوا اور کچھ نہیں دیتی۔

ممدوح۔ ہاں ذرا وہ چیز سناؤ جو تم نے پچھلے دنوں سنائی تھی۔ اُف کس غضب کی ہے۔

مجدی۔ ذرا شروع کرنے سے پہلے میرا قصہ سن لو۔ پیر گئے ہوئے، مجھے ایک ہی ہفتہ ہوا ہے۔ ایک

احمق فرانسیسی جنہیں ہمارے حال سے واقف ہونے کا دعویٰ تھا۔ میرے عشقِ موسیقی کو دیکھ کر مجھ سے کہتے تھے۔ میں دیکھتا ہوں مشرق میں موسیقی نے بہت ترقی کی ہے۔ میں نے کہا آپ نے کاہے سے جانا؟" بولے۔ "آپ کی موسیقی کی واقفیت سے۔"

اُس بیچارے کو کیا معلوم کہ کتنی مشکلات، اور کتنی سیاحتوں کے بعد مجھے یہ واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ اُسے کیا معلوم کہ ہمارے اوپیرا ہمارے تھئیٹر، اٹلی اور فرانس کے دوسرے تیسرے درجے کے تھئیٹر اور اوپراؤں کی محض نقل ہیں۔ آپ ہی سوچئے اس محیط میں پل کر، میں موسیقی کے عشق میں کہاں کہاں گیا۔ یورپ میں، قطبِ شمالی یا قطب جنوبی کی سیاحت کو جانے والے اور ناکام واپس آنے والوں کو تمغے اور انعام ملتے ہیں۔ میری سیاحت اور موسیقی کا تعاقب، کچھ ان سیاحوں سے کم نہیں۔

دسب ہنستے ہیں۔ بہیجہ نوٹوں کے اوراق کو الٹ پلٹ کر کے، ایک کو انتخاب کرتی ہے اور بجانا شروع کرتی ہے، ممدوح اور فرخندہ پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، بالکونی میں آجاتے ہیں۔ پیانو کے پاس مجدی اور بہیجہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ بہیجہ پیانو کو بجاتے وقت دزدیدہ نظروں سے مجدی کو دیکھتی ہے، وہ بھی اک نگاہِ تدقیق سے اُس کے پاؤں اور چہرے اور جسم پر نظر ڈالتا ہے اور اُس کی نظروں میں ایک اندازِ مفتونیت پیدا ہوتا ہے۔ عین اُس لمحے میں ان کی نظریں دو چار ہوتی ہیں۔ ایک کی نظر میں آتشِ مفتونیت، دوسری کی نگاہ میں اول حیرت اُس کے بعد ممنونیت دکھائی دیتی ہے۔ بہیجہ اس نظر کی معنائے مفتونیت سے خوش ہو کر، مگر تھوڑا سا کانپ کر پیانو کے بجانے میں تھوڑا سا رکتی ہے۔ اتنے میں فرخندہ اور ممدوح بالکونی کے اندر گھس کے مجدی کی طرف جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

باقی

سجاد حیدر یلدرم

تُم کہاں سے آ رہے ہو؟
مشرق سے
تُم کہاں کو جا رہے ہو؟
مغرب کو
تُم کس کی تلاش میں ہو؟
کھوئے ہوئے کی تلاش میں
اُسے تُم کہاں پاؤ گے؟
مرکز میں!

عالمِ افسردگی

(۱)

پھیکی پھیکی ہیں چاندنی راتیں — اب کہاں وہ شباب کی باتیں
بادۂ حسن سے سحر محروم — میگساری سے ہے نظر محروم
اب وہ رنگینیاں چمن میں نہیں — نزہتیں لالہ وسمن میں نہیں
شام نا آشنائے مدہوشی — آہ! وہ دورِ خود فراموشی!
کیف دل میں نظر میں نور نہیں — پی رہا ہوں مگر سرور نہیں
روح میں لرزشِ حیات نہیں — اب تو مے میں بھی کوئی بات نہیں

لطف باقی رہا نہ جینے میں
دل ہی بے حس پڑا ہے سینے میں

(۲)

آہ! وہ دن اور آہ! وہ راتیں!! — سب جوانی کی تھیں کراماتیں
اب وہ بے تابیٔ شباب کہاں! — آتشِ شوقِ بے حساب کہاں!
حسن ہی حسن جلوہ فرما تھا — عشق ہی عشق نغمہ پیرا تھا
مری ہر سانس اک فسانۂ حسن — بزمِ ہستی نگار خانۂ حسن
جلوۂ حسن غیر فانی سا — نغمۂ عشق جاودانی سا
شادمانی ہی شادمانی تھی — کیا حقیقت نما کہانی تھی!
دل، کہ تھا حشر گاہِ جوش و خروش — تابشِ صد شرار در آغوش
آخرِ کار چاک چاک ہوا — بجھ گیا اور بجھ کے خاک ہوا
بے قراری نہ آہ و زاری ہے — ایک افسردگی سی طاری ہے

کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں
گویا صحرا میں لٹ گیا ہوں میں

اثر صہبائی

سسرے کا پرسا

اب سے دُور مرزا کی جنم جنم کی سانٹھن بڑی ماندی پڑیں۔ چلّے کے اٹھواٹے دو اٹھواٹے بعد ہی دودھ پلنا بچہ ہٹ چکا تھا۔ اجاپے کے روگ نگوڑے ایسے تو ہوتے ہی ہیں کہ ادھر آئیں ادھر جائیں۔ ایک بجوگ ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کوئی بھاگ بھری ہوتی ہو گی جو ہاتھ پیروں کی سلامتی سے پلنگ کو لات مار کر کھڑی ہو جائے۔ نہیں تو اسی رون رون میں جگ گزر جاتے ہیں۔ ہڈی سے چمڑا لگ کے رہ گیا۔ سانسوں کا شمار تھا۔ کہ باوا کی سناؤنی آئی۔ میاں نے ساس سسرال والوں نے کہا لسّم لسّم دلہن بیگم کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہ پڑے نہیں تو دشمن پھنکا بھی نہیں کھائینگے۔ مرزا چپکے چپکے سفر کی تیاری کر بہانہ بنا گھر سے نکلا۔ مرزا کے سسر الله جنت نصیب کرے ایک ریاست کے رکن تھے۔ اور وہاں کے سرداروں میں ان کا شمار۔ ولایت کے تعلیم یافتہ۔ بڑے ہنسوڑ اور بلبل ہزار داستان۔ مرزا کی خوشدامن رنواس میں بیری ہوئی تھیں اور مہارانی کی ناک کا بال تھیں۔ مہارانی بے اولادی تھیں۔ بچوں کی پروانہ۔ انہوں نے اپنی لڑکی کا ہاتھ مرتے وقت مہارانی کے ہاتھ میں دیا۔ اور چل بسیں۔ مہارانی نے بڑے ناز و نعمت سے اس لڑکی کو پالا اور مرزا سے بیاہ دیا۔ مرزا کو کوئی سروکار اپنے خسر سے نہ تھا جو کچھ تھے وہ مہاراجہ اور مہارانی۔ اب جو سسرے کی سناؤنی آئی بیٹھ ریل میں روانہ ہؤا۔ یہ مشہور ہو گیا تھا کہ انہوں نے نکاح کر لیا ہے۔ بڈھے تو تھے نہیں۔ اچھے خاصے کرارے تھے۔ کہاں تک رنڈوے بیٹھے رہتے۔ بیٹھتے بھی۔ تو ملنے جلنے والے کاہے کو بیٹھنے دیتے۔ دو ہزار کی تنخواہ۔ ہزار بارہ سو ماہوار کی املاک۔ بل بل کر کے لوگ بیٹیاں دینے کو تیار۔ لڑکی بلی صورت شکل کی اچھی۔ چاروں علم تحصیلے ہوئے۔ عربی۔ فارسی، اردو اور انگریزی میں تو فراٹے بھرے۔ لیکن ایسی گھڑی گرہ بندھی سے دے کر کے وہ بیمار پڑے نو برس کھٹیا کاٹی۔ آدمی تھے سمجھدار سوچے کہ کیوں اپنے ساتھ ایک جان جوان برباد کی۔ بیوی کو سمجھایا۔ وہ بھی پڑھی لکھی فہمدار خلع پر راضی ہو گئی۔ یہ سب کارروائی اندر خانے ہوئی۔ اور کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔ اُن کا نکاح اپنے منشی سے چپ چپاتے کر۔ اپنے ہی پاس رہنے دیا۔ اس سے ایک لڑکا ہؤا۔ سب نے سردار صاحب کو بیٹے کی مبارکباد دی اور ان کے جیتے جی کسی پر بھی یہ بھید نہ کھلا۔ جاڑوں کا موسم مہاوٹوں کا زمانہ۔ مرزا کوئی چار بجے صبح اندھیرے منہ محلے پر پہنچا۔ وہ ٹھنڈی ہوا برف سے نکل کر آرہی۔ معلوم ہوتا تھا جاڑے کا پیٹ پھٹ گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ چھائی ہوئی۔ مینہ موسلا دھار۔ بجلی کے اب چمک کے پھر چمکوں۔ بادل کہیں اب گرج کے پھر نہ گرجیں۔ مرزا اوپر تلے اناپ شناپ بارہ تیرہ کپڑے پہنے اس پر بھی دانت بجے سُو سُو کرتا۔ بیٹھ سواری میں کوٹھی پر پہنچا۔ ہمارے خدمتگار اپنے اپنے کونوں کھدروں میں دبکے پڑے۔ اتر۔ برآمدے میں بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لگا دن نکلنے کا انتظار کرنے۔ اور سوچنے کہ الٰہی سسرے کو کیا یاد کر کے روؤں۔ سب اپنے پیارے یاد کئے کہ ذرا جی بھر آئے۔ حضرت امام حسینؑ کی

مصیبت کو یاد کیا کہ کچھ تو آنکھ ڈبڈبائے۔ لیکن مارے سردی کے آنسو ایسے جم کر ٹھوس ہوئے کہ ذرا ٹپکنے کا نام نہ لیں۔ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا سکوڑے کھاتا رہا۔ کبھی جی میں کہتا کہ کم بخت کوئی ایسا بڈھا ٹڈھا نوکر ہی جس کو صبح ہوتے سردی سے ٹھسکا لگے یا ڈھوں ڈھوں کہے۔ بچے کو بھی کیا بام بھون کے بائل بھگے کھلائے ہیں کہ نہ تو نہا کے بھگوئے نہ کپڑے گیلے کر کے کلبلائے اور بے چین ہو کے روئے اللہ اللہ کر کے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اور آدمیوں کی بیر چال سنائی دی۔ مرزا نے دستک دی۔ گول کمرہ کھلا۔ اور مرزا اندر داخل ہوا۔ دیوان پر ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ لگا انتظار کرنے کہ ساس اب بلائیں جب بلائیں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد مغلانی نے آکر کہا بیگم صاحب یاد فرماتی ہیں۔ مرزا نے اتنے میں جلدی جلدی خوب آنکھیں مل لال کیں اور خوب ناک کو مل دل سرخ کرلیا۔ اور یہ خیال کر کے دنیا کیا کہے گی کہ سسرے کے لئے دو آنسو بھی نہ گرائے۔ رومال آنکھوں پر رکھ رونے کی آواز نکالتا ہو ہو کرتا۔ رستے کو آنکھوں پر رکھے ہوئے رومال کے نیچے سے دیکھتا خوابگاہ میں سے ہوتا ہوا سنگار خانے میں داخل ہوا۔ دیکھا ایک اونچے تخت پر سفید سوزنی بچھی ہے۔ اس پر ساس بیٹھی ہوئیں۔ کوئی چھتیس سینتیس برس کا سن۔ رنگ گورا بھبھوکا سفید ململ کی کالی کنّی کی ساڑھی بندھی۔ موم کی بتی معلوم ہو رہی تھیں۔ مرزا نے سامنے جا کر بہتیرا گلا پھاڑا اور ہو ہو کی لیکن وہ ذرا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں، اور ایک آنسو نہ ٹپکایا اور ساکت بیٹھی رہیں۔ اب مرزا لیا گیا کہ الٰہی اس سانگ کو کیونکر ختم کرے۔ آخر سسکیاں لیتے لیتے تھوڑی دیر میں سکوت اختیار کیا لیکن آنکھوں پر سے رومال ہٹانے کی ہمت نہ ہوئی کہ سارا بھانڈا کھل جائے گا۔ یہ بھی آخر کب تک۔ ناشتہ انگریزی آیا۔ جاڑوں کی لمبی راتیں۔ مرزا بھوک کا کچا۔ اور سردیوں میں بھوک ویسے بھی کھل جاتی ہے۔ لیکن یہ سوچ کہ ایک تو سسرال دوسرے آیا تعزیت کے لئے۔ اگر ناشتہ اچھی طرح کیا تو دس دیکھنے کیا کہینگے کہ داماد ہو کے سسرے کا ذرا رنج نہیں۔ اُدھر ساس کی صلاح کی کہ آئیے آپ بھی شریک ہو جئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نفس کشی شروع کی ہے۔ ایک ذرا سا ٹکڑا جوار کی روٹی کا کھالیتی ہوں مرزا نے کہا کہ آپ کھائیں گی نہیں تو رونے کی طاقت کہاں سے آئیگی۔ آدمی اَن کا کیڑا ہے۔ نہ کھائیے تو کمزور ہو جائیے۔ اور کمزور سے رویا کیا خاک جائے۔ وہ بولیں اے ہے جبھی تو میں بھی کہوں کہ الٰہی مجھے رونا کیوں نہیں آتا۔ پھوں کھاؤں گی نہیں تو رونے کا دم کہاں رہیگا۔ مرزا نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک مغلانی تھیں کلّو خانم۔ آل نہ اولاد۔ وہ اور ایک انکے بڑے میاں۔ مزاج کے کھُردرے ہر وقت کی لکا فضیحتی۔ غرض ساری عمر یونہی جوتیوں میں دال بٹی۔ بڑے بیمار اور کوئی برس بھر جورو سے لی خدمت۔ بچاری ٹھنڈا لیپا کرتے اور کپڑے دھوتے عاجز آگئی۔ آخر کو ایک ساوانی سی ہو گئی۔ ایک دو دن کی بیماری ہو تو خیر۔ ہنستی آدمی ٹلّے نولیسی کرے۔ سال کے بارہ مہینے کون پٹی پکڑ کے بیٹھے۔ کلّو خانم کا جی چاہا ایک دن گھبر کو خصم کی بھی الٹ پلٹ کرتی جاتی اور کبھی کبھی گھونٹتی جاتی جب کھبر گھٹ گھٹا ہوئی تیار سا ور چاہیں کر چولہے پر سے اتاریں ہچکی کی آواز آئی۔ دوڑی ہوئی درے میں گئیں۔ دیکھیں تو بڑے میاں کے دیدے کھلے کے کھلے۔ اور سانس ندارد۔ کہنے لگیں موئی خدا کی مار کیا بیری مردوا ہے۔ نگوڑا عمر بھر خوشی میری نہ دیکھ سکا آج ذرا کھبر کو جی چاہا تھا تو موئے کو ابھی مرنا تھا۔ کم بخت کی جان جو ابھی سے سینتی ہوں ہمسائیاں پل کے جان پر آ سوار ہونگی۔ سارے دن کی میں بھوکی۔ رو یا کس خندی سے جائے گا۔ اُدھر کھبر کتے کیوں چھوڑنے لگے۔ کونسے اس ہنڈی کے سگے ہیں آ بوچ کھانے

میں نکال غوری میں کھیر جلتی گرم لگیں چھپا چھپ اڑانے۔ ہنڈیا ڈوئی۔ غوری سب چاٹ چوٹ صاف کی۔ جھجری میں سے بھر کٹورا پانی پیا۔ اب چپکے سے مردے پاس آئی۔ ڈھاٹا باندھا آنکھیں جوں توں بند کیں۔ سب کاموں سے فارغ ہو۔ وہ کلیجہ پھاڑ کے دہاڑیں کہ سارے محلے والے ٹوٹ پڑے۔ وہ پیٹیں وہ چیخیں کہ اوساتوں میں آنا مشکل ہوگیا۔ جوں جوں ہمسائیاں صبر کی تلقین کرتیں یہ اور پچھنیاں کھاتیں۔ اور کسی طرح سانانوں میں نہ آتیں۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ آنکھیں روتیں اور جی ہنستا تھا۔ کونسا موئے سے لگا دیکھا تھا جو روتی۔ سوکن روتے میں چلی اور گز کا گھونگھٹ کاڑھ۔ گھونگھٹ۔ روئے من ہنسے میرا جیوڑا کرے کلیل۔ نفاست کے مرنے سے بن جنیوں میں آگئی۔ یہ قصہ مرزا نے ختم ہی کیا تھا کہ مرزا کے خسر کی چچی جو اس ریاست کے سب سے بڑے جاگیردار کی بہو تھیں۔ وہ کہنے لگیں میاں تم نے تو ایک قصہ سنایا اب ایک واقعہ اس بندی کا بھی سن لو۔ میرے خسر بڑے نواب صاحب بیمار پڑے اور ایک دن تو ایسی حالت ہوئی کہ سانسوں پر شمار ہوگیا۔ آخر دونوں وقت ملتے۔ ادھر چراغ میں بتی پڑی ادھر پٹ سے ان کا دم نکلا۔ ہم تین دیورانیاں جٹھانیاں تھیں۔ اور آپس میں بڑا اخلاص پیار۔ چاہیں کہ ہم آواز نکالیں۔ ہماری خوشدامن نے ایسی ہنکار سنائی کہ ہم تینوں بہوئیں دم بخود ہو کے رہ گئیاں۔ اور انہوں نے جھٹ باوا جان پر دوشالہ ڈال خود مودی خانے میں جا۔ جلدی سے روا نکالا گھی لیا۔ روا بھون۔ قند ڈال۔ کٹا ہوا میوہ ملا۔ ہریرہ بنایا۔ اور نکال بادیئے میں غٹ غٹ چڑھا گئیں۔ ہم یہ سب ان کے کرتب سمجھ گئے۔ انکی بہوؤں میں میں سب سے چھوٹی تھی میں نے اپنی جٹھانیوں سے کہا۔ کہ دیکھا بڑا صیلا کو اب یہ اپنا منہ تازہ کر فیل مچائیگی۔ چلو ہم بھی نیار ہو جائیں۔ ہم تینوں ہوا کی طرح بورچی خانے میں پہنچے۔ قورمے کی پتیلی بچی پکی تیار۔ اور اٹھارہ ٹیوں کی ٹوکری۔ کوٹھڑی میں گھس گئے۔ نکال بوٹے کے بوٹے اور ایک ایک روٹی کا ایک ایک نوالہ اور دو دو نوالے بنا اُتارنے شروع کئے۔ جھجری رکھ لی پاس۔ بھر بھر کٹورے پانی کے پاس دھرے۔ مارے جلدی کے نوالہ حلق میں پھنسے تو پانی کے گھونٹ سے اتار لیں۔ غرض خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور کواڑ کی آڑ میں سے اپنی ساس کو بھی دیکھتے جائیں۔ انہوں نے ہریرہ ختم کر کے ایک پانی کا کٹورا بھر پیا۔ اور چار پان کا بنا بیڑا جلدی جلدی اسے چبانا شروع کیا۔ جب وہ جبڑے کے قابو میں آگیا۔ کلہ تازہ کر۔ ایک دم ایسی چیخ کر آواز نکالی کہ ہے۔ ہے لوگو! وہ بندی بیوہ ہوگئی۔ ہے ہے اس بندی کا سرتاج۔ ہے ہے وہ بندی لٹ گئی۔ اور دھڑا دھڑ مارنے شروع کئے مسند کے تکیوں پر ہاتھ۔ ہمارے منہ روٹیوں پر اور آنکھیں ان پر تھیں۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ ریلا کر ایک پر ایک گرتی تینوں جنیاں پہلے کوٹھری کے کیواڑوں پر دھڑ دھڑ گریاں کہ کنڈی خوب بجی اس کے بعد چیختے دہاڑتے گاؤ تکیے پر وہ ہاتھ ملد مار کر رہے اور وہ بیان کئے۔ ادھر ہماری ساس ادھر ہم۔ ان کا تو پتلا ہریرہ ہو گیا جلد ہضم اور ہماری روٹیاں بوٹیاں رہی قائم۔ وہ تو گھنٹے دو گھنٹے میں ہی ہو ہلکان نولہ ہو پڑ گئیں۔ اور ہم تینوں وہ رات بھر بیان کرتے رہے کہ سارے شہر میں واہ واہ ہوگئی کہ بہوئیں ہوں تو سردار الملک کی جیسی۔ اور سسرے کو روئیں تو اس طرح کہ بیٹیاں بھی صدقے کی تھیں۔ انہوں نے یہ سارا قصہ اس مزے سے سنایا کہ ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور اس بناوٹی غم کے بعد جو پیٹ میں گدگدیا

ہو ہنسی کا سب کو دورہ پڑا تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور قہقہوں کی آواز خوابگاہ سے نکل کر کوٹھی کے باغ میں اور وہاں سے شاہراہ پر پہنچی۔ مرزا بچارے کو خیال ہوا کہ اگر رئیس کو اس کی اطلاع ہوئی کہ سردار صاحب کا داماد جان جوان سوتیلی بیوہ ساس کے ساتھ ان قہقہوں چہچہوں میں مصروف ہے تو غضب ہو جائیگا جوں جوں ہنسی کو ضبط کرتا اور بے قابو ہو کر ہنستا۔ ان ہنسی بول لگیوں میں ناشتہ کھانا اس طرح ہوا جیسے بیان ہو چکا۔ دوپہر کا کھانا بھی بات نباہنے کو نہ کھایا گیا۔ ہنسی سے بھوک اور کھلی کلیجہ ٹوٹا جا رہا تھا۔ مرزا نے صبر کیا کہ خیر رئیس کے پاس جب جائیں گے تو چار کا وقت ہوگا۔ تیسرے پہر وہاں خوب شکم سیر ہو لیں گے۔ دو بجے مرزا کوٹھی سے سواری میں بیٹھ اپنے سسرے کے مقبرے گیا۔ یہ اپنی پہلی بیوی کے پاس آسودہ ہیں چاروں طرف ایک چھوٹی سی باغیچی ہے۔ بیچ میں ایک سنگ رخام کا مجر ہے۔ مرزا نے فاتحہ دیں۔ مٹھائی تقسیم کی اور کوئی چار کے عمل میں رئیس کے محل میں پہنچا۔ رئیس کو اطلاع ہوئی۔ وہ حمام میں تھے۔ چاء بھجوائی۔ خوب میوہ اور کھانے کا سامان چاندی کی کشتیوں میں لگ کر آیا۔ اس وقت جس قدر درباری امیر اور مصاحب رئیس کے تھے وہ مرزا سے ہمدردی کر رہے تھے اور اس کے سسرے کے اخلاقوں کی تعریف اور رئیس سے تعلقات بیان کر رہے تھے۔ ابھی مرزا نے چاء کی پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ بھی نہ لیا تھا۔ کہ ان میں سے ایک بولا اچھی طرح چاء پیجئے تکلف نہ فرمائیے۔ دوسرا بولا۔ کیا کھایا پیا جائے۔ جب انسان کو غم ہوتا ہے۔ بھوک بند ہو جاتی ہے۔ کھایا کیا خاک جائے۔ سردار صاحب کے ہے۔ اور کون۔ یہی داماد ہی بیٹے۔ جتنا بھی رنج کریں تھوڑا۔ ایسی صورت میں کیا حلق سے اترے گا بچارے کے۔ مرزا یہ باتیں سن کر دم ہو گیا۔ اور بزرگوں کی جان پر صبر کر کے آدھی پیالی سسک سسک کر پی۔ ہاتھ روک لیا۔ اور کشتیاں ویسے ہی اٹھ چلدیں۔

آغا حیدر حسن (دہلوی)

فطرت اور انسان

Blow, blow. thouwinter wind
Thouart not so unkind
As mans in gratitude

شیکسپیر کا مشہور شعر ہے۔

اس شعر کا بے ساختہ ترجمہ ہو گیا ہے اس پر چاند اور موسموں کا اضافہ کر کے اصل سے مختلف حیثیت کی ایک نظم بنا دی ہے۔

چل اے جھونکے زمستاں اچل اور زور سے چل — تو سوز ہم سے احباب سے زیادہ نہیں
جلا خوشی سے جلا آفتاب تابستاں — کہ تجھ میں شائبۂ آتش عناد نہیں
برس برس بارش بے اعتبار مجھ سے بتر — وہ دوست جن کی وفا پر کچھ اعتماد نہیں

نثار۔ باد خزاں ابتری بے ایمانی پر — وہ جن کے ظاہر و باطن میں اتحاد نہیں
میں تیرا بندۂ احسان ہوں او نسیم بہار — کہ تو نے جو کئے احساں وہ تجھ کو یاد نہیں
اسد مظاہر قدرت کی سادگی کی قسم — فریب خوردۂ اہل زمانہ شاد نہیں

اسد ملتانی



حسرت اُن غنچوں پہ ھے جو بن کھلے مرجھا گئے.

CALCUTTA ART PG WORKS, LAHORE.

گریۂ حسرت

چھوڑ کر مجھ کو ہمیشہ کے لئے جاتے ہو کیوں؟
تم تو تھے آرامِ جاں پھر جاں کو تڑپاتے ہو کیوں؟

کیا مری قسمت، قیامت تک نہ پلٹا کھائے گی؟
کیا مجھے فرقت تمہاری عمر بھر تڑپائے گی؟

آہ! اِس دنیا میں راحت کا نشاں ملتا نہیں
اے مسرت! ہم کو تیرا آستاں ملتا نہیں

ہاں مگر امید سے روشن ہے ساری کائنات
ورنہ ظاہر ہے کہ کیا ہم اور ہماری کائنات

اِس فراقِ عارضی پر بے سبب روتے ہیں ہم
آہ کتنے بے خبر انجام سے ہوتے ہیں ہم

زندگی جب تک ہے اے جانِ حزیں غم کا گلہ؟
اِس زیاں خانے میں آکر بیش اور کم کا گلہ؟

آہ یہ تاریک، یہ منحوس گھر خالی مرا!
جانے والے! جا خدا حافظ، خدا والی ترا

اب ملیں گے ہم، تو مِل کر پھر جدا ہونگے نہ ہم
یوں جئیں گے ہم کہ جی کر پھر فنا ہونگے نہ ہم

حامد علی خاں

باغی

(یہ افسانہ سویڈن کی مشہور افسانہ نگار سلما لیگرلاف سے ماخوذ ہے جنہیں ۱۹۰۹ء میں ادبی قابلیت کی وجہ سے نوبل پرائز ملا۔)

ایک کسان نے ایک راہب کو مار ڈالا اور بھاگ کر جنگلوں میں چلا گیا۔ وہ باغی قرار دیا گیا۔ اور اُس کے سر کے لئے انعام مقرر کیا گیا جنگل میں اُسے ایک اور مجرم ملا۔ یہ ایک نوجوان ماہی گیر تھا جو کسی دور دراز جزیرے کا رہنے والا تھا۔ اُس پر مچھلیوں کا جال چرانے کا الزام تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے۔ ایک غار کو اُنہوں نے اپنا گھر بنا لیا۔ ایک جگہ کھانے پکانے لگے، اکٹھے بسر کو جانے لگے۔ اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے لگے۔ کسان کبھی جنگل سے باہر نہ جاتا تھا لیکن ماہی گیر جس کا جرم بہت بڑا نہ تھا اپنی پیٹھ پر شکار لاد کر گاؤں کے نواح میں بستی سے الگ تھلگ اور علیحدہ علیحدہ مکانوں تک ہو آیا کرتا تھا۔ سیاہ پہاڑی مرغ، چمکیلے پروں والی مرغیاں، ہرن اور لمبے لمبے کانوں والے خرگوش دے کر وہ لوگوں سے دودھ مکھن، تیروں کے پیکان اور کپڑے لے آیا کرتا اور ان چیزوں پر وہ دونوں گذر اوقات کرتے۔

وہ غار جس میں انہوں نے اپنا گھر بنایا تھا پہاڑ میں دور تک چلا گیا تھا۔ اُس کے منہ پر حفاظت کے لئے انہوں نے بڑی بڑی سلیں اور خاردار جھاڑیاں لگادی تھیں۔ اوپر پہاڑ کی بلندی پر چیڑ کا ایک دیو پیکر درخت کھڑا تھا جس کی پیچ در پیچ جڑیں اُن کے آتش دان کے دھوئیں کو اپنے ساتھ لپٹا کر اونچی اونچی بھاری بھاری ٹہنیوں تک لے جاتی تھیں اور وہاں اس کی سیاہی کو بہت کچھ جذب کر کے لوگوں کی نظروں سے چھپا کر ہوا میں ملا دیتی تھیں۔ اُن کے غار تک پہنچنے کے لئے اُس ندی کو عبور کرنا پڑتا تھا جو پہاڑ کی ڈھلوان سے یکا یک پھوٹ پڑی تھی۔ اُن کے تعاقب کرنے والوں کو کبھی خیال بھی نہ گزرا تھا کہ اس مسرور و نغمہ ریز آبجو کے اُدھر اوٹ میں اُن کا شکار رہے۔ اول اول اُن کی تلاش اس طرح کی گئی جیسے کسی وحشی درندے کی کی جاتی ہے۔ علاقے کے تمام کسان جمع ہو کر جنگل میں اس طرح پھرا کرتے جیسے وہ کسی بھیڑیے یا ریچھ کے شکار کے لئے نکلے ہیں۔ تیر کمان والے جنگل کو گھیر لیتے، اور برچھیوں والے جنگل کی جھاڑی جھاڑی اور پہاڑ کا کونا کونا چھان مارتے۔ دونوں باغی خوف کے مارے دبک کر اپنے تاریک غار میں بیٹھے رہتے۔ اور کانپ کانپ کر دشمنوں کا شور و غل اور نعرے سنا کرتے۔ حتیٰ کہ وہ اُن کے پاس سے گذر جاتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دن بھر ماہی گیر بے حس و حرکت غار میں پڑا رہا۔ لیکن قاتل اس عذاب کو برداشت نہ کر سکا اور باہر نکل آیا۔ جہاں سے وہ اپنے دشمنوں کو دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے بھی اس کو دیکھ لیا، اور اس کے پیچھے دوڑے۔ لیکن وہ اس حالت

کو بزدلانہ خوف میں پڑے رہنے پر ہزار بار ترجیح دیتا تھا۔ وہ ندیوں کو پھاندتا۔ غاروں میں کودتا، پہاڑوں کی عمودی دیواروں پر چڑھتا اُن کے آگے آگے بھاگتا رہا۔ خطرے کے تازیانے کے نیچے اُس کی حیرت انگیز قوت اور چالاکی پیدا ہوگئی۔ اُس کے بدن میں فولاد کی کمانی جیسی لچک پیدا ہوگئی۔ اُس کا ہر قدم جم کر پڑتا تھا۔ اس کی ہر گرفت مضبوط ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں اور کان پہلے سے دُگنے تیز ہو گئے تھے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے دشمنوں کی ہلکی سے ہلکی سرگوشی کے معنی سمجھتا تھا ہر بڑے پتھر کی اوٹ اُسے مشتبہ معلوم ہوتی تھی۔

جب وہ دوڑتا ہوا کسی چوٹی کے اوپر پہنچ جاتا تو نیچے اپنے تعاقب کرنے والوں پر ایک نگاہ ڈالتا اور حقارت آمیز الفاظ سے ان کو پکارتا اور اپنی طرف بلاتا۔ جب اُن کی برچھیاں فضا میں تیرتی ہوئی اُس تک پہنچتیں تو وہ اُن کو پکڑ لیتا اور پھر انہیں کی طرف دے پھینکتا۔ جب وہ خاردار جھاڑیوں کو چیرتا ہوا اپنا راستہ بناتا تو کوئی اپنے اندر اس کو ایک مسرور اور آزاد نغمہ گاتا ہوا سنائی دیتا۔ پہاڑ کی ایک بے برگ و گیاہ چوٹی جنگل میں سے سر نکالے ہوئے کھڑی تھی اور اس کے عین اوپر چیڑ کا ایک نہایت بلند درخت تھا۔ اس کے بھورے سرخ تنے پر دور تک کوئی ٹہنی نہ تھی۔ چوٹی کے قریب پہنچ کر گھنی شاخوں میں ایک باز کا گھونسلا تھا۔ خونی ایسا بے خوف ہوگیا تھا کہ ایک دن وہ اس گھونسلے میں جا کر چھپ گیا۔ اور اُس کے تعاقب کرنے والے اُسے نیچے جنگلی گھاٹیوں میں ڈھونڈتے رہے۔ لوگ اُس کی تلاش میں شور و غل مچا رہے تھے اور وہ اوپر بیٹھا باز کے بچوں کی گردنیں مروڑ رہا تھا۔ بڑے پرندے غصے اور اضطراب میں چیخ چیخ کر اُس کے آس پاس چکر لگاتے تھے اور رہ رہ کر اس کے سر کو نوچ لینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی تیز چونچوں سے اس کی آنکھوں پر حملہ آور ہوتے، اپنے مضبوط بازوؤں سے اس کو تھپیڑ لگاتے اور اپنے پنجوں سے اس کے سخت موسم زدہ چمڑے کو بُری طرح زخمی کرتے۔ مگر خونی ہنس ہنس کر ان کے ساتھ لڑتا رہا۔ اِس جنگ کی خوشی میں تعاقب کرنے والوں کا اسے خیال تک نہ رہا اور دو بجا یک کھڑے ہو کر اپنے خنجر سے پرندوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ جب پھر اسے اپنے دشمنوں کا خیال آیا تو اُس نے مڑ کر دیکھا: لوگ کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ تعاقب کرنے والوں میں سے کسی نے اس خوفناک بلندی کی طرف نگاہ نہ اٹھائی تھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ایسے وقت میں جب کہ اُس کا پیمانۂ حیات چھلک جانے کے قریب ہے وہ خوشی کے نشے میں چور ایک طفلِ مکتب کی طرح پرندوں سے کھیل رہا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو محفوظ پا کر بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اُس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک شاخ کو پکڑا۔ اُس بلندی سے جہاں وہ نامعلوم طور پر چڑھ گیا تھا اُس نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ نیچے کی طرف نگاہ کی۔ کیا ہو اگر وہ یہاں سے گر جائے...... اگر پرندے اس کی آنکھیں نکال ڈالیں...... اگر اُس کے دشمن اسے دیکھ لیں؟ ہر ممکن اور ناممکن خطرے کے خیال سے مرعوب ہو کر وہ کانپتا ہوا درخت سے اتر آیا۔ وہ زمین پر چت لیٹ گیا اور پھسلنے پتھروں پر سے رینگتا ہوا پہاڑ سے نیچے آ رہا۔ وہاں وہ کمزور و ناتواں ہو کر چیڑ کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی گھنی ہوئی شاخوں کی اوٹ میں نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ اُس وقت ایک اکیلا آدمی بھی اُس کو گرفتار کر سکتا تھا۔

× × × × × × × × × ×

ماہی گیر کا نام ٹارڈ تھا۔ اُس کی عمر سولہ سال تھی لیکن وہ خوب مضبوط اور دلیر تھا۔ اب اُسے جنگل میں رہتے پورا ایک سال ہوگیا تھا۔

کسان کا نام برگ تھا، اور لوگ اسے "جن" کہا کرتے تھے۔ وہ خوبصورت اور وجیہ تھا۔ سارے علاقے میں اُس کا سا قدآور اور مضبوط آدمی موجود نہ تھا اُس کا سینہ خوب کشادہ اور کمر چیتے کی طرح پتلی تھی۔ اُس کے ہاتھ خوبصورت اور نازک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کبھی کوئی سخت کام نہیں کیا۔ اُس کے بال بھورے تھے اور چہرے پر ایک ملاحت سی تھی۔ جب جنگل میں رہتے سہتے اُسے ایک عرصہ گزر گیا تو اُس کی صورت میں ایک رعب اور ہیبت پیدا ہوگئی۔ بھری ہوئی کشادہ پیشانی اور گھنی بھووں کے نیچے اُس کی آنکھوں میں دل کے اندر اتر جانے والی ایک تیزی پیدا ہوگئی۔ اُس کے ہونٹ اپنی جگہ پر پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے نظر آنے لگے۔ اُس کے چہرے میں کنپٹیوں کے زیادہ گہرا ہوجانے کے باعث اور سختی پیدا ہوگئی اور اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں طور پر باہر نکل آئیں۔ اُس کے تمام اعضائے جسم کی نرمی مفقود ہوگئی لیکن اُس کے پٹھے فولاد کی طرح مضبوط ہوگئے۔

ٹارڈ نے ایسا شاندار اور طاقتور انسان اور کوئی نہ دیکھا تھا۔ اُسے برگ کے قامت میں کوہ کی بلندی اور جسم میں طوفان کی طاقت نظر آتی تھی۔ وہ ایک مالک اور آقا کی طرح اُس کی خدمت کرتا۔ اور ایک دیوتا کی طرح اُسے معزز جانتا تھا۔ شکار میں وہی برچھی بھالے اُٹھا کر چلتا، وہی شکار اُٹھا کر گھر لاتا، وہی پانی بھرتا، وہی آگ جلاتا۔ دیو قامت برگ اُس سے یہ تمام خدمات لیتا لیکن شاذ و نادر ہی اُس کے لئے کوئی مہربانی کا کلمہ منہ سے نکالتا۔ وہ اُسے ایک چور سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتا۔

باغیوں کا گزارا لوٹ مار پر نہ تھا بلکہ وہ پرندوں اور مچھلیوں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اگر برگ نے کسی مقدس آدمی کو قتل نہ کیا ہوتا تو لوگ کبھی کے اُن کے تعاقب سے تنگ آگئے ہوتے، اور اُنہوں نے انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا، لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اگر ایک خادمِ دین کے خون کا بدلہ نہ لیا گیا تو اُن کے دیہات پر خبر نہیں کیا آفت آئے۔ جب ٹارڈ شکار لے کر وادی میں جاتا تو لوگ اُسے روپے اور معافی کا لالچ دے کر برگ کے مسکن کا پتہ پوچھتے۔ لیکن وہ انکار کر دیتا، اور جب وہ اُس کے پیچھے پیچھے چل دیتے تو وہ اُن کو اُس وقت تک جنگل میں بھٹکاتا پھرتا کہ آخر وہ تھک کر واپس چلے جاتے۔

ایک دفعہ برگ نے اُس سے پوچھا کہ "کیا جب تم گاؤں میں جاتے ہو تو لوگ تمہیں مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟" تو ٹارڈ نے جواب دیا "ہاں، وہ مجھے ایک بہت بھاری رقم دینے کا وعدہ کرتے ہیں؟" اس پر برگ نے حقارت سے کہا "کتنا احمق لڑکا ہے جسے روپے کی قدر و قیمت بھی معلوم نہیں!" ٹارڈ نے اُس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں کوئی ایسی جھلک تھی جو دیو قامت برگ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جوانی کے دنوں میں کسی حسین عورت کی نگاہوں میں بھی اُسے وہ سحر نظر نہ آیا تھا، اپنے بچوں کی آنکھوں میں اپنی بیوی کی نظروں میں بھی اُس نے وہ محبت نہ دیکھی تھی جو اُسے ٹارڈ کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "تم میرے خدا ہو، میرے حاکم۔ میں نے تمہیں اپنی آزاد روح پر حکومت کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے۔ تم میرے سر کو حقارت سے

ٹھکراتے ہو، ٹھکرا دو۔ مجھے مارو اگر تم چاہو، لیکن میں تم سے کبھی بے وفائی نہ کروں گا"

اس کے بعد برگ نے پہلی سی بے التفاتی چھوڑ دی۔ ٹارڈ اپنے عمل میں اب کچھ اَور دلیر ہو گیا لیکن اُس کی گفتگو میں حیا بدستور باقی رہی۔ موت کا خوف اب اُس کے دل پر معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر یخ بستہ جھیلوں پر چلا کرتا، دھوکے میں ڈالنے والی دلدلوں سے گزرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے خطرے میں پڑ کر لطف حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ سمندر کے وحشی طوفان سے نبرد آزما ہونے کا اب اُسے موقع نہ ملتا تھا اس لئے وہ اپنے حریفانہ ذوق کی تسکین اب انہی باتوں سے کرتا تھا۔ لیکن رات کے وقت وہ جنگل کی تاریکی سے ڈرا کرتا تھا، بلکہ دن کو گنجان درختوں کے گھرے سائے سے بھی اُسے خوف آتا تھا۔ جب برگ اُس سے اس کی وجہ دریافت کرتا تو وہ کچھ حیران سا ہو جاتا۔

ٹارڈ انگیٹھی کے قریب بستر میں نہ سوتا تھا بلکہ ہر شب جب برگ سو جاتا وہ آہستہ آہستہ سرک کر دروازے کے قریب ایک بڑے پتھر پر آ لیٹتا۔ برگ کو یہ بات معلوم ہو گئی اور اگرچہ اُس کے ذہن میں اس کی وجہ بھی آ گئی تھی تاہم اُس نے ٹارڈ سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ ٹارڈ نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس کے بعد مزید سوالات سے بچنے کے لئے وہ دو تین دن بستر میں سوتا رہا لیکن پھر دروازے کے قریب اپنی اصلی جگہ پر آ گیا۔

ایک رات برف کا شدید طوفان آیا۔ ایسا طوفان کہ درختوں کے گھنے سایوں میں بھی برف کے انبار لگ گئے۔ اُس رات باغیوں کے غار میں بھی برف آ گھسی۔ ٹارڈ صبح اُٹھا تو اُس نے اپنے آپ کو پگھلتی ہوئی برف کی ایک چادر میں لپٹا ہوا پایا۔ اس کے دو دن بعد وہ سخت بیمار ہو گیا۔ وہ سانس لیتا تھا تو درد کی ٹیسیں اُس کے پھیپھڑوں کو چیرتی ہوئی اٹھتی تھیں۔

جب تک اُس کی قوت نے اُس کا ساتھ دیا وہ درد کو برداشت کرتا رہا، لیکن ایک شام وہ آگ میں پھونک مارنے کے لئے جھکا تو وہیں گر گیا اور پھر اُس سے اٹھا نہ گیا۔ برگ اُس کے پاس آیا اور اُس سے گرم بستر میں چلنے کے لئے کہنے لگا۔ ٹارڈ نے کوئی حرکت نہ کی، صرف اُس کے گلے سے کراہنے کی سی آواز نکل رہی تھی۔ برگ نے اس کو اٹھا کر بستر میں پہنچا دیا۔ جب وہ اسے اٹھا رہا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک نفرت انگیز سانپ کو اُٹھا رہا ہے، اور اُسے اپنے منہ کا مزا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے مرے ہوئے گھوڑے کا گوشت کھا لیا ہے۔ ایک ادنیٰ چور کے جسم کو چھوتا اُسے سخت ناگوار تھا۔ برگ نے اُسے اپنا ریچھ کی کھال کا کمبل اوڑھا دیا اور اُسے پانی لا کر پلایا۔ یہی کچھ اُس کے امکان میں تھا، لیکن بیماری زیادہ خطرناک نہ تھی اور ٹارڈ جلد ہی صحت یاب ہو گیا۔ اب جب کہ برگ کو چند روز کے لئے اُس کی تیمارداری اور اُس کے حصے کا کام کرنا پڑا تھا وہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ جب وہ دونوں آگ کے سامنے بیٹھ کر تیر تراشتے تھے تو ٹارڈ کبھی کبھی برگ کے ساتھ گفتگو کر لیتا تھا۔

ایک دفعہ شام کا وقت تھا۔ ٹارڈ نے کہا "برگ، تم ایک اچھے خاندان میں سے ہو۔ تمہارے رشتہ دار وادی کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔ تمہارے آباؤ اجداد نے بادشاہوں کی خدمات انجام دی ہیں اور بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں"

برگ نے جواب دیا "ہاں انہوں نے بڑے بڑے سرکشوں کو زیر کیا ہے اور بڑے بڑے بادشاہوں کو نیچا دکھایا ہے"۔

ٹارڈ نے پھر کہا "تمہارے باپ دادا کرسمس کے دنوں میں عظیم الشان دعوتیں دیا کرتے تھے اور تم نے بھی جب تم اپنے گھر میں تھے۔ ایسی ہی دعوتیں دی ہیں۔ سینکڑوں مرد اور عورتیں تمہارے وسیع ہال کی بنچوں پر بیٹھ سکتے تھے ——— وہ ہال جو سینٹ اولف کے یہاں آنے سے قبل تعمیر ہوا تھا۔ شربت سے بھری ہوئی چاندی کی بڑی بڑی صراحیاں اور بڑے بڑے پیالے تمہاری میزوں پر گردش کیا کرتے تھے"۔

برگ نے پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں لئے اور اپنے گھنگریالے بالوں کو پیچھے کی طرف سنبھالے بستر کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ بیماری کی وجہ سے زرد اور صاف ہو گیا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بخار کے شعلے چمک رہے تھے۔ اُس کے تصور میں برگ کے عظیم الشان ہال، اُس کی نقرئی صراحیوں اور پیالوں، اُس کے بیش قیمت لباس والے مہمانوں، اور خود برگ کی ذی مرتبہ شخصیت کی تصویریں کھنچ رہی تھیں اور وہ ان تخیلات میں محو آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ برگ نے محسوس کیا کہ اُس کے اُن شوکت و شان کے دنوں میں بھی کسی نے اُس کی طرف ایسی عزت و احترام کے جذبات سے چمکتی ہوئی نظروں سے نہ دیکھا تھا جس طرح آج یہ لڑکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اِن نظروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا لیکن اس کے باوجود ایک بیزاری کا سا احساس اُس پر طاری تھا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ ایک ادنیٰ چور کو میری عزت اور تعریف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اُس نے کہا "کیا تمہارے ہاں دعوتیں نہیں ہوتی تھیں؟"

ٹارڈ ہنس پڑا اور کہنے لگا "اُن پہاڑی چٹانوں میں جہاں میرے ماں اور باپ رہتے ہیں؟ باپ طوفان زدوں کو لوٹتا ہے اور ماں جادوگرنی ہے۔ جب موسم طوفان آلود ہوتا ہے تو وہ ایک دریائی بچھڑے پر چڑھ کر جہازوں کی طرف جاتی ہے، اور جن بدقسمتوں کو طوفان کے تھپیڑے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے ہیں اُن کی مالک وہ ہوتی ہے"۔

برگ نے پوچھا "وہ اُن کو کیا کرتی ہے"۔

ٹارڈ نے کہا "تمہیں معلوم نہیں جادوگرنیوں کو ہمیشہ نعشوں کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ اُن کو اپنا غلام بناتی ہے یا شاید وہ ان کو کھاتی ہے۔ چاندنی راتوں کو وہ وحشی لہروں پر سوار ہو جاتی ہے اور سمندر میں ڈوبے ہوئے بچوں کی آنکھیں اور انگلیاں تلاش کرتی ہے"۔

برگ نے کہا "آہ کتنی دہشت ناک بات ہے!"

ٹارڈ نے اطمینان کے لہجے میں جواب دیا "ہاں عام لوگوں کے لئے۔ لیکن ایک جادوگرنی کے لئے نہیں۔ وہ تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتی"۔

برگ کے لئے یہ بات زندگی کو ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر سے دیکھنے کے مترادف تھی۔ اُس نے جلدی سے سوال کیا

تو گویا جس طرح جادوگرنیاں جادو کرنے پر مجبور ہیں اسی طرح چور بھی چوری کرنے پر مجبور ہیں ؟"

لڑکے نے جواب دیا "ہاں کیوں نہیں ہر شخص جس بات کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اُسے مجبوراً کرنی پڑتی ہے" لیکن ایک حیا آمیز شرارت سے بھری ہوئی مسکراہٹ نے اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا خم ڈال دیا، اور اُس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا "مگر دنیا میں ایسے چور بھی ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی"۔

برگ نے کہا "اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

ٹارڈ ابھی اُسی پُراسرار طریق پر مسکرا رہا تھا، اور اپنے ساتھی کو ایک معمے میں ڈال کر خوش معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کہا "جس طرح بعض پرندے اڑتے نہیں اُسی طرح بعض چور چراتے نہیں"۔

برگ نے اُس کے معمے کا مطلب معلوم کرنے کے لئے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیکر کہا "ایسے شخص کو چور کیسے کہا جا سکتا ہے جس نے کبھی چوری کی ہو"

ٹارڈ کے ہونٹ مضبوطی سے آپس میں مل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس معاملے کے متعلق زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ ذرا سے وقفے کے بعد اُس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ نکل گئے "لیکن اگر کسی کا باپ چوری کرتا ہو تو ــــ"

برگ نے کہا "آدمی کو مکان یا روپیہ تو ورثے میں مل سکتا ہے لیکن چور تو اُسی کو کہیں گے جس نے خود چوری کی ہو"

ٹارڈ نے ہنس کر جواب دیا "لیکن اگر کسی کی ایک ماں ہو اور وہ ماں اُس کے پاس آکر روئے چلائے اور کہے کہ اپنے باپ کا جرم اپنے سر لے لو، اور وہ شخص جلاد کا منہ چڑا کر جنگل میں بھاگ نکلے تو اُس کو تم کیا کہو گے۔ آہ، انسان ایک مچھلیوں کے جال سے کئے بھی جسے اُس نے کبھی دیکھا تک نہ ہو باغی فرار پا سکتا ہے"۔

برگ نے اپنی مٹھی نہایت غصے کے ساتھ پتھر کی میز پر ماری۔ "دیکھو، اس طاقتور اور خوبصورت لڑکے نے اپنی تمام زندگی ایک دوسرے شخص کے لئے برباد کر دی۔ اپنے بھائی بندوں کی محبت، دولت، عزت ہر شے سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو محروم کر دیا اور خوراک اور لباس کی بیہودہ پریشانیوں کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور یہ احمق کم بخت برگ سے ایک معصوم انسان کی تحقیر کراتا رہا"۔

وہ اُسے نہایت سختی کے ساتھ برا بھلا کہہ رہا تھا لیکن ٹارڈ پر اُس کے غصے کا اثر اُس سے زیادہ نہ تھا جتنا ایک بیمار بچے کو اپنی ماں کی ہمدردانہ زجر و توبیخ کا ہوتا ہے۔

× × × × × × × ×

وسیع و عریض جنگلی پہاڑیوں میں سے ایک کے اوپر دلدل سے بھری ہوئی ایک سیاہ جھیل تھی۔ یہ چوکور شکل کی تھی اور اس کے کنارے ایسے سیدھے اور کونے ایسے تیز تھے کہ معلوم ہوتا تھا انسانی ہاتھوں نے تراش کر اسے بنایا ہے۔ اس کے تین طرف سیدھی چٹان کی تین دیواریں اُٹھی ہوئی تھیں اور پتھروں سے چمٹے ہوئے بے شمار پہاڑی چیڑ کے بلند قامت درخت کھڑے تھے جن کی جڑیں انسانی بازوؤں کے برابر موٹی تھیں جھیل کی سطح کے قریب، جہاں تھوڑی تھوڑی دور تک پانی

کے تھپیڑوں نے گھاس کو نابود کردیا تھا، یہ ننگی جڑیں اس طرح پیچ وخم کھا کر پانی سے باہر نکلی ہوئی تھیں جیسے ہزاروں سانپ لہروں سے بچنے کے لئے باہر نکل رہے ہوں اور اسی کشمکش میں متحجر ہو کر رہ گئے ہوں یا یہ مدتوں کے ڈوبے ہوئے عفریتوں کے سیاہ شدہ ڈھچر تھے جن کے وجود سے جھیل اپنے آپ کو پاک کرلینا چاہتی تھی؟ بازو اور ٹانگیں شدت تشنج سے خم کھا گئی تھیں۔ لمبی لمبی انگلیوں نے چٹان کے پتھروں کو اپنے چنگل میں گرفتار کرلیا تھا اور عظیم پسلیاں محرابیں بن گئی تھیں جن کے سہارے قدیم درخت کھڑے تھے لیکن وقتاً فوقتاً یہ آہنی بازو، یہ فولادی انگلیاں جن کے بل پر یہ بلند و بالا پیڑ استادہ تھے۔ اپنی گرفت ڈھیلی کردیتی تھیں اور پھر شمال کی تیز ہوا درخت کو اٹھا کر جھیل کے اندر پھینک دیتی تھی، جہاں اس کی شاخوں کا تاج میلے پانی اور کیچڑ میں جا دھنستا تھا۔ درخت کی ٹہنیوں میں جھیل کی مچھلیوں کو چھپنے کے لئے نہایت اچھی جگہ مل جاتی تھی لیکن اُس کی جڑیں کسی گھناؤنے دیو کی باہوں کی طرح پانی سے باہر نکل کر جھیل کی سطح کو کریہ المنظر بنا دیتی تھیں۔

جھیل کی چوتھی جانب پہاڑوں کی سطح ڈھلوان تھی۔ یہاں ایک چشمہ نکلتا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس چشمے کا پانی نہر بن کر اپنا ایک راستہ بنائے وہ ناہموار زمین پر بیسیوں پیچ وخم کھا کر ننھے ننھے جزیروں کی ایک بستی آباد کردیتا تھا جن میں سے بعض تو اتنے چھوٹے تھے کہ ان پر بمشکل ایک پاؤں ٹک سکتا تھا اور بعض اتنے بڑے کہ اُن پر بیس بیس درخت اُگ رہے تھے اِس جگہ جہاں چٹانیں اس قدر بلند نہ تھیں کہ دھوپ کو کلیتہً روک دیتیں ہلکے ہلکے پتّوں والے درخت، سرسبز جھاڑیاں اور خوشبودار پھول بھی اُگے ہوتے تھے جھیل کے قریب لمبی لمبی گھاس کا ایک جنگل تھا جس کی بلندی آدمی کے قد کے برابر تھی اور اس میں سے سورج کی روشنی اسی طرح سبز ہو کر پانی پر پڑتی تھی جس طرح وہ حقیقی جنگل کی زمین پر اپنا عکس ڈالتی ہے۔ انہیں سرکنڈوں کے درمیان کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جوہڑ بھی تھے جن میں نیلوفر کے سفید سفید پھول ایک عالمِ خواب میں تیرتے تھے اور اِس حسنِ حساس کو جو غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں موند لیتا ہے گھاس کی لمبی لمبی پتیاں عجیب دلربایانہ انداز سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن کہ فضا نہایت روشن تھی باغی مچھلیاں پکڑنے کے لئے اسی قسم کے ایک جوہڑ پر آ نکلے۔ وہ سرکنڈوں میں سے گزر کر دو اونچے پتھروں پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے کانٹے پانی میں ڈال کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ دو آدمی جن کی زندگی اب کلیتہً جنگلوں اور پہاڑوں میں گذر رہی تھی اس درجہ فطرت کی قوتوں کے اختیار میں آ گئے تھے کہ اُن میں اور پرندوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا سورج چمکتا تھا تو ان کی طبیعتیں بھی شگفتہ اور مسرور ہو جاتی تھیں، لیکن شام ہوتی تھی تو وہ خاموش ہو جاتے تھے اور رات کا تو ان پر اس قدر غلبہ ہوتا تھا کہ اُس وقت ان کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ اس وقت اُس سبز روشنی نے جو گھاس میں سے چھن چھن کر پانی پر پڑتی تھی اور پانی میں سے پیلی سبز اور سنہری کرنیں بن کر واپس آتی تھی اُنہیں کچھ مسحور سا کردیا۔ اُن کا تعلق بیرونی دنیا سے بالکل منقطع ہو چکا تھا۔ گھاس کی لمبی لمبی پتیاں ہلکی ہلکی نسیم میں لہراتی تھیں، ایک دوسری سے بج کر ایک دھیما دھیما نغمہ پیدا کرتی تھیں اور آہستہ آہستہ اُن کے چہروں کو آکر چھوتی تھیں۔ وہ اپنی بھوری کھالیں پہنے بھورے رنگ کے پتھروں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ لوا کر [illegible] کے لباس کا رنگ اور پتھروں کا رنگ گویا کہ ایک ہو گیا تھا۔ دونوں ساتھ

آمنے سامنے بیٹھے پتھر کے بتوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے گھاس کے اندر اُن کو رنگ برنگ کی بڑی بڑی مچھلیاں تیرتی چمکتی اور جھلملاتی نظر آتی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی ڈوریاں پانی میں پھینکیں اور لہروں کے ملقے بن بن کر پھیلنے لگے تو انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے پانی کی حرکت لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ اس حرکت کا باعث اکیلے وہی نہیں ہوتے بلکہ پانی کے نیچے گہرائی میں ایک جل دیوی سو رہی ہے جس کا آدھا جسم انسان کا ہے اور آدھا مچھلی کا۔ اس کا منہ اوپر کی طرف ہے، اور لہریں اس سے اس طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ وہ اسے پہلے نہیں دیکھ سکے۔ پانی کی سطح اسی کے سانس سے متحرک تھی۔ لیکن اسے وہاں موجود پاکر باغیوں کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اور جب کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے غائب ہو گئی تو وہ نہ بتا سکتے تھے کہ انہوں نے اسے خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔

سبز روشنی اُن کی آنکھوں سے گزر کر اُن کے دماغوں پر ایک ہلکے سے نشے کا سا اثر کر رہی تھی۔ اُن کا تخیل اُن کے سامنے عجیب و غریب تصویریں بنا رہا تھا، ایسی تصویریں جن کے متعلق وہ ایک دوسرے کو کبھی کچھ نہ بتاتے تھے۔ اُس روز انہیں کوئی شکار نہ ملا۔ تمام دن خوابوں اور خیالوں میں گزر گیا۔

یکایک سرکنڈوں میں سے چپوؤں کی آواز آئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ایک بھاری سی کشتی نمودار ہوئی جو ایک درخت کا تنا تراش کر بنائی گئی تھی۔ کشتی کو ایک نوجوان لڑکی چلا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں چپوؤں کی بجائے پتلی پتلی چھڑیاں تھیں۔ وہ نیلوفر کے پھول اکٹھے کر رہی تھی۔ اُس کے بال لمبے لمبے اور گہرے سنہری رنگ کے تھے۔ اُس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی زردی تھی جس میں ہلکے گلابی رنگ کی جھلک نظر آتی تھی اُس کے رخساروں پر بھی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ رنگت نہ تھی۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر کسی قدر سرخی نمایاں تھی۔ اُس نے سفید کتان کی قبا پہن رکھی تھی جس پر ایک سونے کے بندوالی چرمی پیٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ اُن کے پاس سے بغیر اُن کی طرف دیکھے گذر گئی۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ انہیں اپنے ظاہر ہو جانے کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا اُس کے بے خلل نظارے کا شوق تھا جب وہ چلی گئی تو پتھر کے بت پھر آدمی بن گئے اور مسکرائے۔

ایک نے کہا اُس کا چہرہ نیلوفر کی طرح سفید تھا، اور اُس کی آنکھیں اُس پانی کی طرح سیاہ تھیں جو جیبڑوں کی جڑوں میں ہمارے سامنے چمک رہا ہے۔

وہ دونوں اس قدر خوش تھے کہ اُنہیں بے اختیار ہنسی آ رہی تھی، ایسی ہنسی جیسی وہ اس جھیل پر آکر اس سے پہلے کبھی نہ ہنسے تھے، ایسی ہنسی جو چٹان کی دیواروں کے ساتھ ٹکرائے تو جیبڑوں کی جڑوں کو ڈھیلا کر دے۔

برگ نے پوچھا "کیا وہ خوبصورت تھی"؟

ٹارڈ نے کہا "وہ اتنی جلدی گزر گئی کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن شاید وہ خوبصورت تھی"۔

"غالباً تمہیں اُس کی طرف دیکھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔ کیا تم نے خیال کیا تھا کہ وہ جل دیوی ہے"؟

اس کے بعد پھر انہوں نے ہنسنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔

x x x x x x x x

بچپن میں ٹارڈ نے ایک ڈوبے ہوئے آدمی کو دیکھا تھا۔ اُس کی لاش سمندر کے کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ دن کے وقت اُسے اس سے بالکل خوف نہ آیا، لیکن رات کو اُسے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی نظریں سمندر پر جمی ہوئی ہیں اور سمندر کی ایک ایک لہر مردہ اجسام کو اٹھا اٹھا کر اُس کے پاؤں میں پھینک رہی ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ چٹانیں اور جزیرے ڈوبے ہوئے آدمیوں سے پٹے پڑے ہیں، ڈوبے ہوئے آدمی جو مر چکے ہیں لیکن حرکت کرتے ہیں اور بولتے ہیں، اور اسے اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے ڈراتے ہیں۔

یہی حالت اب ہوئی وہ لڑکی جسے اُس نے کشتی میں دیکھا تھا اُسے خواب میں نظر آئی۔ اب وہ اس سے جھیل کی تہ میں ملا۔ جہاں روشنی جنگل کی روشنی سے بھی زیادہ سبز تھی اور جہاں اُس کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے کافی وقت تھا کہ وہ خوبصورت ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ جھیل کے عین درمیان چیڑ کے ایک بہت بڑے درخت کی جڑوں پر بیٹھا ہوا ہے اور درخت متحرک ہے، کبھی وہ نیچے چلا جاتا ہے اور کبھی پھر پانی کی سطح کے اوپر آ جاتا ہے۔ پھر اُس نے اُس لڑکی کو ایک نہایت ہی چھوٹے سے جزیرے پر دیکھا وہ ایک سرخ پہاڑی درخت کے نیچے کھڑی اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ آخری خواب میں وہ آپس میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ لڑکی نے اُس کا منہ چوم لیا تھا لیکن اس وقت صبح ہو چکی تھی اور اُسے برگ کے جاگنے کی آواز آ رہی تھی، لیکن وہ اپنی آنکھیں نہ کھولتا تھا تاکہ کچھ دیر اور اس نظارے سے لطف اندوز ہو سکے۔ جب وہ جاگا تو اس خواب کے اثر سے اس کی آنکھیں چوندھیائی ہوئی سی تھیں اور اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ کل سے آج وہ زیادہ اس لڑکی کے خیال میں محو رہا۔ شام کے قریب اُس نے برگ سے پوچھا "کیا تمہیں اُس لڑکی کا نام معلوم ہے؟"

برگ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ تم جلد سے جلد اُس کا نام جان جاؤ۔ اُس کا نام اَن ہے اور وہ میری رشتہ دار ہے!"

اب ٹارڈ کو معلوم ہوا کہ اسی زرد رو حسینہ کی وجہ سے برگ جنگلوں اور پہاڑوں کی یہ وحشیانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے حافظے پر زور ڈال کر وہ اُن باتوں کو یاد کرنے لگا جو اُس نے کبھی اس عورت کے متعلق سنی تھیں۔

اَن ایک آزاد کسان کی لڑکی تھی۔ اُس کی ماں مر چکی تھی اور اپنے باپ کے گھر میں اب اُسی کی حکومت تھی۔ وہ مطمئن تھی کیونکہ وہ ایک خود مختار فطرت کی مالک تھی اور شادی کر کے اپنے شوہر کی محکوم نہ بننا چاہتی تھی۔ اَن برگ کی عم زاد بہن تھی، اور یہ افواہ مدت کی پھیلی ہوئی تھی کہ برگ کو اپنے گھر کی بہ نسبت اَن اور اُس کی سہیلیوں کے پاس رہنا زیادہ پسند ہے۔ ایک کرسمس کے دن جب کہ برگ کے ہال میں ایک عظیم الشان دعوت ہونے والی تھی، اُس کی بیوی نے ایک راہب کو مدعو کیا جس سے اُسے توقع تھی کہ وہ برگ کو اُس کی اس غلط روش سے آگاہ کرے گا کہ ایک دوسری عورت کے لئے اپنی بیوی سے بے پروائی کرنا کتنا بُرا ہے۔ برگ اس کے علاوہ دوسر

لوگ بھی اس راہب سے سخت نفرت کرتے تھے کیونکہ اُس کی شکل صورت اچھی نہ تھی۔ وہ نہایت جسیم تھا اور اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ اُس کے گنجے سر پر بالوں کا حلقہ، اُس کی گیلی گیلی آنکھوں پر گھنی گھنی بھویں، اُس کا چہرہ اُس کے ہاتھ اور اُس کے کپڑے سب سفید تھے۔ لوگ اکثر اُس کی طرف دیکھ کر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

لیکن راہب ایک بے خوف آدمی تھا؛ اور چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زیادہ آدمیوں کے سامنے کہے ہوئے الفاظ زیادہ وزنی ہوتے ہیں، اس لئے وہ اٹھا اور کہنے لگا "لوگ کوئل کو حد درجے کا بے حمیت پرندہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے بچے دوسروں کے گھونسلوں میں نکالتی ہے لیکن ایسا آدمی جو اپنے گھر بار اور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر کسی غیر عورت کی ذات میں اپنی مسرت کو ڈھونڈتا ہے، میں اسے پرلے درجے کا بے حمیت انسان سمجھتا ہوں۔" آن، اُٹھی اور چلا کر کہنے لگی "برگ یہ بات تم سے اور مجھ سے کہی گئی ہے میں نے ایسی ذلت کبھی نہ اٹھائی تھی۔ افسوس، میرا باپ یہاں نہیں ورنہ وہ مجھے اس توہین سے بچا لیتا"۔ یہ کہہ کر وہ جانے لگی، لیکن برگ اُس کے پیچھے دوڑا۔ آن نے کہا "خبردار، اب میرے پاس مت آؤ۔ میں اب کبھی تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی"۔ وہ نہ رکا اور برآمدے میں آ کر اُس نے اُسے ٹھیرالیا، اور پوچھا کہ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ تمہیں خود اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ تم کیا کرو۔ چنانچہ برگ ہال میں آیا اور اُس نے راہب کو قتل کر دیا۔

برگ اور ٹارڈ دونوں کے دل میں اس وقت ایک ہی خیال تھا۔ پھر برگ نے کہا "تم نے اُس وقت آن کی طرف دیکھا ہو گا۔ میری بیوی نے بچوں کو اپنے پاس جمع کر لیا اور ان پر لعنت بھیجی۔ پھر بچوں کے منہ اُس کی طرف پھیر دیئے تاکہ وہ اُس عورت کو اچھی طرح دیکھ لیں جس کے لئے ان کے باپ نے قاتل بننا پسند کیا۔ لیکن آن اُس وقت اس قدر خاموش اور اس قدر حسین تھی کہ لوگ اُس کی طرف دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے التجا کی کہ میں بھاگ کر جنگل کو چلا جاؤں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ لوٹ مار کا پیشہ کبھی اختیار نہ کرنا، اور اپنے خنجر کو کبھی کسی ادنیٰ مقصد کے لئے استعمال نہ کرنا۔"

ٹارڈ نے کہا "تمہاری بہادری نے اُس کی عزت کو دوبالا کر دیا تھا"۔

برگ کو لڑکے کا جواب سن کر حیرانی سی ہوئی۔ اسی طرح وہ پہلے بھی اُس کی باتیں سن کر حیران ہو جایا کرتا تھا۔ ٹارڈ کافر تھا، کافروں سے بدتر۔ اُس نے کبھی کسی ناجائز بات کی مذمت نہ کی تھی۔ اُس میں ذمہ داری کا احساس بالکل مفقود معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ اُسے خدا، مسیح اور اولیا کا علم تھا، لیکن وہ صرف ان کے نام ہی جانتا تھا جیسے کوئی شخص کسی دوسری قوم کے دیوتاؤں کے نام جانتا ہو۔ جزائرِ شیرس کی روحیں اُس کی معبود تھیں۔ روحوں میں اعتقاد اُس کی جادوگراں کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اور اب برگ نے ایک کام اپنے ذمے لیا، ایسا کام جیسے کوئی خود اپنی گردن کے لئے پھندا تیار کرے۔ اُس نے جاہل لڑکے کو بتایا کہ خدا ایک بزرگ و برتر ہستی ہے، جو عدل و انصاف کی مالک ہے، غلط کاروں سے انتقام لینے والی اور گناہ کے بندوں کو ابدی جہنم میں مبتلا کرنے والی ہے۔ اور اُس نے اُس کے دل میں مسیح، اُس کی ماں، اور تمام بزرگانِ دین اور اُن مردوں اور عورتوں کی محبت پیدا کی جو خدا کے تخت کے سامنے بیٹھ کر اُس کے غضب سے بچنے کی دعائیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے اس کو وہ

سب کچھ سکھایا جو نوعِ انسان نے خدا کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سیکھا ہے۔ اُس نے اُس کو اُن نیک لوگوں کے قصّے سنائے جو مقاماتِ مقدسہ کے سفر ہزاروں صعوبتیں جھیل کر کرتے ہیں، جو اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر اپنے آپ کو سزائیں دیتے ہیں، اور جو دنیا اور اُس کی مسرتوں کو خدا کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

جوں جوں برگ بولتا جاتا تھا لڑکے کا رنگ زرد ہوتا جاتا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ اُس کی باتوں کو سنتا تھا۔ نئے نئے خیالات کے تصور سے اُس کی آنکھیں کشادہ ہوتی جاتی تھیں۔ برگ خاموش ہوگیا ہوتا لیکن اُس کے خیالات کی رو رکنے والی نہ تھی۔ رات چھا گئی، جنگل کی سیاہ رات، جس کی خاموشی میں الّو کی آواز عجیب وحشت پیدا کرتی ہے۔ خدا اُس وقت اُن کے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اُس کے تخت کی روشنی میں ستارے ماند پڑ گئے تھے، اور انتقام کے فرشتے پہاڑوں کی بلندیوں پر اتر آئے تھے نیچے زمین کی گہرائیوں میں سے آگ کے شعلے بلند ہو ہو کر زمین کے بیرونی خم کو چھوتے تھے اور گناہ اور بدی کے فرزندوں کی اِس آخری جائے پناہ کو بھی نیست و نابود کر دینے پر تُلے ہوئے تھے +

× × × × × × × ×

خزاں آگئی اور اُس کے ساتھ ہی طوفان آیا۔ ٹارڈ شکار کے لئے اکیلا جنگل میں گیا، اور برگ گھر میں کپڑوں کی مرمت کرنے لگا۔ ٹارڈ ایک صحرائی بلندی پر چڑھ رہا تھا اور اُس کے آس پاس درختوں سے ٹوٹے ہوئے خشک پتے ہوا میں چکر لگاتے رقص کرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ بار بار اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اُس نے کئی مرتبہ ٹھہر کر پیچھے نظر ڈالی لیکن ہر مرتبہ اُسے یہی معلوم ہوا کہ یہ ہوا اور پتوں کی سرسراہٹ ہے۔ آخر اُس نے گھونسا تان کر رقص کرنے والے پتوں کو دھمکایا اور اپنے راستے پر چلتا رہا لیکن اُس نے اپنے تصوّر کی آوازوں کو خاموش نہ کیا تھا، وہ برابر کام کر رہی تھیں پہلے تو ایسا معلوم ہوا کہ آبی بچے اُس کے پیچھے ناچ رہے ہیں، پھر ایک بہت بڑے سانپ کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ سانپ کے ساتھ ساتھ ایک بھیڑیا بھی معلوم ہوتا تھا۔ ایک خونخوار جانور، جو منتظر تھا کہ کب سانپ اشارا کرے اور کب وہ لپک کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے۔ ٹارڈ نے اپنی رفتار تیز کر لی، لیکن اسی رفتار سے اُس کے تصورات کی رفتار بھی تیز ہوگئی جب اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ اُس سے دو ہی قدم پیچھے رہ گئے ہیں اور حملہ کیا ہی چاہتے ہیں تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے آرام کرنے کو ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ پتّے آ آ کر اُس کے قدموں میں رقص کرنے لگے۔ جنگل کے تمام درختوں کے پتّے، سبز، سرخ اور زرد پتّے۔

ٹارڈ نے کہا "تم گناہ گار ہو۔ آہ ہم سب گناہ گار ہیں۔ خدا کی نگاہوں میں کوئی بھی معصوم نہیں۔ اور تمہیں تو اُس کے غضب کے شعلوں نے جلا بھی ڈالا ہے"!

اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ ہر طرف سکون چھا رہا تھا، لیکن جنگل اُسے اپنے پیروں کے نیچے ایک طوفانی سمندر کی طرح لہریں لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے ایک ایسی آواز آرہی تھی جسے اُس نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ سارا جنگل

اس آواز سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہے، پھر جیسے کوئی فریاد کرتا ہے، پھر جیسے کوئی اونچی آوازیں
دھمکی دیتا ہے، پھر جیسے کوئی طیش میں آکر کسی کو کوستا ہے۔ کبھی ایک قہقہہ سنائی دیتا اور کبھی ایک لمبی آہ۔ غرض یہ آواز سینکڑوں
آوازوں کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ اُس نامعلوم ہستی نے جو کبھی دھمکیاں دیتی تھی اور کبھی غضب آلود ہو جاتی تھی؛ جو کبھی قہقہے
لگاتی تھی اور کبھی آہیں بھرتی تھی؛ جو محسوس ہوتی تھی اور موجود نہ تھی اُس کو دیوانہ بنا دیا۔ وفورِ خوف سے وہ کانپنے لگا۔ ایسی
دہشت اُس پر اس سے پہلے صرف ایک دفعہ طاری ہوئی تھی جب وہ اپنے غار میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا اور باہر لوگ
اس کی تلاش میں شور و غل مچاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اُسے آج پھر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے پیچھے پے بہ پے
درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں اور اس کے خون کے پیاسے لوگ اپنے اسلحہ بجاتے اور وحشیانہ نعرے لگاتے بھاری
بھاری قدموں کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

فضا میں شور صرف طوفان ہی کا نہ تھا بلکہ اس میں کوئی اَور چیز بھی تھی، ایسی چیز جو طوفان سے بھی زیادہ ہیبت ناک
تھی۔ اُس میں آوازیں تھیں جن کا مطلب اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، اور ایک شور تھا جو کسی اجنبی زبان کا مشابہ تھا۔ اُس نے اپنی
بحری زندگی کے زمانے میں اس سے بڑے بڑے طوفانوں کا شور سنا تھا لیکن اُس نے ہوا کو اتنے تاروں والا رباب بجاتے ہوئے
آج تک نہ سنا تھا۔ ہر درخت کی آواز مختلف تھی، ہر لَے کا رنگ الگ؛ اور پھر پہاڑ کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر اُن کی صدائے
بازگشت کی ایک اَور ہی شان تھی۔ وہ ان تمام آوازوں سے آشنا تھا لیکن ان کے ساتھ آج کچھ اَور عجیب قسم کے شور بھی
تھے جنہوں نے اُس کے دماغ کے اندر ایک طوفان مچا رکھا تھا۔

جنگل کی تاریکی سے تنہائی میں اُسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔ اُسے سمندر کی کھلی فضا اور ساحل کی ننگی چٹانیں پسند
تھیں۔ درختوں کے سائے میں یہاں اُسے آسیب اور روحوں کا عمل معلوم ہوتا تھا۔

پھر یکایک اُسے معلوم ہوا کہ طوفان میں سے اُسے کون بلا رہا ہے۔ یہ خدا تھا — منتقمِ اعظم، انصاف پرور، عادل۔ خدا اُس
کے ساتھی کے لئے اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹارڈ ایک خادمِ دین کے قاتل کو انتقام کے سپرد کر دے۔

ٹارڈ نے بلند آواز کے ساتھ طوفان میں سے بولنا شروع کیا۔ اُس نے خدا کو بتایا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن کیوں نہیں کر سکتا۔
اور اُس کے دل میں کئی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ برگ سے خدا کے ساتھ صلح کر لینے کی التجا کرے لیکن اُسے کبھی اس التجا کے لئے
الفاظ نہ ملے تھے اور اس کی زبان گھبراہٹ میں بند ہو گئی تھی۔ اُس نے کہا: "جب مجھے معلوم ہو گیا کہ دنیا پر ایک عادل خدا کی حکومت ہے
تو میں نے جان لیا کہ برگ ایک خائب و خاسر انسان ہے۔ میں راتوں کو اپنے دوست کے لئے روتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ
خواہ وہ کہیں بھی ہو خدا کی نظروں سے وہ چھپ نہیں سکتا لیکن میں یہ باتیں اُس سے کہہ نہ سکا۔ اُس کی محبت نے میری
تمام گویائی سلب کر لی ہے۔ مجھ سے یہ نہ کہو کہ میں اُسے جا کر کچھ کہوں۔ سمندر سے یہ نہ کہو کہ پہاڑوں کی بلندی کو جا چھوئے"۔
وہ خاموش ہو گیا، اور طوفان کی عمیق آواز جو اُس کے نزدیک خدا کی آواز تھی وہ بھی خاموش ہو گئی۔ یکایک ہوا ٹھہر گئی،

آفتاب نکل آیا، چیونٹوں کے چلنے کی سی آواز آئی اور سرکنڈوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ ان باتوں نے اُس کے حافظے میں اُن کی یاد تازہ کر دی۔
اس کے بعد طوفان پھر شروع ہو گیا، اور اُس نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ اور کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنی۔ اس دفعہ اُسے مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سفید رنگ راہب ہے۔ راہب برگ کی دعوت سے واپس آ رہا تھا اُس کا سر کلہاڑی کے ایک گہرے زخم سے پھٹا ہوا تھا، اور اُس کا تمام جسم خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا بتاؤ وہ کہاں چھپ رہا ہے؟ اُس کو انصاف کے حوالے کر دو تاکہ تم اُس کی روح کو بچا سکو۔"
ٹارڈ نے دوڑنا شروع کیا۔ اُس کا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور وہ اس سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن جوں جوں وہ دوڑتا تھا وہ عمیق و پُر شوکت آواز بلند ہوتی جاتی تھی۔ جو اُس کے نزدیک خدا کی آواز تھی۔ خدا خود اُس کا تعاقب کر رہا تھا اور اُس سے قاتل کو طلب کر رہا تھا۔ برگ کا جرم جس قدر خوفناک اُسے آج معلوم ہو رہا تھا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ایک نہتے انسان کو قتل کر دیا گیا تھا، ایک خادمِ دین کو لوہے سے کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اور قاتل کو ابھی زندہ رہنے کی مجال تھی! ابھی! اُسے آفتاب کے نور اور زمین کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کی جرأت تھی! ٹارڈ ٹھہر گیا، اُس نے اپنی مٹھیاں زور سے بند کیں اور پھر اس طرح چلایا جیسے وہ کسی پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ایک مجنون کی طرح وہ جنگل کی خوف انگیز دنیا سے نکل کر نیچے وادی کی طرف بھاگا۔

× × × × × × × × ×

جب رات کو ٹارڈ غار میں داخل ہوا تو باغی پتھر کی بنچ پر بیٹھا کچھ سی رہا تھا۔ آگ میں سے مدھم سی زرد روشنی نکل رہی تھی اور برگ اپنے کام میں کچھ عجیب مطمئن سا نظر آتا تھا۔ ٹارڈ کا دل رحم سے بھر آیا۔ آہ یہ شاندار انسان یکایک کتنا غریب اور کتنا ناخوش معلوم ہونے لگا تھا۔
برگ نے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "تم ایسے مضمحل کیوں ہو؟ کیا تم بیمار ہو؟ یا تم ڈر گئے ہو؟"
اس پر ٹارڈ نے پہلی مرتبہ اپنے خوف کا ذکر کیا "جنگل میں عجیب ہی معاملہ ہے۔ میں نے وہاں روحوں کی آوازیں سنی ہیں، اُن کو چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ میں نے سفید سفید راہب دیکھے ہیں۔"
"لڑکے!"
"وہ دامن سے چوٹی تک میرے پیچھے گاتے شور مچاتے چلے گئے۔ میں اُن سے بھاگتا رہا مگر وہ میرے پیچھے دوڑتے اور گاتے رہے۔ کیا میں اُن سے مخلصی حاصل نہیں کر سکتا؟ مجھے اُن سے کیا کام؟ دنیا میں ہزاروں لوگ ہیں جن کو مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت ہے۔"
"ٹارڈ، تم پاگل ہو گئے ہو؟"
ٹارڈ بولا، اور اسے خبر تک نہ ہوئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کا شرمیلا پن یکایک غائب ہو چکا تھا، اور الفاظ اُس کے

منہ سے گویا بہتے چلے جا رہے تھے" سفید رنگ راہب جن کے چہروں پر موت کی زردی چھا رہی ہے۔ اُنکے کپڑے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی چادروں سے اپنے چہروں کو چھپا رہے ہیں لیکن اُن کی پیشانیوں کے زخم پھر بھی میری نگاہوں سے نہیں چھپتے ۔ کلہاڑی کے بڑے بڑے سرخ زخم"

برگ کا رنگ زرد ہوگیا۔ اُس نے غم آمیز آواز میں کہا "ٹارڈ، یہ صرف راہبوں ہی کو معلوم ہے کہ تمہیں کلہاڑی کے زخم کیوں نظر آتے ہیں۔ میں نے تو راہب کو خنجر سے مارا تھا"

ٹارڈ کانپتا اور ہاتھ ملتا ہوا کھڑا ہوگیا" وہ مجھ سے تمہیں طلب کرتے ہیں۔ آہ، وہ مجھے تم سے بے وفائی کرنے پر مجبور کردیں گے"

"کون؟ راہب؟"

"ہاں، ہاں، وہ میرے سامنے عجیب عجیب نظارے لا کھڑے کرتے ہیں۔ وہ اُن کو میرے پاس لاتے ہیں۔ وہ مجھے سمندر کی روشن اور کھلی فضا دکھاتے ہیں۔ وہ مجھے ماہی گیروں کی بستی میں سے جاتے ہیں جہاں ناچ رنگ ہو رہا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں لیکن اس پر بھی یہ سب چیزیں مجھے نظر آتی ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہوں 'جاؤ مجھے مجبور نہ کرو۔ مانا کہ میرے دوست نے ایک خون کیا ہے لیکن وہ برا نہیں ہے ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو، اور میں اُس سے کہوں گا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوجائے اور اپنے گناہوں کا کفارہ دے دے۔ وہ اپنے گناہ کو یقیناً محسوس کرے گا، اور مزار مقدس کی زیارت کے لئے جائیگا"

برگ نے پوچھا "پھر راہب کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا وہ مجھے معاف نہیں کرتے اور مجھے زندہ جلادینا چاہتے ہیں؟"

ٹارڈ نے جواب دیا "میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیا میں اپنے بہترین دوست سے بے وفائی کروں۔ سوہی تو دنیا میں میرا سب کچھ ہے اُس نے مجھے ریچھ سے اُس وقت بچایا جب اُس کے پنجے میری گردن پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بھوک اور سردی کے ستم اکٹھے برداشت کئے ہیں جب میں بیمار تھا تو اُس نے اپنے کپڑے اتار کر مجھے پہنا دیئے تھے۔ میں اُس کے لئے لکڑی اور پانی مہیا کرتا رہا ہوں، میں نے سوتے میں اُس کی حفاظت کی ہے اور بارہا اُس کے دشمنوں کو بہکا کر اُس کے مامن سے دور لے گیا ہوں۔ اُنہیں مجھ پر یہ گمان کیوں ہے کہ میں اپنے دوست سے بے وفائی کرونگا؟ میرا دوست خود پادری کے پاس جاکر اپنے گناہ کا اقرار کرے گا، اور پھر ہم دونوں خدا کی مغفرت کے امیدوار رہیں گے"

برگ چپ چاپ سنتا رہا اور اُس کی آنکھیں ٹارڈ کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر اُس نے کہا "تم پادری کے پاس جاؤ اور اُسے ٹھیک ٹھیک بات بتادو۔ تمہیں انسانوں میں واپس چلے جانا چاہئے"

"آہ، میرے تنہا جانے سے کیا فائدہ؟ تمہارے گناہ کی وجہ سے مُردوں کی روحیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کس طرح رہا ہوں؟ تم نے خود خدا پر اپنا ہاتھ اٹھایا ہے۔ تمہارے گناہ سے بڑھ کر بھی کوئی گناہ ہے؟ تم نے مجھ سے کیوں کہا کہ خدا عادل ہے؟ آہ، یہ تم ہی تو ہو جو مجھے اپنی ذات سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر رہے ہو" وہ برگ کے سامنے اپنے گھٹنوں پر جھک گیا۔

خونی نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے اپنے رفیق کے خوف کو معیار قرار دے کر سوچنا شروع کیا تو اُسے اپنا گناہ بڑھتے بڑھتے ایک پہاڑ کی مانند نظر آنے لگا؛ اور اُس نے اپنے آپ کو خدا کی مشیت سے جو ساری دنیا پر

حکومت کرتی ہے جنگ کرتے ہوئے پایا۔ اُس کا دل پشیمان ہو گیا۔

اُس نے کہا لعنت ہو مجھ پر! میں نے کیا کیا جو کچھ کیا۔ اور یہ دکھ بھری زندگی، خوف اور محرومی کی زندگی، کیا یہ میرے گناہ کا کفارہ نہیں ہو گئی؟ کیا میں نے اپنی دولت اور اپنے آرام کو چھوڑ نہیں دیا؟ کیا میں اپنے دوستوں اور اُن تمام مسرتوں سے جن سے زندگی عبارت ہے محروم نہیں ہو گیا؟ اب اَور میں کیا کروں؟"

جب ٹارڈ نے یہ باتیں سنیں تو وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا "تم اپنے کئے پر پریشان بھی ہو سکتے ہو! میری باتوں نے تمہارے دل پر اثر کیا ہے؟ آؤ، آؤ، جلدی آؤ۔ آؤ! ابھی وقت ہے کہ ہم کسی طرف کو نکل چلیں"۔

دیو قامت برگ چونک اٹھا "ہیں، تم نے ــــ"

"ہاں، ہاں، ہاں۔ میں نے تمہارا پتا اُن کو بتا دیا ہے۔ جلد آؤ۔ آؤ، اب آ جاؤ تم توبہ کرو گے تو خدا تمہارا گناہ معاف کر دے گا۔ ہمیں بچ نکلنا چاہئے۔ ہم بچ نکلیں گے"۔

قاتل زمین کی طرف جھکا جہاں اُس کے قدموں میں اُس کے آبا کی جنگی تبر پڑی ہوئی تھی "چور کے بچے میں نے تیرا اعتبار کیا ــــ تجھ سے محبت کی"۔

لیکن جب ٹارڈ نے اُسے زمین کی طرف جھکتے دیکھا تو اُس نے سمجھ لیا کہ اب اُس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس نے اپنی پیٹی میں سے اپنی کلہاڑی نکالی اور قبل اس کے کہ برگ سر اُٹھائے اُس نے اپنا وار کر دیا۔ برگ سر کے بل زمین پر آ رہا۔ اور اُس کے خون کے فوارے غار میں چلنے لگے۔ ٹارڈ نے دیکھا کہ اُسکے اُلجھے ہوئے گھنے بالوں میں کلہاڑی کا ایک بڑا سا سرخ زخم منہ کھولے چمک رہا ہے۔

اس کے بعد دیہاتی غار میں آ پہنچے۔ اُنہوں نے ٹارڈ کی تعریف کی اور کہا کہ تمہیں پوری معافی ملنی چاہئے۔

ٹارڈ نے اپنے ہاتھوں کی طرف نگاہ ڈالی گویا وہ اُن زنجیروں کو دیکھ رہا تھا جو اُسے اپنے محبوب دوست کو قتل کرنے کے لئے کھینچ لائی تھیں، زنجیریں جو خالی ہوا سے بنی تھیں اور جھیل کی سبز روشنی سے، اور جنگل کے متحرک سایوں سے، اور طوفان کے راگ سے، اور پتوں کی سرسراہٹ سے، اور خیال کے سحر انگیز تصورات سے۔ پھر اُس نے زور سے ایک نعرہ لگایا "اللہ اکبر!"

وہ نعش کے ساتھ لپٹ گیا اور رو رو کر اُس سے باتیں کرنے لگا۔ دیہاتیوں نے اپنی برچھیوں کو جوڑ کر ایک تختہ بنا لیا تاکہ آزاد کسان کے مردہ جسم کو اس پر ڈال کر اُس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ لوگوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری تھی اور وہ نعش کی موجودگی میں اپنی آوازوں کو بلند نہ کر سکتے تھے۔ جب لوگوں نے اس کو برچھیوں پر رکھ کر اٹھایا تو ٹارڈ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے سر کو جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا:۔

"اُن سے کہہ دینا کہ لے وہ جس کے لئے دیو قامت برگ نے قاتل بننا پسند کیا، ماہی گیر ٹارڈ نے جس کا باپ طوفان زدوں کو لوٹتا ہے اور جس کی ماں جادوگرنی ہے، برگ کو قتل کر دیا کیونکہ برگ نے اس کو بتایا تھا کہ عدل دنیا کا اساسی پتھر ہے"۔

منصور احمد

تہذیب

گو یہ دعوےٰ سچ ہے اے تہذیب کی روشن جبیں! — جگمگا اُٹھتا ہے پرتو سے ترے صحنِ زمیں

وجد آتا ہے زمانے کو ترے اشغال پر — ناچتی ہے خلق تیرے گھنگروؤں کی تال پر

تیری ہی تعلیم سے کرتا ہے حاصل روزگار — بات کرنے کا فسوں، خاموش رہنے کا وقار

سیکھتی ہے تیرے ہی مکتب میں بزمِ آب و گل — کس طرح سے مسکرا کر فتح کر لیتے ہیں دل!

تیری ہی رعنائیوں سے یہ سبق لیتے ہیں ہم — انجمن میں یوں اٹھاتے ہیں نزاکت سے قدم!

حرفتوں کی کارفرما صنعتوں کی کردگار! — شعر و موسیقی پر آتی ہے ترے دم سے بہار

مانگتی ہے بھیک میں تجھ سے تبسّم کائنات — تیری لَو سے جگمگا اُٹھتی ہے محرابِ حیات

شمع سے رہتا ہے بالا تیرے پروانوں کا رنگ — شوخ تر ہوتا ہے مے سے تیرے پیمانوں کا رنگ!

بے مشقّت خلق ہوتی ہے طرب سے بہرہ یاب — دہر میں بجتا ہے جب تیری مشینوں کا رباب

ساتھ ساتھ آتی ہیں حوریں ناز فرماتی ہوئی — جب تری صنّاعیاں اُٹھتی ہیں اٹھلاتی ہوئی

نشّے کی کلیاں چٹکتی ہیں تری گفتار میں — سحر ہوتا ہے تری پازیب کی جھنکار میں

کھیلتی ہے تیری صبح و شام بازاروں کے ساتھ — جشن ہوتا ہے ترا سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

تند گامی سے تری اے مرکبِ برق آفریں — کانپ کر اپنی طنابیں کھینچ لیتی ہے زمیں

ولولوں کے واسطے ہوتا ہے سازِ فتح باب — ناز سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا تیرا شباب

وجد میں آتی ہے اہلِ انجمن کی زندگی — سرسراہٹ سے، وہ تیرے ریشمی ملبوس کی

عیش کا جویا شباب آمادہ ہو کر خواب پر — کروٹیں لیتا ہے تیرے بسترِ سنجاب پر

کنگنوں میں تیرے ہوتی ہے وہ رنگیں روشنی
مسکراتی ہے کلائی نوعروسِ دہر کی

پینگ تو دیتی ہے دل کو نرگسِ بیمار میں
کشتیاں کھیتی ہے تو موجِ لب و رخسار میں

کانپتی ہے مشعلوں کے جگمگانے کی ادا
یوں سکھاتی ہے حیا کو مسکرانے کی ادا!

لوچ آجاتا ہے تجھ سے حسن کی رفتار میں
لوچ بھی ایسا جو ہوتا ہے اُپی تلوار میں

شب کے سناٹے میں جنّت کو صدا دیتی ہے تُو
چاندنی کو نورِ افشاں میں ملا دیتی ہے تُو!

نازنینوں کے تبسّم میں پئے تکمیلِ کار
تو ملا دیتی ہے اک موہوم سی موجِ ستار!!

شورشِ ہستی میں کیا کیا زیر و بم رکھتی ہے تُو
کس تکلّف سے عناصر پر قدم رکھتی ہے تُو

(۲)

لیکن اے آرائش و انداز کی پروردگار!
روحِ انسانی کو راس آتی نہیں تیری بہار

مسخ ہو جاتی ہے تجھ سے فطرتِ نوعِ بشر
ضرب پڑتی ہے براہِ راست تیری، روح پر

جامۂ اخلاص ہو جاتا ہے تن پر تار تار
ہونٹ ہو جاتے ہیں مصنوعی تبسّم کے شکار

برق دے کر دیدۂ بے نُور کرتی ہے ہمیں
ایکٹر بننے پہ تو مجبور کرتی ہے ہمیں!

نیرگی کی شمع پر جلتے ہیں پروانے ترے
ذوقِ کاوش کو سُلا دیتے ہیں افسانے ترے

وہ تری اکسیر ہے اکسیر کو کرتی ہے خاک
ناز کر دیتا ہے تیرا زندہ قوموں کو ہلاک

علم کی افراط سے کرتی ہے جرأت کو خراب
تو جوانمردی کو دیتی ہے جہالت کا خطاب!

اُس صلابت کو کہ جس پر زندگی کا ہے مدار
لوریاں دے دے کے کرتی ہے نزاکت سے دوچار

تو امیروں سے دلاتی ہے فقیروں کو خراج
چھین لیتی ہیں تری برنائیاں شاہوں کے تاج

ہار تیرے خنجرِ برّاں ہیں گردن کے لئے
سَم ہیں تیرے "نوگلے" تیر دے جوشن کے لئے

جیب میں رکھتی ہے تو وہ تیز خواب آور دوا — کہتے ہیں جس کو زبانِ شعر میں "حسن و ادا"

دیکھتے ہی آتش و آہن میں لگ جاتا ہے زنگ — انکھڑیوں میں تو وہ رکھتی ہے شکر خوابی کا رنگ!

زخم کو آسودۂ مرہم بنا دیتی ہے تو — اخگروں کو قطرۂ شبنم بنا دیتی ہے تو

تندرستوں کو عطا کرتی ہے بیماروں کا لوچ — لرزشِ صہبا میں گم کرتی ہے تلواروں کا لوچ

جس بدن کو تو پنہاتی ہے حریر و پرنیاں — اُس بدن کی سوکھ جاتی ہیں بالآخر ہڈیاں

رابطہ ہے جن کو تیرے خلعتِ گلفام سے — جلد چھِل جاتی ہے اُن سب کی زرہ کے نام سے!!

تیرا مارا دو گھڑی کلفت میں رہ سکتا نہیں — معرکے میں آنچ تلواروں کی سہہ سکتا نہیں

غازیوں کو مسکرا کر آئینہ دیتی ہے تو — قیمتِ آئینہ میں تلوار لے لیتی ہے تو

زلف تیری توڑ دیتی ہے سپاہی کی کمند — بخشتی ہے شیر کے سینے کو قلبِ گوسفند

اوّل اوّل محو کر دیتی ہے تصویروں میں تو — پھر جکڑ لیتی ہے اہلِ فن کو زنجیروں میں تو

شیشۂ دل چُور کر دیتا ہے تیرا جامِ جم — ہات سے چھوٹے ہوئے جامِ بلوریں کی قسم!!

چھین لیتا ہے زمانے سے تری تانوں کا شور — فکر کی رفعت ارادوں کی جوانی دل کا زور

گوشِ جاں کو نغمۂ شیریں سے بھر دیتی ہے تو — پھر اُنہیں نغموں میں آخر دفن کر دیتی ہے تو!!!

کس قدر معشوقیت ہے تیری شانِ قہر میں — غرق کرتی ہے تبسّم کی گلابی لہر میں!

باز آئے ہم ترے اس مرگ پرور حلم سے — اے سیہ رو! جہل ہی اچھا ہے ایسے علم سے

رہ چکے جس وقت تک رہنا تھا قسمت میں غلام

اے سبک سر! دُور سے لے ہم غریبوں کا سلام

جوش

تاریخِ عالم پر ایک نظر

کب ہوا؟		کیا ہوا؟
۳,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰	سال ہوئے	زمین سورج کے بطن سے پیدا ہوئی۔
۸۰۰,۰۰۰,۰۰۰	″ ″	زمین پر زندگی کے آثار نمودار ہوئے
۵۰۰,۰۰۰	″ ″	انسان پیدا ہوا (دروغ برگردنِ سائنس)
۱۰۰,۰۰۰	″ ″	زمانہ حجریۂ قدیمہ جب لوگ غاروں میں رہتے تھے۔
۱۲,۰۰۰	قبل مسیح	دنیا کا پہلا (؟) تمدن شہر ایلم میں
۵,۰۰۰	ق م	زمانہ حجریہ جدیدہ مشرق قریب میں ختم ہوا اور دھاتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ دھاتوں کی دریافت سے ابتدائی تمدن نے فروغ پایا۔ بابل اور شاید اس کے جلد بعد مصر کا تمدن اسی زمانے میں شروع ہوا۔
۴,۵۰۰	″	شاہ مینیز مصر کے پہلے شاہی خاندان کے بانی نے شہر ممفس کی بنا ڈالی۔ قدیم مصر میں کل اکتیس شاہی خاندان ہوئے جنھوں نے تقریباً ۴ ہزار سال تک حکومت کی۔ زراعت و آبپاشی، مساحت، ہیئت، جہاز رانی و تجارت، زر و مبادلہ، قانون و طب، حکومت، مذہب، کتابت، تزئین مصر نے ان سب علوم و فنون میں ترقی کی۔
۴,۰۰۰	″	چین کے تمدن کا آغاز (یوں چینیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کے تمدن کی عمر ایک لاکھ سال ہے) چینی معاشرت کا نظام جاگیری تھا جو تقریباً دو ہزار سال (۲۲۰۰ تا ۲۴۶ ق م) تک قائم رہا چین کا عظیم الشان تمدن زیادہ تر مادی تھا۔ بارود، چھاپہ، کمپاس چینیوں ہی کی ایجادیں ہیں۔
۳,۰۰۰	″	اہرام مصر تعمیر ہوئے فرعون خافو نے ہرم عظیم بنایا۔
۲,۱۰۰	″	حمورابی شاہ بابل نے اپنے منصفانہ قوانین نافذ کئے۔ یہ سب سے پہلا مجموعہ قوانین ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔
۲,۰۰۰	″	آریائی یا ہندی یورپی لوگوں نے ایک بیان کے مطابق وسط ایشیا سے اور ایک دوسرے شاید زیادہ واثق بیان کے مطابق شمال مشرقی روس سے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ان کی حکومت پدرسری قسم کی تھی اور اُن کا مذہب مظاہر پرستی۔ انھیں لوگوں کی عظیم الشان نقل مکانیوں کے سلسلے میں جو ایک ہزار سال تک جاری رہیں آریا ہندوستان میں، ایرانی ایران میں، میدی لیدی بابل و اشوریا میں، اکی دوری آیونی

یونان میں، لاطینی اطالیہ میں اور کلٹ جرمنی، فرانس، سپین اور انگلستان میں جاکر متمکن ہوگئے۔

۱،۹۲۵ ق م ہتیوں نے شہر بابل پر قبضہ کرلیا۔

۱،۸۰۰ "ابراہیم" (قبیلہ یا حضرت ابراہیمؑ؟) نے بابلی شہر اُر کو چھوڑا۔ غالباً اسی زمانہ میں ہندوستان میں وید مرتب ہوئے تھے۔

۱،۶۰۰ جزیرہ کریت کا تمدن اپنے کمال پر تھا۔

۱،۴۰۰ موسیٰ کی قیادت میں یہودی مصر چھوڑ کر نکلے۔

آریا پنجاب سے بڑھ کر گنگا کی وادی پر قابض ہونے لگے۔

۱۳۶۲ مصر میں توتنخ امین تخت نشین ہوا۔

۱۲۷۵ اشوریوں نے شمال سے آکر بابل کو فتح کیا۔ سناحرب کا عہد (۷۰۵ تا ۶۸۱) اشوری تمدن کا زریں زمانہ ہے۔ یہ لوگ اپنی جنگی قابلیت اور خونریزی کے لئے مشہور تھے۔ اس سے قبل ۳۰۰۰ ق م سے یہ لوگ بالائی دجلہ کے علاقہ میں ہمسایہ قوموں کے لئے ایک آفت بنے رہے تھے۔

۱۰۱۵ حضرت داؤدؑ کی حکومت تا ۹۷۵

۱۰۰۰ زرتشت نے زرتشتیت یعنی نور و ظلمت کے مذہب کی تلقین کی۔ اُس کے نزدیک ارمزد روشنی اور راستی کا خدا ہے لیکن اہرمن جو تاریکی اور بدی کا دیوتا ہے ہمیشہ اُس کی مخالفت پر آمادہ رہتا ہے اس کشمکش میں انسان کا کام ارمزد کی حمایت ہے۔

۸۵۰ تا ۷۵۰۔ ایشیائے کوچک میں ہومر اور اُس کے معاصر شعرا کا زمانہ

۸۰۰ تا ۳۱۵ ہندوستان میں "شاستروں کے فلسفے کا دور"

۷۷۵ حضرت سلیمانؑ کا عہد تا ۷۳۵۔ یہودیوں کا تمدن اس زمانے میں چمکا۔ اس کے بعد وہ دو فرقوں اسرائیل اور یہودا میں منقسم ہوگئے۔

۷۵۳ شہر روما کی بنا پڑی۔

۶۰۶ مختلف قوموں نے شامل ہوکر اشوریوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ نینوا کو مسمار کردیا۔ بابل میں کلدانیوں نے اپنا سکہ جمایا۔ بحیرۂ روم کے کنارے فینیقیوں نے اپنا پھریرا اڑایا۔ فینیقی تجارت کے دھنی اور جہازرانی کے ماہر تھے۔ موجودہ مغربی رسم الخط انہیں کی ایجاد ہے۔ دور بابل کے شمال مغرب میں لیدیاں اور شمال مشرق میں میدیوں نے اپنی اپنی سلطنت قائم کرلی۔ میدیو کے جنوب کی طرف ایرانیوں کا علاقہ تھا۔

۵۵۷ تا ۴۷۷ گوتم بدھ جس نے ہندوستان میں اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ اُس نے مساوات اور نیکی کی تعلیم دی اور کرم اور نروان کے ذریعے سے نوعِ انسان کے نجات پانے کا رستہ دکھایا۔ ذات پات کی تفریق اور برہمنوں کے تفوق سے ہندو معاشرت کی حالت خراب ہوچکی تھی۔ بدھ نے اس کی اصلاح کرنی چاہی بدھ مت پہلے چند صدیوں ہندوستان میں پھیلا لیکن آٹھویں صدی کے بعد برہمنوں نے اُسے نیچا دکھایا۔ اور ہندوستان میں اس کا قلع و قمع کردیا۔

۵۵۱ ق م تا ۴۷۹ ۔ کنفیوشس نے چین میں اپنے خیالات کی ترویج کی ۔ اُس نے انسانیت ، عدل ، فرماں بری اور دیانت داری کا سبق نوعِ انسان کو پڑھایا ۔ مذہبی رہنما لاؤتسی کا بھی قریب قریب یہی زمانہ ہے ۔

۵۴۶ ایرانی فرمانروا کیخسرو نے بمقام سارڈس لیدیوں کو فاش شکست دی ۔ اس کے آٹھ سال بعد بابل نے بھی سر کا لوہا مان لیا ۔

۵۲۱ ایران میں دارا کا عہدِ حکومت تا ۴۸۵ ۔ ایرانی تمدن کو ترقی ہوئی ۔ امن و امان قائم ہوا ۔ تجارت پھیلی ۔ مذہبوں کو رواداری کی نعمت ملی ۔ اس زمانے سے آریائی قومیں انسانی ترقی کی ذمہ دار ٹھہریں ۔

۵۰۹ روما ایک جمہوریہ بن گیا جو برابر ۲۷ ق م تک قائم رہی ۔

۴۹۰ جنگ میراتھان جس میں یونانیوں نے ایرانیوں کو پچھاڑا اور یورپ کو ایشیا کے استبداد سے بچالیا ۔ ۴۴۵ تا ۴۳۱ پیریکلیز کا زمانہ جس میں ایتھنز اپنے معراجِ کمال پر پہنچا ۔ یونانیوں نے طبیعیات اور خصوصاً فلسفے کو ترقی دی اور دنیا میں پہلی بار عقل کی مشعل بلند کی ۔

۴۵۱ روما میں بارہ تختیوں کا قانون نافذ ہوا ۔ یہ روما کے مہتم بالشان قانونی نظام کا آغاز تھا جس کا بالآخر کم و بیش ساری دنیا پر اثر پڑا ۔

۳۹۹ سقراط نے اپنی صداقت آموزی کی پاداش میں زہر کا پیالہ پیا ۔ سقراط کا شاگرد افلاطون تھا (۴۲۷ تا ۳۴۷) اور افلاطون کا شاگرد ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲) جس کی نظیر زمانہ پھر کبھی پیش نہ کر سکا ۔

۳۲۶ سکندرِ اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا ۔ سکندر کی بدولت مشرقی دنیا کے بعض ممالک پر یونانی تمدن کا اثر پڑا ۔ یونانیوں نے اس زمانے کے ہندوؤں کی بہت تعریف لکھی ہے ۔

۳۲۱ چندر گپت نے ہندوستان میں بمقام پاٹلی پتر (پٹنہ) پہلے بڑے شاہی خاندان کی طرح ڈالی ۔

۲۷۳ تا ۲۳۲ ۔ اشوک کا عہد جو امن و امان اور اخلاقی ترقی کا زمانہ تھا ۔

۲۶۴ تا ۱۴۶ ۔ روما اور کارتھیج کی باہمی لڑائیاں جس میں بالآخر روما کامران رہا ۔

۲۱۴ چینی شاہنشاہ شی ہوانگ ٹی نے دیوارِ عظیم بنانی شروع کی ۔

۱۴۶ رومیوں نے اِدھر یونانی شہر کورنتھ اُدھر کارتھیج پر حملہ کر کے دونوں کو مسمار کر دیا ۔

۱۳۳ تا ۳۱ جمہوریہ روما کی عظمت و جبروت کا دور ۔ روما نے مغرب کے اکثر حصوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنے مفید قوانین نافذ کئے ۔

۶۶ روما کی فوجیں دریائے فرات کے کناروں پر پومپے کی سپہ سالاری میں پہنچیں ۔

۴۴ مشہور رومی قائد و مدبر جولیس سیزر کا قتل

۳۱ ایکٹیم کی لڑائی ہوئی جس میں اوکٹیوئیس نے انٹنی کو شکست دی ۔ چار سال بعد ۲۷ ق م میں اوکٹیوئیس روما کا شاہنشاہ بن گیا ۔

۴ ق م مسیح پیدا ہوا ۔ اُس نے دنیا کو اخوت و محبت کی تعلیم دی ۔

سنہ ۳۰ء مسیح کی وفات۔

سنہ ۹۶ء تا ۱۸۰ روما میں پانچ نیک نہاد شاہنشاہوں کا زمانہ جب روما نے اپنے مشرقی ومغربی مقبوضات میں تمدن کی روشنی پھیلائی۔ امن وامان قائم ہوا۔ قانون وعدل کا سکّہ رائج ہوا۔ تجارت کو ترقی ہوئی۔ شاندار سڑکیں بنیں + روما نے یونان کی شائستگی کو برقرار رکھا اور مغرب کے جہلا کی تعلیم وتربیت کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور اسے خوش اسلوبی سے نبھایا۔

سنہ ۱۵۰ء ہندوستان کاشغر ختن وغیرہ میں کنشک کی حکومت

سنہ ۲۲۰ء چین میں ہان خاندان کا خاتمہ اور اُن تفرقہ پردازیوں کا آغاز جو چار سو سال تک جاری رہیں۔

سنہ ۲۲۶ء اردشیر پہلا ساسانی بادشاہ ایران میں تخت نشین ہوا۔

سنہ ۲۴۲ء مانی نے اپنے مسلک کی تلقین کی۔ ۲۷۶ء میں اُسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔

سنہ ۳۱۳ء قسطنطین اعظم نے مسیحی کلیسا سے صلح کر لی۔ ساٹھ سال کے شدید مظالم کے بعد عیسائیوں سے رواداری کا سلوک کیا جانے لگا۔

سنہ ۳۳۰ء قسطنطین نے قسطنطنیہ کا شہر آباد کیا اور اُسے اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ تقریباً گیارہ سال تک قسطنطنیہ مغربی تمدن کا عظیم الشان مرکز بنا رہا +

سنہ ۳۷۲ء ہنی حملہ آوروں نے مشرقی یورپ کو تہ وبالا کیا۔

سنہ ۴۱۰ء گاتھی حملہ آور الارک نے روما کو تاخت وتاراج کیا۔ ۴۷۶ء میں روما کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور اُس کی بجائے سپین میں مغربی گاتھ افریقہ میں وینڈل، اطالیہ میں مشرقی گاتھ، فرانس وغیرہ میں فرینک، جرمنی اور انگلستان میں سیکسن اور اینگل قوموں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں +

سنہ ۵۰۰ء تا ۸۰۰ء ہندوستان میں پُرانوں کا زمانہ۔ موجودہ ہندو مت رونما ہوئی۔ بکرماجیت کے دربار کے نو رتنوں میں کالیداس ڈرامانگار نے شہرت پائی۔

سنہ ۵۲۷ء تا ۵۶۵ء مشرقی شاہنشاہ جسٹنین کا عہد جس نے اپنی "کوڈ" یعنی شہرہ آفاق رومی مجموعہ قوانین میں روما کی قانونی کارگذاری کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

سنہ ۵۷۱ء پیغمبرِ اسلام کی پیدائش۔

سنہ ۶۲۲ء حضرت محمدؐ نے ہجرت کی، اور وحدانیت کا نعرہ بلند کیا۔ اسلام نے بت پرستی کی بیخ کنی کی، مساوات اور حریت اور اخوت کی عملی تلقین کی۔ سادگی اور راستبازی پر زور دیا۔ اور انسانی ترقی کے لئے اعتدال کی راہ دکھائی۔

سنہ ۶۲۷ء تانگ خاندان کا دوسرا فرماں روا ٹے تسنگ چین کا شاہنشاہ ہوا۔ اُس کی سلطنت انام سے کر بحیرۂ کیسپین تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں چینی تمدن اپنے عروج پر تھا۔ قانون کی تبویب کی گئی، ادبی امتحانوں کے طریقے کی اصلاح کی گئی۔ چینی علوم وفنون کو فروغ ہوا۔

۶۲۸ء عربوں کی ایک جماعت پیغمبرِ اسلام کا نامہ متعلق بہ دعوتِ اسلام لے کر چینی شاہنشاہ کے سامنے حاضر ہوئی جس نے انہیں کینٹن میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی۔ یہ مسجد دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے +

۶۳۴ء حضرت عمرؓ کی خلافت تا ۶۴۴ء

۶۳۶ء ابوالعاص عامل بحرین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

۷۱۱ء عربوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں ہسپانیہ کو فتح کیا۔ سات آٹھ صدیوں تک یورپ اندلس کے عربی تمدن سے متمتع ہوتا رہا۔ یورپ کے اکثر مشہور علما اندلس کے دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید کی سلطنت پیرنیز سے لیکر چین تک پھیلی ہوئی تھی

۷۳۲ء چارلز مارٹل نے عربوں کو تور (فرانس) پر شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت نے یورپ کے بیشتر حصے میں اپنا مخصوص تمدن قائم رکھا

۸۰۰ء پوپ نے شہر روما میں فرانسیسی حکمران شارلمین اعظم کے سر پر سنہری تاج رکھا اور اُسے شاہنشاہ کا لقب دیا۔ اس "مقدس رومی سلطنت" کے قیام سے گویا پاپائیت مشرقی شاہنشاہوں سے آزاد ہوگئی اور مسیحیت کے لئے ایک نوع کی دینی و دنیوی مرکزیت پیدا ہوگئی +

اس زمانے میں مشرق و مغرب میں چار زبردست متمدن حکومتیں قائم تھیں۔ ہسپانیہ میں خلافت قرطبہ، وسط یورپ میں "مقدس رومی سلطنت"، مشرقی یورپ میں بازنطینی سلطنت اور عراق میں خلافت بغداد جس کی تہذیب کی روشنی دور دور تک پھیلی (۷۵۰ء تا ۹۵۱ء) +

۸۵۰ء تا ۱۰۰۰ء "شمالیے" اور خانہ بدوش مسیحی و اسلامی دنیا پر ٹوٹ پڑے میگیار لوٹ مار کے بعد ہنگری میں بس گئے۔ شمالی وائکنگ انگلستان فرانس روس پر جھپٹے بلکہ امریکہ تک جا پہنچے (۱۰۰۰ء) فرانس میں وہ نارمنڈی میں آباد ہوئے۔ روس میں انہوں نے روسی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جزیرہ صقلیہ بھی جہاں سے دو صدیوں تک اسلامی تمدن کے اثرات اطالیہ و یورپ میں پھیلے تھے اُن کے زیر اقتدار آگیا۔ (۱۰۶۰ء)

۹۲۲ء عربی مورخ طبری نے انتقال کیا۔ طبری کی تاریخ آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اس میں کم از کم ایک ہزار صفحات قبل اسلام کے واقعات سے متعلق ہیں۔

۱۰۳۷ء بوعلی سینا مشہور طبیب و فلسفی کی موت

۱۰۵۴ء حریری (بغدادی) مقامات حریری کے مصنف کی پیدائش۔ وفات ۱۱۲۲ء

۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء امام غزالی مشہور اسلامی متکلم فلسفی جس نے فلسفے کے خلاف مذہب کے حق میں متعدد وقیع تصنیفات چھوڑیں۔

۱۰۶۶ء نارمنڈی کے ڈیوک ولیم فاتح نے ہیسٹنگز کے مقام پر انگریزی فوج کو شکست دی اور موجودہ انگریزی شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ انگلستان کا برِ اعظم اور بیرونی دنیا سے قریبی تعلق پیدا ہوا۔

۱۰۹۶ء تا ۱۲۹۲ء مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی لڑائیاں ہوئیں۔ مبارزاور جاگیردار جن کے نظام جاگیری نے بربری

حملوں کے دوران میں یورپ کی معاشری شیرازہ بندی کو قائم رکھا تھا ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ارضِ مقدس کی طرف چل کھڑے ہوئے صلیبی لڑائیوں سے بازنطینی سلطنت کچھ عرصے کے لئے مسلمانوں کی دست برد سے بچ گئی۔ان سے پاپائیت کی قوت بڑھ گئی اور عیسائیت کی صورت مسخ ہوئی لیکن ساتھ ہی تجارت کو فروغ ہوا۔امرا کی طاقت چکنا چور ہو کر یورپ میں مضبوط مطلق العنان ملوکیت کے لئے رستہ صاف ہو گیا۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی تمدن اور علوم کی روشنی مغرب میں پھیلنے لگی +

۱۱۹۳ء محمد غوری نے تھانیسر کی لڑائی کے بعد دہلی فتح کر کے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی۔اس کے بعد تقریباً چھ صدیوں تک پہلے افغانی پھر ترک پھر مغل مسلمان ہندوستان پر حکمران رہے اور ہندوستان میں امن و امان اور ایک نیا زیادہ جمہوی تمدن قائم ہوا

۱۱۹۸ء ابن رشد مشہور قرطبی فلسفی مر گیا

۱۲۱۳ء چنگیز خاں نے چین پر حملہ کیا اور نوے شہروں کو برباد کر دیا۔اُس کے جانشین اوگدے خاں نے روس کو فتح کیا (۱۲۴۰ء) پولینڈ کو تباہ و برباد کیا (۱۲۴۱ء)۔اور یہ مغرب کی خوش قسمتی تھی کہ آئندہ سال مرنے اُسے آلیا۔تاتاریوں کی سلطنت اس وقت پیکن سے لے کر پولینڈ میں دریائے وسچولا کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی +

۱۲۱۵ء انگریزی بادشاہ جان نے "سندِ اعظم" پر دستخط ثبت کر دیئے۔یہ انگریزی سیاسی آزادی اور تہذیب حاضر کے جمہوری اداروں کا آغاز تھا

۱۲۶۰ء تا ۱۲۹۴ء کبلے خاں تاتاری تخت پر جلوہ افروز رہا۔وہ اپنے زمانے کے بہترین فرمانرواؤں میں سے تھا اسی کے عہد سلطنت میں یورپ نے چین کی قدیم تہذیب سے استفادہ کیا۔اور یوں بارود، کمپاس، چھاپہ اور کاغذسازی کے وہ فنون سیکھے جن کے تصادم سے عہدِ وسطیٰ کی تہذیب پاش پاش ہو گئی اور ایک نیا مضبوط تمدن رونما ہوا +

۱۲۵۸ء ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر دیا۔ ۱۲۷۱ء مارکو پولو مشہور اطالوی سیاح نے چین کا رخ کیا۔

۱۳۰۰ء اطالوی شاعر دانتی نے اپنی عشقیہ نظم ویتانووا (نئی زندگی) لکھی۔بعد میں اُس نے اپنی شہرہ آفاق نظم "دیوینا کومیدیا" یا "ڈیوائن کومیڈی" (ربانی سرور یہ) لکھی۔

۱۳۰۹ء تا ۱۳۷۶ء پوپ کی "بابلی قید" فرانسیسی فرمانروا نے پوپ کو اپنی حراست و حفاظت میں لے لیا۔اس سے پاپائیت کی گذشتہ شان و شوکت اور احترام جاتا رہا۔

۱۳۴۳ء تا ۱۳۸۹ء حافظ شیراز جس نے غزل گوئی کو ایک روحانی و آسمانی درجہ بخشا

۱۴۰۶ء مورخ ابنِ خلدون جس نے فلسفۂ تاریخ کے متعلق اپنا لاجواب "مقدمہ" لکھا مر گیا۔

۱۴۲۹ء ژان دارک نے اورلیاں (فرانس) پر انگریزوں کو شکست دی۔مدت سے انگلستان اور فرانس میں صد سالہ جنگ جاری تھی۔ژان ڈارک کا ظہور گویا حب الوطنی کا روحانی جلوہ تھا۔کچھ عرصے سے مغربی یورپ میں قومی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔اب قومی ربط و ضبط کے نتیجے ظاہر ہونے لگے +

۱۴۳۴ء اطالوی شہر فلارنس کی شائستگی اپنے عروج پر تھی + یہ یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جب مختلف خود مختار شہروں نے علم و

تہذیب کا جھنڈا بلند کیا اور علما و فضلا کے ایک گروہ نے پرانے یونانی و لاطینی علم و ادب کچھ عربوں کی رہنمائی میں کچھ اپنی تجسس سے سیکھ کر یورپ بھر میں اُن کی ترویج کی۔ بوکاچیو (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۵ء) ادیب، کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) سائنس دان، رافیل مصور (۱۴۸۳ء تا ۱۵۲۰ء) وغیرہ وغیرہ اس عہد کے مشاہیر ہیں +

۱۴۵۳ء ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ بہت سے یونانی علماء نے آکر اطالیہ کے شہروں میں پناہ لے لی، اور ان کی مساعی سے پرانے علوم کی اشاعت کو ترقی ہوئی +

۱۴۹۲ء ہسپانیوں نے غرناطہ پر حملہ کیا اور عربوں کو اندلس سے نکال دیا +
اسی سال میں کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا + ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے دولِ یورپ اپنی مشرقی تجارت کو برقرار رکھنے کی نئی راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ اس کے علاوہ کمپاس کی مدد سے اب بحری سفروں میں پہلا سا خطرہ نہ رہا۔ نیز زمین کی گولائی کا یقین نئی جغرافیائی اکتشافات کے لئے محرک ثابت ہوا۔

۱۴۹۹ء سوئٹزرلینڈ ایک جمہوریہ بن گیا +

۱۵۱۷ء لوتھر نے پوپ کے خلاف اعلانِ جنگ کرکے اپنے پچانوے اصول "وٹنبرگ (جرمنی) کے گرجے کے دروازے پر آویزاں کر دیتے۔ یہ تھا اصلاحِ تحریکِ کلیسا اور پراٹسٹنٹیت کا آغاز۔ اس کے بعد تقریباً سوا سو سال تک یورپ میں مذہبی لڑائیاں اپنے زوروں پر رہیں اور مسیحیت دو بڑے فرقوں رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ میں منقسم ہوگئی +

۱۵۱۹ء تا ۱۵۵۶ء ہسپانوی سلطنت کے اقتدار کا زمانہ۔ پوپ نے امریکہ کی دریافت کے بعد کرۂ ارض پر ایک فرضی خط کھینچ دیا تھا جو جزیرہ ایزورز کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس خط کے مشرق کی طرف کی دنیا پرتگالیوں کو دی گئی اور مغربی طرف کی ہسپانیہ کو + اس سلسلے میں میگیلین ہسپانوی نے ۱۵۱۹ء میں دنیا کے گرد اپنا حیرت انگیز بحری سفر کیا۔ وہ جنوبی امریکہ کی جنوبی راس کے گرد ہوتا ہوا جزائر فیلیپائن کو دریافت کرکے تین سال کے بعد سپین پہنچا +

لیونارڈو ڈونچی نے انتقال کیا۔ یہ مصور جو ایک سنگتراش سائنس دان انجنیئر موسیقی دان اور اور بہت کچھ تھا۔ دنیا کے قابل ترین افراد میں شمار ہوتا ہے "آخری طعام" اور "مونا لیزا" اس کی مشہور تصویریں ہیں "مونا لیزا" دنیا کی سب سے مشہور تصویر سمجھی جاتی ہے +

۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء سلیمان اعظم ترکی سلطان کا عہد جس کی سلطنت بغداد سے ہنگری تک تھی

۱۵۲۶ء پانی پت کی پہلی لڑائی ہوئی اور ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۵۴۱ء مشہور مصور مائیکل انجیلو نے اپنی تصویر "آخری عدل" کو پانچ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد مکمل کیا +

۱۵۵۶ء ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ اکبر کے عہدِ زریں میں ابوالفضل و فیضی سے مصنف ٹوڈرمل سا مدبر عرفی سا شاعر اور تان سین سا موسیقی دان پیدا ہوا +

۱۵۶۴ء گیلیلیو مشہور ہیئت دان پیدا ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنی حیرت انگیز دوربینوں کے ذریعے سے ستاروں کے متعلق

نئی نئی باتیں دریافت کیں (۱۶۱۰ء) مثلاً زحل کے دائرے، چاند کے پہاڑ وغیرہ۔ کلیسا نے اسے ان نئی اکتشافات کے جرم میں پکڑا

۱۵۸۱ء ڈچ قوم نے ہسپانوی شاہنشاہ کے خلاف بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور ہسپانیوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔

۱۵۸۸ء انگریزی بحری بیڑے نے ہسپانوی بیڑے کو شکستِ فاش دی۔ اس کے بعد انگلستان گویا سمندر کا حکمران بن گیا۔

۱۵۸۹ء ہنری چہارم نے آ کر فرانسیسی قومیت کو یکسوئی کا رستہ دکھایا + مذہبی تفرقہ پردازی کا خاتمہ کیا۔

۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء فرانسیسی فلسفی دیکارت جس نے انسان کے ذاتی محاکمہ کی اہمیت پر زور دیا۔

۱۶۰۲ء شیکسپیئر نے اپنا مشہور ڈراما "ہیملٹ" شائع کیا۔

۱۶۰۷ء تا ۱۶۶۹ء ریمبرینٹ ڈچ مصوّر جس کی تصاویر میں ڈچ قوم کی سیرت کا عمیق آئینہ ہے۔

۱۶۲۰ء بیکن نے اپنی مشہور کتاب "نووم ارگنیم" تصنیف کی۔ افادہ و ترقی اس کے اصول ہیں اور اس کے مقاصد انسانی مصائب کا ازالہ اور نوع انسان کی بہی خواہی +

۱۶۲۲ء مولیئر سب سے بڑے فرانسیسی "سروری" ڈراما نگار کی پیدائش۔ وہ فرانسیسی زبان کا شیکسپیئر ہے

۱۶۳۱ء مغل شاہنشاہ شاہجہان نے تاج محل تعمیر کرنا شروع کیا۔ یہ عظیم الشان مقبرہ جو اسلامی فنِ تعمیر کی بہترین یادگار ہے ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا

۱۶۳۸ء جاپان نے مختلف عیسائی مشنریوں کے مناقشوں سے تنگ آ کر حکماً یورپی لوگوں کا داخلہ ملک میں بند کر دیا۔ یہ بندش دو سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہی + جاپان تیسری صدی میں ایک نیم متمدن ملک بنا تھا۔ اُس کا نظامِ معاشرت جاگیری تھا

۱۶۴۲ء کرامول نے انگریزی بادشاہ چارلز اول کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ شاہ پسندوں اور جمہوریوں میں سات سال تک لڑائی ٹھنی رہی جس کے اختتام پر کرامول نے بادشاہ کو سُولی پر چڑھا کر ایک "دولتِ عامہ" وضع کی جو گیارہ سال تک قائم رہی +

۱۶۴۸ء یورپ میں تیس سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا۔ یہ آخری مذہبی لڑائی تھی۔ اس کے بعد یورپ میں مذہبی لڑائیوں کا خاتمہ اور خالص سیاسی تحریکات و محاربات کا آغاز ہوا + ڈچ قوم کی آزادی تسلیم کی گئی۔ ڈچوں نے ۱۶۰۰ء سے ۱۶۷۰ء تک سمندروں پر اپنی طاقت کا پھریرا اُڑایا۔ اُس کے بعد انگلستان نے اُن کے بحری اقتدار کا خاتمہ کر دیا +

۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء اورنگ زیب کا عہد جس میں مغل سلطنت اپنے معراجِ کمال پر تھی

۱۶۵۹ء ناول "روبنسن کروزو" کے مصنف ڈیفو کی پیدائش۔ ناول نویسی کا آغاز گویا اسی ناول سے ہوا

۱۶۸۸ء انگلستان میں "انقلاب" برپا ہوا۔ عوام نے بادشاہ کے استبداد کا خاتمہ کر دیا اور ایک خالص دستوری حکومت قائم کر لی۔

۱۶۸۹ء لوئی چاردہم فرانس کے "فرمانروائے اعظم" کے خلاف انگلستان، ہالینڈ وغیرہ کا ایک اتحادِ عظیم۔ لوئی اپنے زور و قوت کے زعم میں اپنے ہمسایہ ملکوں پر چھاپہ مار کر انہیں فرانس میں شامل کر لینا چاہتا تھا + اس کے یہ منصوبے روک دیے گئے +

۱۶۹۷ء پیٹر اعظم روس چھوڑ کر ہالینڈ میں جہاز سازی کا فن سیکھنے گیا۔ واپس آ کر اُس نے روس کی تعمیر و تنظیم کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور وہ حیرت انگیز اصلاحات نافذ کیں جن کے اثر سے روس جو ایک دقیانوسی ملک تھا ایک مہذب قوم بن گیا +

۱۷۲۵ء تا ۱۸۰۵ء فرانسیسی مصور گرز جس نے اپنی بے وفا بیوی کے حسین چہرے کو اپنی تصویروں کا نمونہ قرار دے کر عالمگیر شہرت حاصل کی۔ "فاختاؤں والی لڑکی" "ٹوٹا ہوا ظرف" وغیرہ اُس کی مشہور تصویریں ہیں۔

۱۷۲۷ء نیوٹن سائنس داں نے وفات پائی۔ نیوٹن قوتِ ثقل کے نظریے کا موجد تھا +

۱۷۶۳ء ہفت سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا + اس جنگ سے پہلے ایک طرف انگلستان اور فرانس کے درمیان مدت سے امریکہ اور ہندوستان میں مقابلہ و مناقشہ چلا آتا تھا اور دوسری طرف یورپ میں ایک نئی طاقت روز بروز زور پکڑ رہی تھی یہ تھی فریڈرک اعظم شاہِ پرشیا کی قوت + اس جنگ میں اِدھر انگلستان نے فرانس کو پسپا کیا، اُدھر فریڈرک نے اپنے دشمن اتحادیوں کو پے در پے فاش شکستیں دے کر یورپ بھر کو حیرت میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو یورپ اور بالخصوص جرمنی میں آسٹریا کے مقابل میں پرشیا کا اقتدار بڑھا اور دوسری طرف بیرونی دنیا میں انگلستان کا رعب داب بڑھا۔ اور اُس کی سلطنت وسیع تر ہونے لگی۔ یورپ میں فرانس سپین سویڈن ہالینڈ اِن کا زور کم ہوا اور انگلستان پرشیا اور روس کی طاقت زیادہ ہوتی گئی۔

۱۷۷۴ء وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔

۱۷۷۶ء امریکی نوآبادیوں نے انگلستان سے آزاد ہو جانے کا اعلان کیا۔

۱۷۷۸ء روسو نے انتقال کیا۔ وہ دورِ حاضر کے جمہوری نظریے کا بانی تھا۔

۱۷۸۱ء واٹ نے انجن ایجاد کیا۔ انگلستان میں "صنعتی انقلاب" کا زمانہ شروع ہوا اور انگلستان دنیا کا صنعتی کارخانہ بننے لگا + اٹھارھویں صدی کے اخیر سے لے کر تمام یورپ اور خصوصاً انگلستان میں متعدد حیرت انگیز طبیعی ایجادات و اختراعات ہوئیں۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کو اور کا اور بنا دیا +

۱۷۸۹ء فرانس کے عظیم الشان "انقلاب" کا آغاز۔ اِس انقلاب نے یورپ کی سیاسی کایا پلٹ دی + فرانس میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی

۱۸۰۴ء نپولین فرانس کا شاہنشاہ بنا + گیارہ سال تک یورپ میں اتحادوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا +

مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے وفات پائی یہ زبردست فلسفی خدا اور انسانی آزادی دونوں کا معتقد تھا +

۱۸۰۶ء شہرۂ آفاق جرمن شاعر گوئٹے نے اپنی بہترین تصنیف فاؤسٹ کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اُس نے اسے ۱۷۷۳ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۳۱ء میں ختم کیا۔

۱۸۱۰ء ہسپانیہ کے جنوبی امریکہ کے مقبوضات آزاد جمہوری حکومتوں میں تبدیل ہو گئے +

۱۸۱۵ء واٹرلو کی لڑائی جس میں نپولین نے شکست کھائی۔ اس جنگ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے یورپ میں پھر استبداد نے زور پایا +

۱۸۱۷ء تا ۱۹۰۴ء انگریزی مصور واٹس جس کی تصویروں میں ایک مشہور تصویر "امید" ہے۔

۱۸۲۱ء انگریزی شاعر کیٹس مر گیا اور شیلے نے "ایڈونیس" کے عنوان سے اُس کا دردناک مرثیہ لکھا +

۱۸۲۷ء جرمن موسیقی داں "بیٹ ہوون" نے انتقال کیا۔

۱۸۲۹ء یونان نے جو ترکی سے باغی ہو چکا تھا آزادی حاصل کر لی۔

۱۸۳۰ء یورپ میں جا بجا انقلاب برپا ہوئے۔ لیورپول سے مانچسٹر تک (انگلستان میں) پہلی ریل چلی۔

۱۸۴۱ء کارلائل نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (اکابر اور اکابر پرستی) شائع کی۔ اس میں اُس نے حضرت محمدؐ، شیکسپیئر، کرامول نپولین وغیرہ پر اظہار خیالات کیا۔

۱۸۴۴ء امریکی مصنف ایمرسن نے اپنے شہرہ آفاق "مضامین" شائع کئے۔

۱۸۴۸ء یورپ میں جا بجا انقلاب برپا ہوئے۔ فرانس اور روما میں عارضی طور پر جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔

۱۸۵۷ء ہندوستان میں غدر ہوا اور سارا ہندوستان باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کے زیر اثر آگیا۔

۱۸۵۹ء چارلز ڈارون نے اپنی کتاب "اوریجن آف سپیشیز" (اصل انواع) شائع کی۔ مذہب کے رسمی خیالوں کی بیخ کنی بڑے شد و مد سے ہونے لگی۔

۱۸۶۱ء اطالیہ متحد ہو گیا اور وکٹر ایمینوئل بادشاہ ہوا۔

۱۸۶۲ء وکٹر ہیوگو نے جو فرانس کا سب سے بڑا شاعر اور دنیا کا ایک بڑا مصنف تھا اپنی بہترین تصنیف "لے مزرابل" (بدبخت لوگ) شائع کی۔

۱۸۶۵ء بعض یورپی قوموں کے ایک متحدہ بحری بیڑے نے اپنے تشدد سے جاپانیوں کو مجبور کیا کہ وہ بیرونی دنیا سے راہ و رسم قائم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جاپان نے اس ذلت کو اس قدر محسوس کیا کہ یورپ کے سامنے اپنی خودداری برقرار رکھنے اور بوقت ضرورت اُس کا مقابلہ کرنے کو تینتیس سال کی قلیل مدت میں وہ ایک دقیانوسی مشرقی ملک کی بجائے مغربی وضع کا ایک شائستہ و منظم دولت بن گیا۔

۱۸۶۷ء مشہور اشتراکی مفکر کارل مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ" شائع کی۔ یہ تھا اشتراکیت کا اعلان جنگ سرمایہ داری کے خلاف۔ آج کل کی تمام اشتراکی تحریکیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔

۱۸۷۰ء فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ یورپ میں فرانس کے رعب داب کا خاتمہ ہو کر جرمن قوم کا اثر پھیلا اور اُس کی قوت کا اعتراف کیا جانے لگا۔

۱۸۷۶ء ٹالسٹائے روس کے بہترین مصنف نے اپنا ناول "اینا کیرینینا" شائع کیا۔

۱۸۷۷ء روس اور ترکی کے درمیان جنگ۔

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ سرسید کی قومی تحریک نے ہندی مسلمانوں کو اُن کی غفلت سے بیدار کر دیا۔

۱۸۷۸ء برلن کا عہد نامہ جس کی رو سے ترکوں کی سلطنت میں سے بہت سے علاقے نکل کر بلقانی ریاستوں کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

۱۸۸۲ء جرمنی، اطالیہ اور آسٹریا میں اتحاد ثلاثہ قائم ہوا۔

۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی۔ اُس کا نصب العین شروع میں ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کا حصول اور بعد میں ہند کی آزادی کا حصول ہو گیا۔

۱۸۹۰ء دول یورپ نے باہمی سمجھوتہ کر کے افریقہ کے مختلف حصوں کو اپنی اپنی سلطنت میں شامل کرنا شروع کر دیا۔

۱۸۹۷ء روس اور فرانس میں اتحاد ہوا۔ انگلستان نے ۱۹۰۴ء میں فرانس کے ساتھ اور ۱۹۰۷ء میں روس کے ساتھ مفاہمت کرلی + دوسری مفاہمت کی رو سے ایران کو "دو اثر کے حلقوں" میں منقسم کرلیا گیا۔ ایک روسی دوسرا انگریزی۔

۱۸۹۸ء فرانسیسی سنگتراش "رودین" نے اپنا بت "بالزاک" نمائش میں پیش کیا۔ مائیکل انجیلو کے بعد وہ سب سے بڑا سنگتراش مانا جاتا ہے

۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء جنگ روس و جاپان ۔ مشرق نے دورِ حاضر میں پہلی بار ایک مغربی قوت کو نیچا دکھایا۔ مشرق میں بیداری کے آثار پیدا ہوچلے

۱۹۰۵ء بنگال (ہندوستان) میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی اور قومی جوش پھیلا۔ ہندوستان نے سیاست، علم، ادب، شعر، آرٹ سب شعبوں میں ترقی کرنی شروع کی اور گوکھلے، ٹیگور، اقبال، بوس، گاندھی سے مشاہیر پیدا کئے +

۱۹۰۹ء موسیو بلیریو ایک ہوائی جہاز میں اڑکر فرانس سے انگلستان جا پہنچا۔ اس کے بعد ہوابازی میں اتنی ترقی ہوئی کہ آج ہوائی سفر (مغرب میں) عام ذریعۂ آمد و رفت ہوگیا ہے + انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس کی ایجادات مثلاً ریل، تار ہوائی جہاز، گراموفون، لاسلکی وغیرہ نے دنیا کو ایک اور دنیا بنا دیا ہے +

۱۹۱۲ء چین ایک جمہوریہ بنا۔ مطلق العنانی اور زیاں کاری کا زمانہ ختم ہوا اور ترقی کا خون چین کے رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ رسم و رواج کی اصلاح شروع ہوئی اور نئے خیالات کی بے انتہا تیزی سے ترویج ہونے لگی۔ پندرہ سال بعد کیننٹن کے سیاسی گروہ نے ملکی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر چین کی قوت کو مستحکم کرنا شروع کیا +

بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اُس کا کچھ علاقہ چھین لیا +

انگریزی کپتان سکاٹ نے قطبِ جنوبی میں اپنی اکتشافی سیاحت کے دوران میں فاقے سے جان توڑ دی۔

۱۹۱۴ء جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ یہ ہولناک جنگ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد دنیا کچھ کی کچھ ہوگئی۔ مغلوب قوموں میں آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ اعلیٰ و اسفل طبقوں میں کشمکش شروع ہوئی۔ عورتوں میں خود اختیاری کی رَو دوڑی۔ افراد کے دل میں ذاتی آزادی کے خیالات نے ایک ہلچل مچادی +

۱۹۱۵ء آئین سٹائن نے اپنا نظریہ "اضافیت" مکمل طور پر شائع کیا۔ اس نظریے سے زمان و مکان کے اساسی تصورات میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہوگیا۔

۱۹۱۷ء روس میں انقلاب ہوا۔ بولشویک برسرِ اقتدار ہوگئے۔ اشتراکیت نے پہلی بار اپنی ایک منظم حکومت قائم کی۔ سویٹ روس بہت سی متحدہ جمہوری حکومتوں پر مشتمل ہے۔

انگلستان نے اگست میں اعلان کیا کہ اس کا مقصد ہندوستان کو بتدریج خود اختیاری حکومت عطا کرنا ہے +

۱۹۱۹ء ورسائی کا عہدنامہ ہوا۔ جرمنی کو ذلیل کیا گیا۔ یورپ میں کئی نئی قومیں (پولینڈ، زیکوسلوویکیا، فنلینڈ، ایسٹونیا، لیٹویا) رونما ہوئیں۔ ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ بعض نئے ملکوں کو اتحادیوں نے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ آسٹریا اور ہنگری چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوکر رہ گئے۔

۱۹۲۰ء لیگِ اقوام کا پہلا اجلاس ہوا۔ بین الاقوامی عدل کی ایک عدالت ہیگ میں قائم کی گئی۔ آئندہ گیارہ سال میں بہت سی بین الاقوامی انجمنیں بنیں۔ چھ سال بعد جرمنی لیگ کا رکن بنا۔

دمشق و شام کے عربوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔

۱۹۲۱ء انگریزی ڈراما نگار برنارڈ شا نے اپنا ڈراما "بیک ٹو میتھوزلا" شائع کیا۔ اِس میں اُس نے دکھایا کہ انسان آغازِ آفرینش میں کیا تھا آج کیا ہے اور ۳۱۹۲۰ء میں کیا ہوگا +

۱۹۲۲ء ترکوں نے حملہ آور یونانیوں کو پے در پے شکست دے کر ایشیائے کوچک سے باہر نکال دیا۔ اس کے دو سال بعد خلافت کو ملیا میٹ کر کے مصطفےٰ کمال نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور قدامت پسندی کے خیالات کو خیرباد کہی۔ اسلامی ممالک میں آئندہ چند سالوں میں بیداری کے آثار عیاں ہوتے۔ ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ مصر میں زاغلول پاشا مراکش میں عبدالکریم، شام میں دروسیوں اور نجد میں ابنِ سعود نے اپنا سر بلند کیا۔

مسولینی نے اطالیہ میں اپنی مستبدانہ حکومت قائم کر لی، بظاہر شاہی حکومت رہی لیکن در اصل مسولینی قومی رہنما بن گیا۔

۱۹۲۴ء لینن روسی جمہوری مدبر و ناظم کی موت۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی روح و رواں لینن ہی تھا اور اُس نے اپنی محنتِ شاقہ اور مسلسل عرق ریزی سے روس کو ایک عظیم الشان اشتراکی دولت بنا دیا +

۱۹۲۶ء ہندوستان کے بنگالی سائنس دان بوس نے اپنے اس نظریے کو کہ پودوں اور دھاتوں میں حیوانوں کی طرح جان ہوتی ہے آکسفورڈ میں ایک علمی مجلس کے سامنے پیش کر کے مغرب کے علما و فضلا کو حیرت میں ڈال دیا +

۱۹۲۸ء امریکہ کے مجوزہ کیلگی معاہدے پر اقوام نے اپنے دستخط ثبت کئے اور اقرار کیا کہ وہ جنگ سے احتراز کریں گی۔

جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی قوت روز بروز بڑھتی گئی +

روس اپنے "پنجسالہ لائحۂ عمل" پر عمل کرنے لگا +

چین خانہ جنگی سے فارغ ہو کر کچھ نہ کچھ متحد ہو گیا۔

۱۹۲۹ء انگلستان اور مصر میں مفاہمت ممکن نہ ہو سکی۔ امیر امان اللہ افغانستان کے تخت سے دست بردار ہو گیا۔

کانگرس نے "پورنا سوراج" کا مطالبہ کیا اور ہند کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

۱۹۳۰ء گاندھی نے ستیہ گرہ کی پُر امن تحریک شروع کی۔ ہندوستان میں جا بجا حب الوطنی اور ایثار کا جوش رونما ہوا +

۱۹۳۱ء ہندوستان میں شورش پھیلی، ہندو مسلم اختلافات بڑھے۔ انگلستان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ انگلستان میں قدامت پسندوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اک عالمگیر معاشی سرد بازاری رونما ہوئی۔

۱۹۳۲ء یکم جنوری "ہمایوں" کی دسویں سالگرہ!

"مؤرخ"

کسی کی باتیں

افق پہ تاریکی چھا رہی ہے — خموشی دنیا میں آ رہی ہے
شبِ سیہ نیند لا رہی ہے — پیامِ راحت سنا رہی ہے
وہ شور خاموش ہو چکے ہیں
فضا کی گودی میں سو چکے ہیں
مگر مرے دل میں ایک محشر اُٹھا رہی ہیں کسی کی باتیں

کہاں وہ گزرے ہوئے زمانے — کہاں وہ اس دَور کے فسانے
وہ داستاں ختم کی قضا نے — اب آئی ہیں کیوں مجھے ستانے
غمِ گزشتہ کی یاد کیسی؟
یہ آفتِ خانہ زاد کیسی؟
جو سو چکا غم اُسے بھلا کیوں جگا رہی ہیں کسی کی باتیں

یہ ظلم و جور و جفا کی دنیا — یہ رنج و کرب و بلا کی دنیا
یہ دردِ لا انتہا کی دنیا — یہ قہر والے خدا کی دنیا
اسے فراموش کر رہا تھا
کہ زخم سینے کا بھر رہا تھا
مگر وہ خونیں حکایتیں پھر سنا رہی ہیں کسی کی باتیں

وہ صورت اب خاک میں دبی ہے — لبوں پہ اب مہرِ خامشی ہے
مگر مری جان پر بنی ہے — وہی مرے دل کو بے کلی ہے
لحد کی تاریکیوں سے یکسر
مرے تخیل کا زخمہ لے کر
سکوتِ شب میں رباب سا اک بجا رہی ہیں کسی کی باتیں

ممتاز حسن

مہابلی

(ایک ایکٹ کا تاریخی ڈراما)

ارکان

مہابلی جلال الدین اکبر .... شاہنشاہِ ہندوستان
ابوالفضل .... دستورِ اعظم
دیرا .... رانا اودے سنگھ والئ چتوڑ کی مہارانی
پدمنی .... رانا اودے سنگھ کی بہن
پرتاب سنگھ .... ایک راجپوت کماندار
عبدالکریم .... شاہی فوج کا ایک افسر
حاجب ....
مقام .... چتوڑ کے سامنے شاہی فرودگاہ
وقت .... دونوں وقت مل رہے ہیں

(شاہنشاہ اکبر ابوالفضل سے سرگرمِ تکلم ہے)

اکبر۔ ہاں! کہنے تو سکتے ہیں کہ میدان اپنے ہاتھ رہا۔ مگر اسے فتح کہنے کو دل نہیں مانتا۔ سچ تو یہ ہے کہ راجپوتوں کی اس شکست پر ہزار فتح قربان ہے ٹڈی دل لشکر اور مٹھی بھر سپاہیوں کا کیا مقابلہ... ملاجی! یہ شجاعت کی فتح نہ تھی۔ یہ فن سپہ گری کی کامیابی نہ تھی۔ فقط تعداد کا سیلاب تھا جو راجپوتوں کو بہالے گیا۔ آہ! ان کا نوعمر سپہدار جس کی شکل آنکھوں سے اوجھل ہونے میں نہیں آتی معرکۂ جنگ میں اس طرح جھوم رہا تھا۔ گویا کسی کھیل میں مشغول ہے۔ مادرِ گیتی ایسے فرزند ہر روز پیدا نہیں کیا کرتی سبحان اللہ راجپوت کس شان سے لڑے۔

ابوالفضل۔ ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ باغیوں نے ہمارا اچھا مقابلہ کرلیا۔

اکبر۔ (بات کاٹ کر) وہ جانتے تھے کہ اس میدان میں اترنا موت کے منہ میں جانا ہے لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ اور ملک الموت سے دست و گریبان ہوگئے ایک ایک سپاہی کٹ کٹ کر گرا مگر قدم پیچھے نہ ہٹا۔ قبضہ پر ہاتھ رہا۔ گو ہاتھ پر ضعف کا قبضہ تھا۔ ملک گیری و جہاں کشائی کے لئے بہت میدان ہے مگر ایسے جیدار سپاہی کہاں۔

ابوالفضل۔ عالم پناہ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر حماقت کردینا شجاعت کا دوسرا نام ہے۔

(دور سے گانے کی آواز آتی ہے)

اکبر۔ ہاہا کیا لے ہے اور کس قدر تاثیر میں ڈوبی ہوئی۔ حاجب!

(حاجب آتا ہے)

حاجب۔ حاضر جہاں پناہ!

اکبر۔ کون گاتا ہے۔

حاجب۔ ہندو فقیر ہیں۔ اور بار بار یہی پر مصر ہیں۔ بہت ٹالا مگر جانے کا نام نہیں لیتے۔ اور ویسے بھی حکم یہی ہے کہ فقیروں اور گویّوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جائے۔

اکبر۔ تو حاضر کرو۔ دیکھیں کیا کہتے ہیں۔

(حاجب جاتا ہے)

ابوالفضل۔ قبلۂ عالم! یہ آواز غمازی کر رہی ہے کہ یہ فقیر نہیں۔ ہر کس و ناکس کا خلوت کدۂ شاہی میں آنا جان نثاروں کے لئے موجب صد اضطراب ہے۔

اکبر۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے ویسے ہی اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ فضل جی! دشمن پر اعتماد کرو گے تو وہ بھی رام ہو جائیگا۔ یہ نسخہ مجرّب ہے۔ اور کبھی خطا نہیں گیا۔

(حاجب فقیروں کو لے کر حاضر ہوتا ہے)

ایک فقیر۔ مہابلی پر رام رحیم کا سایہ۔ کوئی کشٹ پاس نہ پھٹکے سکھ کی نیند سونے کی جاگرتا ہو۔

اکبر۔ سائیں جی کس ملک سے آنا ہوا۔

فقیر۔ بابا جب دیش تھا تھا۔ اب دیس پردیس ایک ہو رہا ہے۔ نہ ہمارا کوئی دیش نہ ہم کسی دیش کے بسیا۔ بھارت ماتا نے گود سے اچھال کر پھینک دیا اب پڑے بھٹکتے ہیں۔

اکبر۔ یہ فقیری بانا کب سے پہنا۔

فقیر۔ جب پہلا پھٹ گیا نیا پہن لیا۔

اکبر۔ کوئی بیوی بچہ۔

فقیر۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔

اکبر۔ مجھے ملنے کا کس طرح دھیان آیا۔

فقیر۔ سنتے تھے کہ مہابلی سادھو اور گیانی کی پالنا کرتے ہیں اس لئے پرکشا کے لئے چلے آئے۔

دوسرا فقیر۔ یہ جا کو راجا کے گن گاتے سنا۔ تو پرن کیا کہ مرنے سے پہلے ایسے مہابلی کے درشن کریں گے۔

ابوالفضل۔ تم آج ہی ظلِ الٰہی کے دیدار سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے تھے۔ کیا انہیں معلوم تھا کہ سفر آخرت کا وقت قریب ہے۔

پہلا فقیر۔ موت جگہ اور سماں نہیں ڈھونڈتی۔

اکبر۔ بیشک موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

دوسرا فقیر۔ جب روئی کا چولا بدل ڈالا تو مٹی کا چولا بدلنے میں کیا جاتا ہے۔

اکبر۔ یہ تو کہو یہ نور کا گلا کہاں سے پایا۔ عورت کی آواز کی گھلاوٹ ہے مرد کی آواز کی گرج ہے۔ میں نے ایسا نغمہ تان سین سے کبھی نہیں سنا۔

فقیر۔ یہ سب مہابلی کی سبھا کا چمتکار ہے۔ بھلا ہم گنوار گانا بجانا کیا جانیں۔

(حاجب ایک سربمہر لفافہ لاکر ابوالفضل کو دیتا ہے۔ اور ابوالفضل بزبان فارسی اکبر کو پڑھ کر سناتا ہے اسے سن کر)

اکبر۔ عبدالکریم کو حاضر کرو۔

(حاجب جاتا ہے۔ دونوں فقیر ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں عبدالکریم داخل ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر فقیر جھجک جاتے ہیں)

اکبر۔ فقیرو۔ تمہارے تیور کہہ رہے ہیں کہ تمہاری اس شخص سے پہلے کی جان پہچان ہے۔ ہاں کہو کب اور کس حالت میں اس سے ملنا ہوا۔

پہلا فقیر۔ اس سنسار میں ہزاروں سامنے آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ کس کو کب اور کس طرح دیکھا۔ اور جو اس شخص کے بچن اس کے چیتے کی طرح پکے ہوتے۔ تو مہابلی کی تمام باتوں کا سندیسہ آپ سے آپ مل جاتے گا۔

(باہر سے شور و غل سنائی دیتا ہے)

ابوالفضل۔ حاجب ذرا لپک کر دیکھنا یہ کیسا غل ہے۔

(حاجب آتا ہے)

حاجب۔ (ابوالفضل سے) حضور ایک راجپوت گرفتار ہوا ہے جو مسلمانوں کے ایسا لباس پہنے چکر لگا رہا تھا حکم شاہی کے لئے سپاہی اسے پکڑ لائے ہیں۔

(سپاہی پرتاب سنگھ کو لاتے ہیں)

اکبر۔ کون ہو تم اور یہاں کس غرض سے آئے تھے۔

ابوالفضل۔ جاسوس ہو پہاڑی کی چوٹی زیادہ محفوظ تھی اس سن و سال کیلئے

پرتاب۔ کون ہوں یہ میری کٹار بتا سکتی ہے اور کیوں آیا یہ کسی راجپوت سے پوچھنا بیکار۔

اکبر۔ ان فقروں کو جانتے ہو۔

پرتاب۔ میں دہلی کا نوکر نہیں ہوں تو اس کے مہاراج کی جان کا لاگو ہوں اس لئے آپ مجھے جواب دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

اکبر۔ جان کی خیر چاہتے ہو تو صاف صاف کہو۔

پرتاب۔ بھارت ورش میں یہ پہلی بار ہے کہ کسی کو یہ خیال آئے کہ راجپوت کو موت سے ڈرا سکتے ہیں۔

ابوالفضل۔ نوجوان۔ آخر تمہارے بیوی بچے ہیں اُن پر رحم کرو۔

پرتاب۔ راجپوت کی بیوی اس کی آن ہے۔ اور اس کی زندگی صرف اپنے دیش کے لئے ہے۔

اکبر۔ یہ باتیں اکثر کہی جاتی ہیں۔ اور پھر کہنے والا پشیمان ہوا کرتا ہے عقل سے کام لو۔ ان اڑان گھاٹیوں سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مرد ہو تو جو دل میں ہے کہہ ڈالو۔

پرتاب۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں۔ کہ کوئی تدبیر کوئی تعزیر میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکتی۔

اکبر۔ یہ سمجھنا تمہاری بھول ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا

پرتاب۔ اتنا جانتا ہوں جو جانتے ہیں وہ پوچھا نہیں کرتے۔

اکبر۔ زندگی سے بیزار ہو اس لئے اس قدر گستاخ ہو بہت خوب اگر مرنے پر تلے ہو۔ تو جاؤ کل طلوع آفتاب سے پہلے تمہیں چتوڑ کے چوک میں پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ ملاجی۔ حکم جاری کرو سپاہیو اسے لے جاؤ۔

(سپاہی پرتاب سنگھ کو لے جاتے ہیں)

پہلا فقیر۔ مہابلی! دلی کے والی! بحکم مہاراج جیسے نیائی اور دیالو کو سجتا نہیں دشمن ہلا ہے ڈنڈا اور کسی پر پڑ رہا ہے اسکا دھیان رکھئے مہاراج

اکبر۔ مجھے اس گناہ سے بچانا۔ اور اسکی زندگی کی گرہ کو کھولنا تمہاری لب کشائی پر منحصر ہے۔

(فقیر بانا اتار دیتے ہیں اور دو عورتیں اس بھیس سے نمودار ہوتی ہیں)

پہلا فقیر۔ لیجئے یہ رہا سب راز میں بپتا کی ماری ویر ارا رانا اودے سنگھ کی مہارانی ہوں اور یہ ان کی بہن پدمنی ہے جب ہم نے دیکھا کہ آپ کا قبضہ چتوڑ پر ہو گیا۔ رانا لڑائی سے لٹیا ہے اور راجپوتی آن کو بٹا لگا کر پہاڑیوں میں منہ ڈھانپ پڑا رہا ہے۔ تو ہم دونوں نے مردانہ کپڑے پہنے اور سینا کو سنبھال کر پھر تیار ہوئیں پر ہمارا حملہ ایسا تھا جیسا پہاڑ پر بادل کی بوند کا ٹوٹنا آپ کا کچھ نہ بگڑا اور ہماری فوج پس گئی دیش ہاتھ سے نکل گیا نراس ہو گئے۔ تو ہم دونوں نے کہ شخص سے بدلہ لینے کا پرن کیا جس کے کارن یہ سب کچھ ہوا ہمارا ارادہ تھا کہ آپ کو کٹار کے گھاٹ اتاریں اور پھر آپ ڈھیر ہو جائیں۔ پر آپ کی شکل دیکھتے ہی ہماری بجلیاں بل نہ رہا اور کٹار کی دھار پر پانی پھر گیا۔ اس شخص کی (عبدالکریم کی طرف اشارہ کرکے) ہم نے جان بچائی ہمیں آشا تھی کہ وہ ایک مرد اور سپاہی ہے اور کسی وقت ہمارے آڑے آئے گا پھر اس نے جو بس ہو سکتا تھا ہو یا۔ اب سرکار جو چاہے ہمیں سزا دے پر پرتاب بے قصور ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

(دونوں دوزانو ہو جاتی ہیں)

اکبر۔ عالیشان مہارانیو! قابل پرستش دیویو! اٹھو اٹھو! اب مجھے شرمسار نہ کرو۔ ایسی بہادر۔ شریف خاتونوں کو مجھ سے ناچیز انسان کے سامنے جھکنا زیب نہیں دیتا۔ تمہاری صداقت شجاعت عصمت شعاری اور خودداری کا اعتراف کرنے کے لئے ملاجی کی زبان اور قلم درکار ہے عبدالکریم نے تمہاری شکایت نہیں کی اور تمہارے حق میں کلمہ خیر کے سوا کچھ نہیں کہا۔ عبدالکریم کی اطلاع سے پہلے میں جان گیا تھا کہ اس لباس میں حسن نسوانی مستور ہے۔ رانا بھاگ گیا۔ یہ اس کی غلطی تھی میں اس کا ملک نہیں چاہتا۔ مجھے تو اس کے دل کی ضرورت تھی۔ میری ایک نگاہ ملک کے ملک فتح کر سکتی ہے لیکن اس کی کامرانی تب قابل ستائش ہے جب وہ دلوں کو مسخر کرے۔ آپ مجھ سے کیوں خائف ہیں کیا اس لئے کہ میرا اور آپ کا مذہب مختلف ہے۔ یہ تو کوئی مغائرت کی بات نہیں کسی کو میٹھا پسند کسی کو نمک۔ ایک کو سبز رنگ بھاتا ہے دوسرے کو زرد۔ تو یہ باتیں تو جھگڑے کی نہیں میرا مرنا جینا ہندوستان کے ساتھ ہے۔ ان سے لونگا تو انہیں دونگا ترکستان نہ لیجاؤں گا۔ تو پھر یہ نفرت کیوں۔

ابوالفضل۔ رہی مذہب کی تمیز رنگ و بو تو یہ بھی چند روزہ بات ہے جب ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔ تو شوالہ و مسجد پہلو بہ پہلو بنائیں گے۔

اکبر۔ قول سے کس طرح یقین آئیگا فضل جی! فعل خود ان کو قائل کر دیگا۔ اچھا مہارانیو کہو میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

پدمنی۔ ہماری موت کا حکم دیجئے کہ ہم اور ہماری رسوائی ایک ساتھ بھسم ہو جائیں۔

اکبر۔ کیا کہہ رہی ہو۔ اس شاندار کارنامے کو کون باعث رسوائی کہہ سکتا ہے۔

ویرا۔ مہاراج! اس سے زیادہ رسوائی اور جگ ہنسائی کی بات اور کیا ہو گی۔ کہ مہارانا چتوڑ کے رنواس کی دو استریاں غیر کی چوکھٹ پر کھڑی ہوں۔ یہ بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی مہابلی! اب تو یہ زرہ بھی اجیرن ہو گیا ہے صرف موت ہی ہماری پردہ پوش ہے۔

اکبر۔ فرض کرو میں یہ استدعا مانوں۔

ویرا۔ تب ہم کہیں گے کہ مہابلی میں اتنا بھی بل نہیں کہ ایک کمزور عورت کی ننھی سی بات کو پورا کر سکیں۔

اکبر۔ فضل جی۔ آپ کی تاریخ میں اس عزم و استقلال کا کیا جواب ہے۔

ابوالفضل۔ آپ کے ہاں سب عورتیں آپ جیسی ہیں۔

ویرا۔ رام رام! ہمارا ان سے کیا مقابلہ۔ ان کی لاج ان کی آن کے ہم تو پاسنگ بھی نہیں اتنی رسوائی انہیں کب کی مار ڈالتی۔

اکبر۔ ہندوستان کی مایہ ناز مہارانیو مانگو مانگو کیا چاہتی ہو۔

ویرا۔ ہم کیا جانیں مانگنا کسے کہتے ہیں۔

اکبر۔ تو میں بتاتا ہوں کہ بے مانگے دینا کسے کہتے ہیں کل صبح شاہانہ احتشام کے ساتھ چتوڑ کا تاج تمہارے حوالہ کیا جائے گا۔

ویرا۔ پر شرطیں کون مانے گا۔

اکبر۔ آہ عورت کو خوش کرنا مشکل ہے۔ تو میں آپ کا ملک بلا کسی شرط واپس کرتا ہوں۔

ابوالفضل۔ جہاں پناہ

اکبر۔ جو ہوا سو ہوا۔

پدمنی۔ کیا دنیا اس سے بڑھ کر مہابلی پیدا کر سکتی ہے۔

ویرا۔ مہابلی کی جے۔

(پردہ)

نور الٰہی محمد عمر

زندگی سے

اے زندگی! خبر نہیں مجھ کو کہ کیا ہے تُو؟
تاریکیٔ قضا ہے کہ نُورِ خدا ہے تُو؟

ظُلمت ہے تُو کہ نور مگر یہ ضرور ہے
میں ہم نوا ترا ہُوں مری ہم نوا ہے تُو

مل جُل کے کاٹنا ہے یہ مشکل سفر ہمیں
میں رہنما ترا ہوں مری رہنما ہے تُو

کیا ڈھونڈتے ہیں ڈھونڈنے والے کہ زندگی!
سب کچھ ہے تجھ میں تُو ہے سوا ما سوا ہے تُو

بہتر ہے یہ تلاشِ حقیقت کو چھوڑ کر
دیکھے تجھے کوئی کہ حقیقت نما ہے تُو

ناممکن البیاں ہے جو عشاق کیلئے
شاید کہ حُسنِ شاہدِ حق کی ادا ہے تُو

جی کر جہاں میں جان لے کوئی تو جان لے
کوئی بھی ورنہ کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہے تُو

گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے ہر گھڑی
کچھ تھی ابھی ابھی کچھ اور اب کیا سے کیا ہے تُو

ہر دم نیا ظہور ہے اک تیرے نور سے
تاریک کائنات کا روشن دیا ہے تُو

پیدا ہے تجھ سے گنبدِ کون و مکاں میں گونج
کس مضطربِ اسیر کی مضطر صدا ہے تُو؟

حرکت، سکوں، کمال سبھی تیرے دم سے ہیں
یہ صورتیں فنا کی ہیں رُوحِ بقا ہے تُو

تجھ سے چلے جو بچ کے وہی تیری ضرب کھائے
تجھ سے ملے جو بڑھ کے اُسی کا عصا ہے تُو

تیرا بنے جو جان چھڑکتی ہے اُس پہ تُو
جس دل میں تیرا درد ہو اُس کی دوا ہے تُو

ہم کار ہے تو اُس کی جو مختار ہو گیا
مجبور ہو چکا ہے جو اُس کی قضا ہے تُو

پھر زندہ کر دے زندہ دل اے زندگی مجھے
سو ظلمتوں میں ڈھونڈ لے تابندگی مجھے

بشیر احمد

فلسفۂ زندگی

بے کار ہے فلسفے کو چھوڑو
دُنیا کے بُرے بھلے کو چھوڑو

چل نکلو کہیں مکاں سے باہر
رکھو قدم آستاں سے باہر

اِس قید کا غم سہوگے کب تک
صید اپنے بنے رہوگے کب تک

دنیا ہے وسیع زیست آزاد
آزاد ہے جو وہی ہے دل شاد

بس چھوڑ دو دل کی کاہشوں کو
اور توڑ دو اُٹھ کے بندشوں کو

آئین، تمیز، علم، دستور
وہ جن سے ہیں اہلِ عقل مشہور

اور وہ جنہیں کہتے ہیں کتابیں
انسان کے فکر کی شرابیں

ان سب سے رِہا کرو خودی کو
جی لینے دو کچھ تو زندگی کو

دیکھو وہ چمک رہا ہے سورج
کیا باغ میں پھولوں کی ہے سج دھج

کیا پتے ہیں کیسے لہلہے ہیں
کیا چڑیاں ہیں کیسے قہقہے ہیں

ہے آج خوشی کے راج کا دن
جو کچھ ہے فقط ہے آج کا دن

ناچو ہنسو کودو خوب کھیلو
دوڑو چلو اچھلو ڈنڈ پیلو

کیا دھوپ سے پھولتی ہیں کلیاں
پھولوں میں عجب ہیں رنگ رلیاں

ہر ذرہ ہے روشنی سے مسرور
ہر پتہ ہواؤں میں ہے مخمور

چڑیاں ہیں خوش اور خوش ہیں حیواں
صد حیف کہ وقفِ غم ہو انساں

کھیتوں میں چلو کسان کے پاس
انساں کو ہے کھیت کی ہوا راس

ملتی ہے جو آدمی سے فطرت
بن جاتی ہے زیست دل کی قوت

کھیتی ہے پسینے کی کمائی
محنت کی ہے معجزہ نمائی

قدرت سے ہے ہم کلام دہقاں
دہقان ہے بہترین انساں

باتیں کرو اُس سے آج چل کے
جھگڑے ہیں فضول آج کل کے

کل کیا ہوا تم سے کل ہو کیا کچھ
تم سوچتے کچھ ہو اور خدا کچھ

چھوڑو بھی یہ سوچنے کا دھندا
عاقل کے لئے ہے سوچ پھندا

اُٹھو کہ جگا رہی ہے فطرت
دوڑو کہ بلا رہی ہے فطرت

گھر بار سے نکلو دور جاؤ
کچھ دیکھو جہاں کو کچھ دکھاؤ

دہقان سے مل کے ہل چلاؤ
سستاؤ کماؤ مسکراؤ

تا تم کو بھی لطفِ زیست آئے
دل کام میں حق کا بھید پائے

یا آؤ اور اُن سے آکے مل لو
تہذیب سے واسطہ ہے جن کو

شائستہ ہیں جو پہ مضمحل ہیں
مغرور کبھی کبھی خجل ہیں

دولت کے معاملے ہیں ہر سُو
شہرت کے مقابلے ہیں ہر سُو

کیا بغض و جفا کی کاوشیں ہیں
کیا لطف و وفا کی کوششیں ہیں

پڑتی ہے جو دقتوں پہ دقت
پاتی ہے فروغ اُن کی فطرت

دُنیا ہے وہ زیست کا اکھاڑا
جس کو غم و حرص نے اجاڑا

لیکن جو بسا اُجڑ اجڑ کر
پیہم جو بنا بگڑ بگڑ کر

اس جنگ میں تم بھی کام آؤ
انساں ہو تو کر کے کچھ دکھاؤ

آئے کوئی ہے جو مردِ میداں
مشکل میں پڑی ہے نوعِ انساں

مشکل ہی مگر ہے رُوح پرور
ہستی ہے سوار مشکلوں پر

ہے صاحبِ اختیار ہستی
بڑھنے کو ہے بے قرار ہستی

چل نکلو پھر اپنے گھر سے تم بھی
رہ جائے نہ دل میں بات دل کی

ارماں جو ہیں دل کے وہ نکالو
دیکھو سنو دوڑو ڈھونڈو پا لو

آزاد ہوں قوتیں تمہاری
مشکور ہوں ہمتیں تمہاری

دہقان بنو کہ مردِ مزدور
فطرت کو مشقتیں ہیں منظور

دیہات میں ہے سکوں کی برکت
شہروں میں ترقیوں کی حرکت

ہے زیست بلند بھی نگوں بھی
حرکت بھی ہے اس میں اور سکوں بھی

دونوں سے ہے زندگی کی قوت
دونوں سے ہے زندگی کی عظمت

خوب اپنی جگہ پہ ہے ہر اک شے
تھوڑی بھی ہے گر تو وہ بہت ہے

پھر اُٹھو بھی فلسفے کو چھوڑو
اور زیست کی سمت منہ کو موڑو

زندہ وہی فلسفی ہے اس جا
خود زندگی فلسفہ ہے جس کا

بشیر احمد

ایک خط

تمہیں یہ خط دیکھ کر حیرت ضرور ہوگی۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ اگر بے خبر ہوتی تو شاید یہ کبھی محسوس نہ کرتی کہ میرے پہلو میں دل ہے۔ مجھے تو تم نے قفس میں ڈال دیا۔ سورج۔ چاند۔ اور آسمان کی رنگینیوں کو بھی اوجھل کر دیا ہوتا۔ پھر شاید میرے سوئے ہوئے احساسات کبھی نہ جاگتے۔

تم سمجھو گے کہ میرے دماغ میں خلل ہے۔ شاید میں خود نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہوا۔ کل میں ایک حد تک خوش تھی۔ اچھا کھانے کو ملتا۔ اچھا پہننے کو۔ رہنے کو خوبصورت مکان۔ موٹریں۔ نوکر چاکر۔ ہر قسم کا آرام نصیب تھا۔ لیکن رات میں باغ میں پھرنے کو نکلی۔ چاندنی رات تھی۔ نکھری نکھری روشنی۔ پھولوں سے فضا معطّر۔ اس پر کسی نے بانسری پر اک راگ بجانا شروع کر دیا۔ خدا جانے مجھے کیا ہوا۔ میری آنکھوں سے جیسے اک پردہ اٹھ گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کس قدر خالی ہے۔ رنگینیوں سے۔ شیرینیوں سے خالی، وہ پانچ سال جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ میں سترہ سال کی تھی جب تم سے بیاہی گئی۔ ماں باپ نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی بھی ہوں یا نہیں۔ بس میری منگنی کر دی گئی۔ لوگوں نے کہا بڑی بھاگوان ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے۔ حسین۔ تعلیم یافتہ۔ جوان۔ اونچے گھر میں جائے گی وہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں نہ جانتی تھی کہ شادی کسے کہتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں لڑکیوں کو زندگی سے بے بہرہ رکھنے کی ہر طرح کوشش کی جاتی ہے۔ خیر میں تمہاری دلہن بنی۔ زندگی کے راز مجھ پر کھلنے لگے۔ بس پھر وہ پانچ سال شروع ہوئے جن میں میری روح کو ملیامیٹ کرنے کی کوئی کوشش باقی نہ رہی۔ لیکن میں یہ نہ جانتی تھی ——— کل رات تک۔

تم صبح اٹھتے ہو۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر پکارتے ہو، "ناشتہ تیار ہے؟" پھر دفتر چلے جاتے ہو، چار بجے واپس آ، چائے پی ٹینس کے کپڑے پہن، کلب کا رخ کرتے ہو۔ رات کو اکثر کھانا باہر ہی کھاتے ہو۔ پھر جا کسی کیفے میں ناچتے ہو۔ رات کے دو تین بجے واپس آ، پڑ کر سو رہتے ہو۔ جو کبھی بھول کر کھانا گھر پر کھا لیتے ہو تو کھانے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ "بس کوئی شور نہ کرے ہمیں دفتر کا کام کرنا ہے!"

میرے لئے دن پہاڑ، راتیں سنسان، کئی دفعہ جی چاہتا ہے کہ چیخوں، پکاروں، کسی طرح وقت کو جلدی جلدی گزار دوں۔ کبھی دل کو کتابوں میں ڈالتی ہوں۔ کبھی سلائی میں کبھی گھر کے کام میں لیکن پڑھنے پڑھتے۔ اور سیتے سیتے آنکھوں میں بھی درد ہونے لگتا ہے۔ گھر کے کام میں بھی اب جی نہیں لگتا۔ شاید اگر تم امیر نہ ہوتے۔ میرے لئے نوکر چاکر نہ ہوتے۔ کھانا خود پکانا ہوتا جھاڑو خود دینا ہوتا۔ تو میرا جی کچھ لگ جاتا۔ لیکن اب تو زندگی گزارنی دشوار ہو رہی ہے۔ قسمت نے مجھے اس ایک خوشی

سے بھی محروم رکھا۔ جو ایک عورت کو نصیب ہوتی ہے۔ میرے کوئی بچہ نہیں۔ کل تک میں اس بات پر پہروں آنسو بہاتی۔ لیکن آج میں خوش ہوں ـــــ ہاں خوش! کیونکہ میرے پاؤں اس بیڑی میں جکڑے ہوئے نہیں۔ میں آزاد ہوں!

یہ نہیں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو۔ میرے آرام کا ہر وقت خیال رکھتے ہو۔ لیکن اسی طرح جیسے تم اپنے چہیتے گھوڑوں اور کتوں کا خیال رکھتے ہو۔ شاید ان سے کچھ زیادہ۔ لیکن تم کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ میں بھی ایک روح رکھتی ہوں۔ ایک روح جو تڑپتی ہے روشنی اور موسیقی کے لئے۔ اگر میں سیر کو جانا چاہتی ہوں تو بند موٹر میں جانا ہوتا ہے۔ کبھی پردے والے بکس میں بیٹھ کر سینما دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن تم برابر یہی کہتے ہو کہ ایسی چیزیں بہت نہ دیکھنی چاہئیں۔ ایک دو سہیلیاں ہیں۔ کبھی ان کے ہاں چلی جاتی ہوں۔ لیکن روز روز کون کسی کے گھر جائے۔ تم ہی بتاؤ میری زندگی میں کیا لطف ہے؟ کیا مجھے تم سے محبت نہیں؟ شاید۔ ہوگی۔ پانچ سال کا ساتھ ہے۔ ایک قسم کا لگاؤ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر ہندوستانی عورت شوہر کی اُلفت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لیکن میں کیا جانوں کہ محبت کیا چیز ہے؟ میں تو صرف اپنے چچاؤں۔ ماموؤں اور بھائیوں ہی سے ملی تھی کہ تم سے بیاہی گئی۔ مردوں کی صحبت ہندوستانی لڑکیوں کے لئے بُری سمجھی جاتی ہے لیکن عورتوں کی صحبت ہندوستانی مردوں کے لئے بُری نہیں سمجھی جاتی۔ تم روز کئی لڑکیوں کے ساتھ بولتے۔ ہنستے۔ ناچتے ہو۔ اور ہمیں اندر بند کر رکھا ہے۔ کیا ہمارا جی نہیں چاہتا کہ ہم بھی اور لوگوں سے ملیں۔ ہنسیں، بولیں۔ تبادلۂ خیالات کریں؟

تم پڑھ پڑھ کر حیران ہو رہے ہوگے کہ یہ خیال میرے دل میں کس طرح آگئے۔ آج تک میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہاں کل تک یہ خیالات میرے دل میں نہ تھے۔ لیکن رات . . . . . . اس بانسری کے راگ نے میرے سوئے ہوئے دل میں ایک درد پیدا کر دیا۔ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے . . . . . . لیکن اب میں آرام نہیں چاہتی۔ میں زندگی چاہتی ہوں۔ ہاں زندگی جس میں مشکلیں ہوں۔ تڑپ ہو۔ کوشش ہو۔ موسیقی ہو!

اس لئے اور صرف اس لئے میں آج رات تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ تم چونک پڑو گے۔ تمہاری آنکھیں غصے سے سرخ ہو جائیں گی۔ پھر تم سمجھو گے کہ ضرور میں نے مذاق کیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے۔ بالکل سچ!

شاید خیالات کے اُس ہجوم کا جو کل رات مجھ پر ٹوٹ پڑا آغاز اس وقت ہوا تھا جب تم نے اپنے کسی کام کے لئے ایک ٹائپسٹ کو بُلایا۔ وہ بھی ایک لڑکی تھی، میری طرح۔ لیکن کس قدر آزاد! میں نے اُس سے باتیں کیں۔ وہ خوش تھی، ہاں مجھ سے زیادہ خوش۔ گو اس کے پاس موٹریں نہ تھیں۔ نوکر نہ تھے۔ وہ ایک فلیٹ میں ایک اور لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن وہ دونوں سارا دن کام کرتیں، اور شام کو خوش خوش تفریح کے لئے باہر چلی جاتیں۔ اپنا کماتیں اور کھاتیں۔ نہ کسی کا حکم و ہدایت، نہ کسی کی روک تھام۔ اپنی زندگی کی آپ مالک۔ اپنے نفس کی خود مختار۔ مجھے تو تم نے اور تم سے پہلے ماں باپ نے ایک کھلونا بنا رکھا۔ میرا دماغ میری روح ترقی سے محروم ہیں۔ زندگی سے مجھے تم دور ہی دور رکھتے ہو۔ شاید اگر تم مجھے اپنی سچی رفیق بناتے تو یہ دن نہ آتا۔ لیکن تم تو اپنے کام یا اپنے خیالات کے متعلق مجھ سے کبھی کچھ کہتے ہی نہیں۔ کبھی سیاسیات کے متعلق گفتگو

توجہاں میں نے تم سے اختلاف رائے کیا، تم بگڑ کر کہنے لگے "عورتوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ"۔

ہمارے پاس ہی مسٹر اور مسز گوپال داس رہتے ہیں۔ میاں بیوی ہر کام مل کر کرتے ہیں۔ شام کو اکٹھے ٹینس کھیلتے ہیں رات کو مل کر باہر جاتے ہیں۔ آخر میں بھی تو تعلیم یافتہ تھی۔ اگر تمہیں بیوی کو قفس ہی میں ڈالنا تھا تو کسی اَن پڑھ سے شادی کر لی ہوتی اور اگر مجھ سے کی تھی تو یہ پردہ یہ بندشیں ہی دور کر دی ہوتی۔ لیکن اب میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے تھوڑی سی آزادی دے کر بہلانہ لیا اب میں تمہارے احسانات سے آزاد ہوں اور پوری آزادی حاصل کر سکتی ہوں۔

لوگ مجھے ہی بُرا بھلا کہیں گے۔ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ تعلیم کو بھی بُرا کہیں گے۔ ہاں میں بھی کہتی ہوں کہ اگر لڑکیوں کو قید ہی رکھنا ہے تو بہتر ہے کہ ان کو تعلیم نہ دی جائے۔ تاکہ وہ اپنی زنجیروں کو محسوس نہ کر سکیں۔ میرے والدین کو بھی رنج ہوگا تمہاری اماں کی دلی مراد پوری ہوگی۔ نئی بہو آئیگی۔ اور خدا انہیں بچے دیگا۔ مجھے دنیا کی باتوں کی پرواہ نہیں۔ تمام عمر ان باتوں کی پرواہ کرتے کرتے دکھ سہنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ ماں باپ کے رنج کا خیال ہے لیکن اب تمہارے ساتھ رہنے میں میرے لئے سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں۔ تو کیا انہیں مجھے یوں غمگین دیکھ کر رنج نہ ہوگا؟ اور پھر کبھی وہ دن بھی آئیگا جب وہ یہ بات سمجھنے لگیں گے کہ میں نے جو کیا درست کیا۔ ہاں کبھی تو دنیا میں عورتوں کے ساتھ انصاف ہوگا۔

تم مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا جب دو روز کے بعد تم شملہ سے واپس آؤ گے۔ تو میں یہاں سے دور ہونگی میرے ساتھ وہی ٹائپسٹ ہوگی۔ ہاں تم نے یہی بڑی غلطی کی کہ اپنی قیدی چڑیا کو آزاد چڑیا سے ملنے دیا۔ آج صبح وہ میرے پاس آئی اور آج شام ہم دونوں یہاں سے دور کسی اور شہر کو، ایک نئی دنیا کو چل دیں گے۔ میں وہ زیور لے چلی ہوں جو میرے والدین نے شادی پر مجھے دیا تھا۔ جو چیزیں تم نے دیں وہ سب یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔

کل تک مجھے اس کا وہم و گمان نہ تھا کہ آج رات میں تم کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ لیکن چاندنی رات اور بانسری کی ایک لَے نے مجھ پر جادو کر دیا۔ اور ان خیالات کو جو مدتوں میرے دماغ کے کسی ایسے کونے میں بند تھے جو مجھ سے بھی چھپا ہوا تھا آزاد کر دیا۔ میں زندگی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ میں ایک عورت بننا چاہتی ہوں۔ نہ کہ تمہارا کھلونا۔ بہتر یہ ہے کہ تم مجھے طلاق دے دو۔ خدا حافظ۔ اگر تم پھر شادی کرو تو احتیاط رکھنا کہ تمہاری بند چڑیا کہیں آزاد چڑیوں سے ملنے نہ پائے۔ اور چاندنی رات اور موسیقی سے بھی اسے ذرا دُور دُور رکھنا!

"زاہدہ"

غزل

بہت دل تھام کر بیٹھا پر آخر کار اُٹھ بیٹھا
تری محفل میں دیکھی عزتِ اغیار اُٹھ بیٹھا

بہت بیزار کر رکھا تھا ناصح کی نصیحت نے
خدا کا شکر ہے یہ بیہدہ گفتار اُٹھ بیٹھا

یہ حالت تھی مری شب بھر وفورِ بے قراری سے
ترا سو بار دھیان آیا تو میں سو بار اُٹھ بیٹھا

مجھے مطلب؟ میں کیوں؟ کس کیلئے؟ کس واسطے ٹھہروں؟
کیا تم نے جو لطف و مہر سے انکار اُٹھ بیٹھا

یہ اب ترکِ تعلق کے ہیں مجھ پر کس لئے طعنے
تمہیں دیکھا وفا و مہر سے بیزار اُٹھ بیٹھا

دلِ بیتاب تھا ناکامیٔ دیدار کا باعث
یونہی اُن سے ہوئیں میری نگاہیں چار اُٹھ بیٹھا

یہ کیا حالت ہے میری آہ یہ کیا ہونے والا ہے
مرے بالیں سے کیوں روتا ہوا غمخوار اُٹھ بیٹھا

یہ کس ظالم کے آنے کا ہوا احباب میں چرچا
یہ کس کا نام لے کر یک بیک بیمار اُٹھ بیٹھا

گیا تھا دل میں کیا کیا حسرتیں لے کر وہاں اکبر
کسی نے جب نظر تک بھی نہ کی ناچار اُٹھ بیٹھا

جلال الدین اکبر

بہار و خزاں

آئی خزاں چل دی بہار!

وہ باغ وہ صحنِ چمن — وہ گل وہ نرگس وہ سمن
رگ رگ میں اپنی خوں کا جوش — دل میں تپش سر میں خروش
جب زندگانی تھی عمل — اس نخل میں لگتا تھا پھل
وہ زور و قوت اب کہاں؟ — وہ لطف و راحت اب کہاں؟
خاموش ہے بانگِ ہزار — ہے کچھ تو ہے بس یہ پکار

آئی خزاں چل دی بہار!

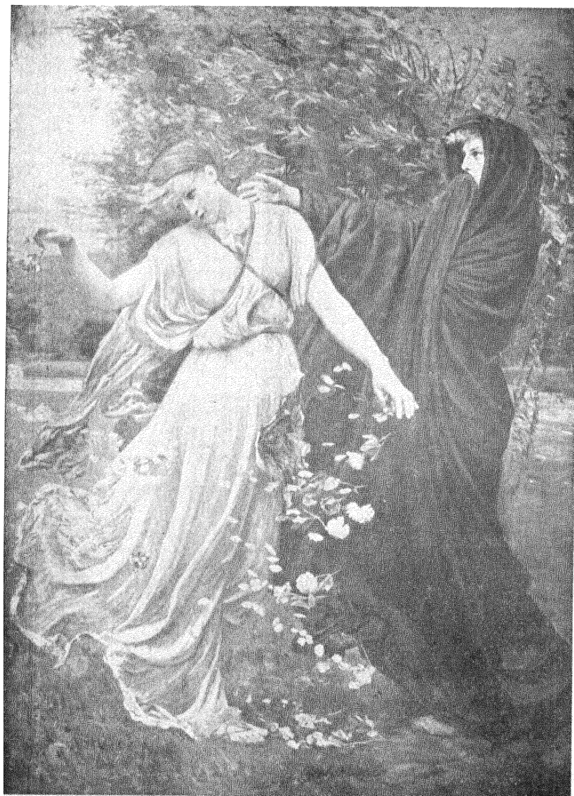
جو ہو حقیقت سے دو چار — دیکھے خزاں کی وہ بہار
کیا ہے خزاں کی بھی فضا! — بہتر بہار اس سے ہے کیا؟
حسنِ ازل کا ہے نشاں — اس میں عیاں اُس میں نہاں
یہ ہے ہنسی رونا ہے وہ — چاندی ہے یہ سونا ہے وہ
اک وہم ہے سُود و زیاں — پُر لطف ہے ہر شے یہاں
جو کچھ بھی آئے اُس کو دیکھ — جو حق دکھائے اُس کو دیکھ
غم میں خوشی کو ہے قرار — خوش ہو کے لے دل پھر پکار

آئی خزاں چل دی بہار!

مت اے دلِ ناداں ترس — آئے گی پھر اگلے برس
آئے گی آئے گی بہار — پھر منہ دکھائے گی بہار
کھوئے ہوئے کو مت ترس — اللہ بس باقی ہوس
حق کو ہے گر منظور کچھ — وہ دن نہیں ہے دُور کچھ
ہوگا چمن جب لالہ زار — اور چار سُو ہوگی پکار

چل دی خزاں آئی بہار!

بشیر احمد



آئی خزاں ——— چل دی بہار

CALCUTTA ART PG WORKS, LAHORE.



نپولین کا خواب

نپولین اور اُس کا خواب

متمدن دُنیا سے ہزاروں کوس دُور بحرِ اوقیانوس کے ایک پتھریلے جزیرے میں قید کی تنہائی و خاموشی کے اندر اپنی خلوت میں بیٹھا کوئی آنکھیں بند کئے اپنے خیالوں میں غرق ہے، میں کیا تھا، اپنی ہمت سے میں کیا سے کیا بنا، پھر قسمت نے مجھے کیسے اوندھے منہ گرا دیا شاید خواب دیکھ رہا ہے کہ بغض و حسد کیونکر اپنی زہریلی سنگینوں سے اُس کی عظمت کے "عقاب" کا پیچھا کر رہے ہیں!

دنیا کا یہ سب سے بڑا سپہ سالار، یہ عدل پرور مقنن، یہ دوراندیش مُدبّر، یہ شہرت و عظمت و قوت کا انسانی مجسمہ آخر کار اپنی ہوس کے ہاتھوں آپ تباہ ہوا۔ یہ غیر معمولی انسان کارسیکا کے ایک معمولی وکیل کا بیٹا ہے!

جب یہ پیدا ہوا (۱۵ اگست ۱۷۶۹ء) فرانسیسی اِس کے عزیز وطن پر قابض تھے۔ ہرچند اسے اُن سے نفرت تھی مگر حالات کچھ ایسے درپیش ہوئے کہ یہ اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی ظالموں کے ملک میں پہلے ایک جنگی مدرسے میں داخل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی فوج میں ایک ادنیٰ افسر بن گیا۔ اس وقت فرانس میں انقلابی آشوب کا دور دورہ تھا۔ فرانسیسیوں نے اپنے بادشاہ کو تخت سے اتار کر اس کا سر قلم کر دیا تھا اور یورپ کی تمام قوموں کو بغاوت و انقلاب کی عام دعوت دی تھی۔ (۱۷۹۳ء) مطلق العنان بادشاہ مل کر فرانس پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ فرانس سخت خطرے میں تھا۔ انقلابی اندرونی بیرونی سب دشمنوں کے قلع و قمع کی زبردست تیاریوں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ہر سُو جانبازوں اور سورماؤں کی طلب تھی۔ ایسے نازک وقت میں کارسیکا کا یہ محکوم جلا وطن حاکم قوم کے کام آیا۔ اِدھر یہ اُس کے کام آیا اُدھر اِس نے اپنا نام چمکایا۔ نپولین فرانس کا رہائی دہندہ بنا، فرانس نپولین کا حلقہ بگوش ہو گیا+

ذکاوت و فطنت اور عزم و شجاعت کے کیسے کیسے کارنامے اُس کے ہاتھوں سرانجام ہوئے! جب موقع اس کے لئے بڑھے تو وہ ان سے فیضیاب ہونے کو سب میں پیش پیش نظر آیا، جب مشکلوں نے اُسے گھیر لیا تو اس کی تمام قوتیں بروئے کار آ گئیں، جب قسمت نے للکارا کہ کوئی ہے تو نپولین کی لبیک نے زمین و آسمان میں ایک گونج پیدا کر دی!

اُس نے بتدریج لیکن بسرعت ترقی پائی۔ طولون میں توپ خانے کا افسر ہو کر اس نے انگریزی بیڑے کی شکست میں نمایاں حصہ لیا (۱۷۹۳ء)، یہ اس کی پہلی فتح تھی۔ دو سال بعد جب مرکزی حکومت خطرے میں پڑی تو وہی اس کا نجات دہندہ بنا! اطالیہ کی یلغار (۹۷-۱۷۹۶ء) اور مصر کی یلغار (۹۹-۱۷۹۸ء) میں پہلی بار اس کی عظمت کا راز دنیا پر کھلا۔ مصر سے آ کر اس نے "تطامت" کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی "قنصلیت" کی بنا ڈالی اور سپرس میں اپنے پاؤں جمائے۔ پانچ سال بعد وہ فرانس کا بادشاہ بن گیا (۱۸۰۴ء) وہی کارسیکا کے ایک معمولی وکیل کا لڑکا، اجنبی فرانسیسیوں کی فوج کا ایک ادنیٰ افسر بجز چند وقفوں کے اُنیس سال تک وہ یورپ کی ساری طاقتوں سے مصروفِ پیکار رہا اور فرانسیسی محض اس کے حکم بردار بندے ہی نہ تھے بلکہ دل و جان سے اُس کے فدائی بھی تھے۔ یکے بعد دیگرے اُس نے ایک ایک قدیم سلطنت کو نیچا دکھایا اور اس کے ساتھ پہلے فرانس اور پھر یورپ کے اکثر اور ملکوں میں اس نے اپنا اقتدار قائم

غم انگیزیوں سے روز و شب واسطہ پڑتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے کہا "ہمیں اپنے تخیل پر قابو رکھنا چاہیئے ورنہ ہم دیوانہ ہو جائیں گے"۔ "جب تک ہم یہاں مقیم ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست خوش رہ کر مجھے بھی خوش رکھیں۔ نہ کہ اداس بن کر مجھے بھی اداس کر دیں"۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا کوئی وقت بھی تلخی میں نہیں گذرتا؟ راتوں کو میں جاگ اٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا"!

شاہنشاہ صبح کو دیر میں بستر سے اٹھتا تھا تاکہ دن زیادہ لمبا معلوم نہ ہو۔ کبھی وہ کھانے پر گورگو سے باتیں کرتا ہے۔ توپخانے اور آتش باری کی گفتگو چھڑ جاتی ہے کہ اس سے بچاؤ کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ سہ پہر کے وقت وہ اپنی خواب گاہ میں صوفے پر لیٹا ہوا پڑھتا ہے؛ کبھی پڑھتے پڑھتے تھک جاتا ہے تو کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے گھٹنوں پر گر پڑتی ہے اور سامنے آزآبے کی ماں اور بچے کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ پاس ہی ایک سفید رنگ والی الماری پر دو عقابوں کے مجسمے اور موم بتیاں ہیں (عقاب نپولین کا شاہنشاہی نشان تھا) ان کے درمیان اس کے بیٹے کا چھوٹا سا مرمریں بت ہے۔ جوزے فین اس کی پہلی چہیتی بیوی کی تصویر بھی آویزاں ہے اور قریب ہی فریڈرک اعظم کا سیمیں کلاک لٹک رہا ہے۔ کبھی جہاز کے پہنچنے والے دن نئی کتابیں آتی ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی۔ کتابوں کو اس قدر جلد جلد پڑھتا ہے کہ ایک کتاب سے بمشکل ایک گھنٹہ کٹتا ہے۔ کتاب کو دیکھتا ہے ناپسند ہو تو فوراً الگ، پسند آئے تو گھنٹے بھر میں پڑھ کر اسے وہیں فرش پر پھینک دیتا ہے۔ پھر نوکر اور کتاب لے آتا ہے اور یوں یہ دن گذرے جاتے ہیں۔ عموماً وہ اپنے کسی دوست کو اپنی انوکھی زندگی کے واقعات لکھاتا ہے۔ واٹرلو کا حال بار بار لکھاتا ہے اور کہتا ہے یہ واقعہ مجھے مغموم بنا دیتا ہے۔ نپولین کے خود نوشتہ حالات بے انتہا دلچسپ ہیں۔ بالآخر وہ خود ہی اپنی زندگی کا سب سے سخت گیر نکتہ چین بنا گویا ساتھ ہی اس نے "آنے والے مورخ" سے اپنا پورا حصہ بھی طلب کیا اور موجودہ و آیندہ اعتراضات کا بزعم خود خوب جواب لکھ دیا۔ "مجھے ہوس تھی؛ ہاں بلا ریب تھی لیکن میری ہوس بہترین قسم کی تھی اور وہ یہ تھی کہ میں عقل کی مملکت کی بنیاد قائم کروں جس کے اندر تمام انسانی قواء کی مکمل نشو و نما اور انتہائی لطف اندوزی ہو"۔ ایک انگریزی اخبار اس کے ہاتھ آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ نپولین نے بے شمار خزانے کہیں چھپا رکھے ہیں۔ اس پر وہ فوراً اچھل پڑتا ہے۔ غصے سے لال ہو جاتا ہے اور ایک دندان شکن جواب لکھواتا ہے کہ اس کے خزانے چھپے ہوئے نہیں بلکہ وہ نئے بندرگاہوں نئے پلوں نئی سڑکوں نئی تعمیروں نئے گرجوں نئی عجائب گاہوں نئے قانونوں اور سینکڑوں نئی چیزوں میں اظہر من الشمس ہیں۔

وہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھتا بوجھتا ہے وہ کس طرح بڑھا کس طرح گرا کیا تھا کیا ہوا! "میرے زوال کا باعث سوائے میرے کوئی اور نہیں۔ میں ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہوں اپنی بری قسمت کا سبب میں خود ہی ہوں"۔ گویا قسمت کی قوت نے بھی اسے تباہ نہیں کیا بلکہ خود نپولین ہی نپولین کو زک دے سکا! بورو ڈینو؟ ڈرسڈن؟ "اسے کہاں مرنا چاہیئے تھا"۔ "نہیں نہیں واٹرلو پر موت سب سے اچھی ہوتی! لوگوں کی محبت، ان کا سوگ!" "سب کچھ دیکھو تو میری زندگی بھی ایک عجیب راگ تھی"!

آخر کار زندگی کا آخری سال آن پہنچا! اور یہی شخص جو ایک زمانے میں بلا توقف پانچ سو میل تک گاڑی میں سفر کر سکتا تھا۔ دن بھر میں سو میل تک گھوڑے کی سواری کر سکتا تھا، پانچ گھنٹوں میں اسی میل سرپٹ گھوڑا دوڑا سکتا تھا، مسلسل اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام

کیے جاتا، چھوٹی سے چھوٹی جزئیات میں دلچسپی لیتا اور ذرا ذراسی ہدایات میں اپنی خود بینی کے جوہر دکھاتا جو اس جزیرے میں قید ہوکر اپنی قید سے گھبرا کر کبھی پڑھنے اور لکھنے لکھانے میں مصروف ہوجاتا کبھی اپنے دشمنوں کو بُرا بھلا کہتا اپنی عمر کے آخری سال میں صبر و سکون کا دلدادہ ہوگیا۔ اس نے خود پھاوڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھ مل کر سات ماہ میں ایک باغ تیار کردیا ایسا کہ "ظالم" انگریزی حاکم کی بیٹی بھی چھپ کر ایک روز اس چمن کی سیر کو آئی ۔ یہ آخری معجزہ تھا جو نپولین کی ذکاوت نے دنیا کو دکھایا +

تبدیج اُس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ جگر و معدہ خراب ہوگیا "میں کس قدر قابلِ رحم وجود بن گیا ہوں ۔ میں جسے کبھی نیند کی بھی کم حاجت ہوتی تھی اب اپنے دن سستی اور زیاں کاری میں گذارتا ہوں ۔ آنکھیں کھولنا بھی تو اب میرے لئے دشوار ہوگیا ہے ۔ گذرے دنوں میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں نے چار چار منشیوں کو بیک وقت چار مختلف مضمونوں پر اپنے خیالات لکھوائے ہیں ۔ ان دنوں میں نپولین تھا!"

وہ اپنی لمبی چوڑی وصیت لکھواتا ہے ۔ اس سے یہ ملے اُسے وہ ملے میرے بیٹے کو میرا کارسیکا کا مکان دیا جائے وغیرہ وغیرہ اور "یہ میری خواہش ہے کہ میری راکھ دریائے سین کے کنارے پر دفن کی جائے فرانسیسی لوگوں کے درمیان جن سے میں نے ہمیشہ محبت کی ہے"۔

پھر دوستوں اور عزیزوں سے اُس کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل اور باتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اپنی بیہوشی میں وہ چیختا ہے "دیزے! ماسینا! فتح ہمارے ہاتھ ہے! جلدی کرو! بڑھے چلو! بس ہم نے مار لیا اُنہیں . . . . "

آخری رات! درد و کرب کی ایک سنگین رات!

نور کے تڑکے مونتولوں اُسے کچھ بڑبڑاتے سن پاتا ہے:

"فرانس! . . . . فوج! . . . . سپہ سالار! . . . . جوزے فین!" یہ نپولین کے آخری لفظ ہیں! اس کے جلد بعد وہ یک لخت جوش میں آکر اُٹھتا ہے اور مونتولوں کے گلے کو پکڑ کر اس زور سے بھینچتا ہے کہ غریب سے چیخنے بھی بن نہیں پڑتی ۔ ایک اور مصاحب پاس کے کمرے سے آکر اُسے چھڑاتا ہے ۔ خدا معلوم شاہنشاہ اپنی آخری جنگ میں کس دشمن کا گلا گھونٹ رہا تھا؟ یہ کیسا خواب تھا؟

باقی دن وہ آرام میں آہستہ آہستہ سانس لے کر گذارتا ہے ۔ پانچ بجے ہوائیں زور میں آتی ہیں اور دو تازہ بوئے ہوئے درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کے رکھ دیتی ہیں ۔ اُدھر یہ طوفان بپا ہے اِدھر یہ شخص اپنے بستر مرگ پر ایک لمبی جانکنی کی تکلیفیں جھیل رہا ہے ۔ اب درد کا کوئی نشان نہیں رہا ۔ اب اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں گویا خلا کو تک رہی ہیں ۔ اب اس کے گلے میں موت کا پھندا ہے!

اُدھر سورج سمندر کے سینے میں ڈوبتا ہے اِدھر شاہنشاہ کے دل کی دھڑکن ختم ہوجاتی ہے! نپولین کی قبر ایک الگ تھلگ سی تنہا وادی میں بنائی گئی ایک چشمے کے کنارے دو بید مجنوں کے درختوں کے سایہ تلے ۔ والیٔ جزیرہ نے اجازت نہ دی کہ اس پر کوئی کتبہ نصب کیا جائے ۔ سو فقط نپولین بوناپارٹ لکھا گیا ۔ نہ انگلستان نے اجازت دی کہ اس کی نعش فرانس لے جائی جائے ۔ صرف ایک انگریز سنتری اس کی قبر پر تعینات کر دیا گیا! انیس سال بعد ۱۸۴۰ء میں جب آخر نپولین کی ہڈیاں پیرس پہنچیں تو دارالسلطنت میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا جو کچھ مدت کے بعد ایک قومی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا ۔

نپولین مر کر بھی زندہ رہا!

بشیر احمد

غزل

چمن کا شوق ہے لیکن چمن کہاں دیکھا — قفس میں ہم نے بہت خوابِ آشیاں دیکھا

بس ایک شغل کی حاجت ہے بے قراروں کو — کسی نے کب اثرِ نالہ و فغاں دیکھا

حریفِ ہمتِ دل کیا ہو دوریٔ منزل — نگاہِ شوق نے وہ تیرا آستاں دیکھا

نظر کی نذر چڑھی تیری رونمائی میں — دکھائی پھر نہ دیا کچھ تجھے جہاں دیکھا

کبھی ہے حسن تمہارا کبھی ہمارا شوق — وہی ہے ذکر جسے زیبِ داستاں دیکھا

سب اپنے اپنے خیالات میں ہیں سرگرداں — نہ ہم سخن کوئی پایا نہ ہمزباں دیکھا

رہا نہ پھر مرے دل میں خیالِ آزادی — قفس کو میں نے جو ہم رنگِ آشیاں دیکھا

نہ اپنے درد کا دکھ ہے نہ غم کا غم مجھ کو — دل اپنا شاد ہوا تم کو شادماں دیکھا

کسے نصیب ہے راحت، کسے ملا آرام — جدھر کو دیکھا ہجوم بلاکشاں دیکھا

ق

کسی کو خستۂ ہنگامۂ زمیں پایا — کسی کو کشتۂ بیدادِ آسماں دیکھا

سرور دل میں ہے وحشتؔ تو نور آنکھوں میں
نہ دیکھ کر اُسے کہتا ہوں میں کہ ہاں دیکھا

رضا علی وحشت

یہ کبھی نہ کہو کہ اس بات کا علم کہ زندگی بغیر خوشی کے کیونکر بسر ہو سکتی ہے ایک نوع کی خوشی ہے۔ اس طرح تو ایک شراب نہ پینے والا بھی کہہ سکتا ہے کہ شراب سے کُلّی پرہیز کرنے کا علم اصلی بدمستی ہے + خوشی زندگی کا مقصد نہیں، زندگی کا کوئی بھی مقصد نہیں، زندگی تو خود ایک مقصد ہے اور دلیری اِس میں ہے کہ ہم اپنی خوشی کو ایک زیادہ پُرکیف زندگی کے لئے قربان کردیں۔

اُردو شاعری اور ملکی سرمایہ

تعصب و تنگ نظری نے اردو شاعری پر جتنے بیجا الزامات عائد کئے ہیں اُن میں سے ایک نام نہاد الزام یہ بھی ہے کہ اس کا دامن ملکی و مقامی سرمایہ سے یکسر خالی ہے۔ بڑی بلند آہنگی کے ساتھ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگرچہ اردو زبان نے ہندوستان ہی میں جنم لیا یہیں اس نے پرورش پائی۔ ہندی فضا میں اس کی نشو نما ہوئی۔ اسی سرزمین میں وہ پھولی پھلی اور پروان چڑھی لیکن حیرت ہے کہ اس کی شاعری پر مرز بوم کا کوئی اثر نہ پڑا۔ اول سے آخیر تک یہ شاعری مقامی رنگ و بو سے بالکل بیگانہ ملکی خصوصیات سے یکسر ناآشنا اور ہندی طرز و اسلوب سے کوسوں دور رہی۔ اس کی ہر ادا سے ایرانیت ٹپکتی ہے۔ وہ فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ ہر بات میں اس کی تقلید کرتی ہے۔ اس کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی ساری ٹھاٹ باٹ بدیسی ہے۔ اس لئے موجودہ دور کے نام نہاد وطن پرستوں کا ایک طبقہ مصر ہے کہ اردو شاعری سے تمام غیر ملکی عناصر کو یک لخت خارج کر دیا جائے اور خالص ہندی ساز و سامان سے اس کی محفل سجائی جائے۔ اگر ان سے اس کایا پلٹ کی تجویز کے فوائد دریافت کئے جائیں تو وہ یہی کہیں گے کہ انسان کو بدیسی چیزوں کے مقابلہ میں دیسی چیزیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں ہر شخص کو ملکی پیداوار کے تذکرہ سے فطرتاً بہت زیادہ حظ و انبساط اور لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا تک نہ ہو ان کا صحیح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان ان سے کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہوتا۔

لیکن غور کرو تو معلوم ہو گا کہ یہ اعتراض حق و صداقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ اردو کی کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں پائی جاتی جو ملکی خصوصیات۔ ملکی سرمایہ۔ ہندی شعائر اور مرز بومی اثرات سے بالکل بیگانہ و بے تعلق ہو۔ نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا بڑا حصہ مقامی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو وصف نگاری کے اکثر و بیشتر مضامین ہندوستان کی قدیم روایات۔ نیم مذہبی فسانہ و حکایات۔ دیسی مذاق و تہذیب اور یہیں کی موسمی کیفیتوں اور مقامی دلفریبیوں سے ماخوذ ہیں۔ حالی کی "برکھا رت" نند کی "برسات" اسمٰعیل کی "گائے" شوکت کے "نیم" عظمت اللہ کے "پیپل" ڈاکٹر اقبال کے "نئے شوالے" کو کون شخص بدیسی یا اجنبی قرار دے سکتا ہے۔ چکبست نے ہندی دیو مالا اور رامائن کے واقعات کو جس حسن و خوبی کیساتھ میر انیس کے رنگ میں بیان کیا ہے اس سے ہزاروں برس پیشتر کی ہندی معاشرت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے خود میر انیس کو دیکھئے۔ واقعات بیان کرتے ہیں کربلائے معلّیٰ کے۔ کردار سارے عرب ہیں۔ لیکن اہلِ بیت و اہلِ حرم کے آداب و مراسم۔ عادات و خصائل اور خیالات و جذبات سب لکھنؤ کی شریف زادیوں کے مطابق فرض کر لئے ہیں مثلاً

فتح ہو گئی [illegible] کے فرزند کا تقدیر
بانو نے کہا ہائے میری بچی کی تقدیر

خاموش تھی گھونگھٹ میں دلہن صورتِ تصویر   دولہا کا سخن سن کے کلیجے پہ لگا تیر
چاہا کہ کہے کاشش ہماری اجل آئے
کچھ منہ سے نہ نکلا مگر آنسو نکل آئے

(۲) غم تھا کہ کوئی دم میں یہ مسند ہوئی خالی   اب سر پہ رنڈاپے کی بلا چرخ نے ڈالی
کچھ منہ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ ناز کی پالی   یہ ہونٹ چباتے کہ اڑی پان کی لالی
آپڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخسار پہ ڈھل کر
رہ جاتی تھی وہ مہندی لگے ہاتھوں کو مل کر

بھلا عرب میں گھونگھٹ۔ پان کی لالی اور مہندی کا کب دستور تھا؟ یہ خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔
برسات۔ بسنت۔ ہولی اور دیوالی وغیرہ پر مسلسل غزلیں قصیدے اور مثنویاں سب کچھ پائی جاتی ہیں۔ یوں تو بعض قصائد میں خالص ہندوستانی چیزوں کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کی متعدد مثالیں ملتی ہیں لیکن محسن کاکوری نے ایک زبردست نعتیہ قصیدہ بالکل ہندوانی رنگ کا لکھا ہے جو اپنی ندرتِ بیان اور جدتِ ادا کی وجہ سے اردو ادبیات میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ابتدائی چند بیتیں ملاحظہ ہوں۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل   برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل   جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی   کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن   سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل

پوری تشبیب اسی رنگ کی ہے اس کے بعد گیارہ اشعار کی ایک غزل بھی اس میں اسی انداز کی شامل کر دی گئی ہے۔
قصیدہ سے قطع نظر مثنویوں میں ہندی خصوصیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اردو زبان کی سب سے مشہور و مقبول مثنویاں میر حسن کی "سحر البیان"۔ اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" ہیں۔ ثانی الذکر میں "گل بکاؤلی" کا مشہور و معروف قصہ نظم کیا گیا ہے جو مضمون و مواد کے لحاظ سے خالص ہندی چیز ہے۔ اول الذکر مثنوی میں بھی دربار۔ جلوس۔ شادی برات۔ دلہن کی آرائش۔ اور باغ و بہار کے منظر کی تصویریں کھینچنے میں شاعر نے خاص ہندوستانی رنگ و روغن سے کام لیا ہے۔
لیکن اردو شاعری کا اصل سرمایہ غزل ہے چند مرثیہ نگاروں اور نظیر اکبرآبادی کے سوا تمام قدیم سرآمد شعراء کے دواوین کا اکثر و بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ دوسرے اصنافِ سخن کی مقدار کھانے میں نمک کی سی ہے۔ اس لئے یہاں اُن کا بیان بھی ان کی مقدار کے لحاظ سے نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ تفصیلی معلومات کے لئے "شعر الہند" کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا جس کا ایک پورا باب ملکی سرمایہ کی بحث کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ غزل اپنی کثرت و اہمیت کے لحاظ سے زیادہ تفصیل

والیضاح کی مستحق ہے۔

واضح رہے غزل کا تعلق داخلی شاعری سے ہے لہٰذا خارجی واقعات سے اس کو بہت کم لگاؤ ہے۔ اس کے اہم عنصر جذبہ و تخیل ہیں جو نفس بشری کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے مکان و زمان یا وقت و مقام کی قید سے آزاد ہیں۔ مکان و زمان میں ہزاروں تبدیلیاں کیوں نہ ہوں لیکن نفس انسانی کی کارفرمائیاں ایک ہی قانونِ قدرت کی پابند ہوتی ہیں۔ جذبہ و تخیل کا طریقۂ عمل شاذ و نادر بدلتا ہے۔ اس لئے غزل میں بہ لحاظ مواد و مضمون دیسی اور بدیسی کا سوال بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ البتہ لائقِ حفظ طلب امر یہ ہے کہ شاہد سخن کی آرائش و زیبائش کے لئے کس قسم کے ساز و سامان کام میں لائے گئے ہیں۔ معترضین کا بیان ہے کہ غزل کی کل تشبیہیں استعارے اور تلمیحیں غیر ملکی اشخاص۔ بیرونی پیداوار۔ اور بدیسی اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے وسیع و زرخیز ملک میں ہر قسم کے درخت پھول پھل پیدا ہوتے ہیں ہزاروں دریا پہاڑ۔ وادی اور صحرا موجود ہیں۔ یہاں لاکھوں ہیرو رما اور بہادر گذرے ہیں۔ یہاں کی قدیم روایات۔ اساطیر اور تہذیب و معاشرت نہایت شاندار ہے لیکن اردو کا غزل گو شاعر ان سے کام لینا جانتا ہی۔ وہ ایرانی شعرا کی تقلید میں گل و بلبل۔ سرو و قمری۔ سوسن و نرگس۔ سنبل و ریحان جیحوں و جیحوں۔ دجلہ و فرات۔ کوہ قاف و کوہ الوند۔ کوہ طور و کوہ بیستوں۔ رستم و سہراب۔ جم و فریدوں۔ سکندر و دارا۔ نوشیرواں و سلیماں۔ ارسطو و افلاطوں ۔ مانی و بہزاد۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ وامق و عذرا وغیرہ کے ذکر سے بزم ادب کی رونق بڑھانا چاہتا ہے۔

غیر ملکی رجال و ابطال کے حوالہ و تلمیح اور بدیسی چیزوں کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کی خوبی یا برائی پر بحث کرنے سے قبل ہم عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ معترضوں کا یہ بیان بھی راستی و صداقت سے دست بغل نہیں ہے کیونکہ دوسرے اصناف سخن کی طرح غزل بھی بڑی حد تک ہندی خصوصیات و ملکی سرمایہ کی حامل ہے۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کا انداز بیان بالکل ہندی طرز کا ہے اور جن میں تشبیہ و استعارہ کی بنیاد خالص ہندوستانی چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر صاحب "شعر الہند" نے کثیر التعداد اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے یہاں چند شعر بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ولی:۔	زلف ہے تیری موج جمنا کی	تل نزدیک اس کے جوں سناسی ہے
حاتم:۔	ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے	نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے
سودا:۔	ترکش الیندڑ سینہ عالم کا چھان مارا	مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا
میر:۔	کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کا سا پھروں	بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا
مصحفی:۔	شمس و قمر نے دیکھ لیا کیا اس کے گورے مکھڑے کو	کوٹھے پر دن رات پڑے جو چیل ایسی منڈلاتے ہیں
انشا:۔	دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے	جس طرح کوئی بھونرا ہو تے کنول میں بیٹھا
جرأت:۔	درد دل اس بت بیدرد سے کہئے تو کہے	جا کے یہ رام کہانی تو سنا او رکہیں
ناسخ:۔	ہجوم رکھتے ہیں جانبازیوں تیرے آگے	جو اڑیوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو

آتش:- خاک شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلئے ‏ رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی
بحر:- ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار ‏ کنھیا بنا جو سنولا گیا
ظفر:- پھرتا ہے جوگی بنا تیرے لئے آفتاب ‏ خط شعاعی نہیں سر پہ کھلی ہے جٹا
امیر:- نہ سمجھا تھا کہ ان طوقوں میں پھر مجھ کو پھنساؤ گے ‏ کروگے چوڑیاں ٹھنڈی تم آکر میرے مدفن پہ

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر دور کے شاعروں نے اپنے کلام کی آرائش اور شاہد سخن کی شائستگی کے لئے ہندی مال مسالے بھی استعمال کئے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں سے بندش میں جو چستی و صفائی۔ طرزادا میں جو دلکشی و سہولت کلام میں جو شوکت و جزالت اور اظہار بیان میں جو اعجاز نما اختصار اور اثر پیدا ہوتا ہے وہ ہندی تشبیہوں اور استعاروں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ وصف نگاری کے لئے ہندوستان کی قدرتی یا مصنوعی پیداوار موضوع شاعری بن سکتی ہے چنانچہ بہت سے شاعروں نے یہاں کے قدرتی مناظر و مرایا۔ رسم ورواج۔ تہوار و تقریب۔ تہذیب و معاشرت نیم مذہبی حکایات و افسانہ پر دل کھول کر طبع آزمائی کی ہے بمضمونِ شاعری کی حد تک ہندی خصوصیات کی کمی نہیں۔ لیکن محفل غزل کی آرائش اور شاہد سخن کی شائستگی کے لئے ہندوستانی ساز و سامان کی کثرت فروغ حسن کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہندی الفاظ و تشبیہات کی زیادتی کلام کی لطافت و پاکیزگی کو زائل کر کے ثقالت و کرختگی پیدا کر دیتی ہے۔ اوپر جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ شیرینی و پاکیزگی صفائی و روانی برجستگی و تاثیر کے لحاظ سے ان اشعار کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن میں فارسی عنصر غالب ہوتا ہے۔

اردو زبان اب دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اپنی مستقل اور آزادانہ حیثیت رکھتی ہے جس طرح دنیا کی کوئی غیور قوم اپنے شعائر ملی و خصائل قومی سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتی اسی طرح اردو زبان کی خودداری بھی کسی نام نہاد وطن پرست فرقہ کی رضا جوئی و خوشنودی کی خاطر اپنی شاندار روایات اور لسانی خصوصیات سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتی۔ تہذیب و تمدن کا یہ مسئلہ اصول ہے کہ جب دو یا زیادہ قوموں کا اجتماع یا انضمام ہوتا ہے تو ان پر فطرتاً جذب و اتحاد اور اثر و تاثیر کا عمل ہونے لگتا ہے لیکن کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنے ہی شعائر و خصائل اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ اردو شاعری ہندی ماحول و فضا سے خود بخود متاثر ہو کر یہاں کی لطیف و پاکیزہ چیزوں کو اپنے اندر حسب ضرورت جذب کرتی رہی ہے لیکن کسی طبقہ یا جماعت کا یہ مطالبہ درست نہیں کہ وہ اپنی تمام قدیم خصوصیات اور لسانی امتیازات سے دست بردار ہو کر خالص ہندی رنگ قبول کر لے اور ہر محفل میں صرف ہندی زیور اور لباس کے ساتھ جلوہ گر ہوا کرے خواہ یہ جامہ اس کے تن نازک پر پھبتا ہو یا نہ۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری نے تشبیہات و استعارات۔ تلمیحات و کنایات۔ اوزان و بحور۔ طرز ادا و اسلوب بیان اور ردیف و قافیہ سب کچھ فارسی سے لیا ہے جس کو تاریخ ہند کے اسلامی دور میں ادب العالیہ اور حاکم و مقتدر زبان ہونے کا شرف حاصل تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اردو شاعری کوئی اپنا ذاتی سرمایہ یا آزادانہ وجود ہی نہیں

رکھتی ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ موجودہ مغربی ادب وشاعری کے تمام دفتر بے پایاں محض بے معنی وبے سود ہیں کیونکہ سب نے یونانی و رومی ادبیات و صنمیات اور کلیسائی روایات واخلاقیات سے خوشہ چینی کی ہے۔

فارسی کے نمونہ پر اردو شاعری کی نشوونما عین قانونِ قدرت و اصول لسانی کے مطابق ہوئی ہے جس پر کسی طرح نقالی و انجذابِ گدایانہ کا الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ تمثیلاً فارسی اور اردو شاعری کے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے ہر ملک میں عام بول چال کی زبان ادب وشاعری کی شستہ وسنجیدہ زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے ممکن ہے کہ ہندوستانی بولی جو آگے چلکر اردو سے نامزد ہوئی برج بھاشا سے نکلی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ریختہ یا اردو کی شاعری خاص ایرانی شاہد سخن کی دختر نیک اختر ہے۔ اصولِ فطرت و قانون قدرت کا یہی تقاضا ہے کہ بیٹی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلے۔ اسی کا طرزِ گفتگو سیکھے۔ اسی کے خیالات وجذبات سے متاثر ہو۔ اسی کی چال ڈھال اختیار کرے۔ اسی سے تہذیب وشائستگی کا سبق حاصل کرے جب اردو شاعری نے آنکھیں کھولیں اور گوش ہوش وا کئے تو ہر مجلس اور ہر محفل میں اپنی ماں کو زینت بخش پایا۔ اس کے دلکش نغموں سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ اس کے منہ سے فصاحت و بلاغت کے پھول جھڑتے تھے۔ ہر شخص خواہ وہ گوشۂ عزلت کا مسکن گزیں ہو یا دولت و امارت کا مسند نشیں۔ خواہ اس کا قلب صنم آشنا ہو یا حق آگاہ۔ خواہ وہ زاہد خشک ہو یا رند لاابالی۔ خواہ وہ زنار بند ہو یا سبحہ گردان اس کی ایک ایک ادا کا شیدائی تھا ننھی بچی اپنی ماں ہی کے آغوش میں پلتی اور اس کی فصیح زبان سیکھتی گئی۔ خوش قسمتی سے اس کو اتالیق بھی ایسے ملے جو یگانۂ روزگار تھے بعض نا اہل اناؤں مثلاً برج۔ پوربی۔ دکھنی۔ گجراتی وغیرہ کی صحبت سے کچھ سخت وثقیل الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے تھے لیکن قابل اتالیق اس کی اصلاح کرتے گئے۔ سب سے زبردست استاد ناسخ تھے جنہوں نے نہایت سختی کے ساتھ اس کی زبان سے کرخت وثقیل الفاظ اتارے کمسن لڑکی بمرورِ زمانہ بڑھتی اور شائستہ ہوتی گئی یہاں تک کہ ذوق۔ مومن اور غالب جیسے ماہرین فن کی تعلیم وتربیت نے اسی ایرانی شاہد سخن کا ہمدوش بنا دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ظاہری وباطنی محاسن کے لحاظ سے دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری سے آنکھ ملانے کے لائق بن گئی۔ الغرض اردو شاعری نے فارسی شاعری سے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کی گدایانہ خردہ چینی نہیں بلکہ اُس کی جائز میراث ہے۔ اولاد کو والدین سے جو کچھ وراثتاً منتقل ہوتا ہے اُسے کوئی منصفانہ قانون ناحق تصور نہیں کرتا۔

قدیم ہندوستان میں سنسکرت جس کے معنی آراستہ پیراستہ اور منزہ و مصفا کے ہیں اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زبان تھی جو مہذب وشائستہ شمار ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کا دامن علمی وادبی خزانوں سے مالا مال تھا لیکن وہ گوتم بدھ سے کئی صدی پیشتر ہی مردہ ومتروک ہوچکی تھی۔ اس کے بعد گپتا عہد میں سنسکرت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن اس کا دائرہ عمل نہایت تنگ ومحدود تھا صرف بڑے بڑے برہمن پنڈت تمام علمی وفنی خزانہ کے کلید بردار تھے۔ عوام الناس کو استفادہ کا موقع حاصل نہ تھا علاوہ بریں اس سے تمام وہ خوبیاں اور دلکشیاں رخصت ہوچکی تھیں جو ایک زندہ متحرک وترقی پذیر زبان کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اردو کی پیدائش کے وقت سنسکرت کے علمی ذخیرہ پر نہایت تاریک پردہ پڑا ہوا تھا۔ البتہ مٹھی بھر برہمنوں کو مذہبی رسوم کی ادائی کے لئے اس کے چند اشلوک ازبر تھے۔ اس وقت ملک کے متفرق حصوں میں مختلف پراکرتیں رائج تھیں۔ پراکرت

کے معنی ہیں جو طبیعت سے نکلے پس پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جنہیں طبیعتوں نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیا تھا۔ یہ عوام کی زبانیں تھیں جنہیں وہ گھروں اور بازاروں میں بولتے تھے۔ آگے چل کر سنسکرت کی اصطلاحی معنی مہذب و مقدس کے اور پراکرت کے معنی غیر مہذب و ناشائستہ کے ہوگئے۔ یہ پراکرتیں یا دیسی زبانیں محض بول چال میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کا دامن علمی و ادبی خزانوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کی ترقی مسلمان علم دوست فرمانرواؤں کی حمایت و سرپرستی کی شرمندۂ احسان ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی علم پروری و معارف نوازی صرف عربی و فارسی تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی وسیع المشربی و فراخ حوصلگی نے دیسی زبانوں کو بھی اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی۔ ہندی اور بھاشا کے شاعروں پر بھی انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ غیر مسلم مورخین کو بھی اعتراف ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے دیسی زبانوں کو فروغ و ترقی دینا اپنی سیاسی حکمتِ عملی میں شامل کر لیا تھا۔ انہیں کی حمایت و سرپرستی کی بدولت پراکرتوں کو جو مدت سے صرف بول چال کے لئے استعمال ہو رہی تھیں تھوڑے ہی زمانہ میں علمی و ادبی زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ غرض کہ دیسی زبانیں اُس وقت ارتقا کے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔ ان میں اتنی قوت و صلاحیت کہاں تھی کہ وہ کسی نوزائیدہ زبان کے ادب و شاعری کو اپنے اعلیٰ انشا سے متاثر کرتیں۔

جب ہندوستان میں سنسکرت اور پراکرت زبانوں کا یہ حال تھا اُس وقت فارسی شاعری ارتقا و ترقی کے تمام منازل طے کر کے معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے دنیا کی مہذب و شائستہ زبانوں میں نہایت اعلیٰ و ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اگر ہندوستان کی کوئی زبان شستگی و پاکیزگی میں اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی تھی تو وہ صرف سنسکرت تھی لیکن مدت سے وہ مردہ، متروک اور عوام کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی جب اردو شاعری کتمِ عدم سے معرضِ وجود میں آئی تو ایک طرف اس نے اپنی مہذب و شائستہ مادرِ شفقت کا آغوش وا پایا جو اپنے فاتحانہ و حاکمانہ اقتدار کے باعث ہر محفل اور ہر مجلس میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ دوسری طرف اسے غیر مہذب و ناشائستہ اور محکوم و مغلوب پراکرت انائیں اور کھلائیاں نظر آئیں۔ اس نے فطرتاً و طبعاً اول الذکر کی طرز و روش اختیار کی اس کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی۔ بیٹی اپنی ماں سے جو کچھ سیکھے یا حاصل کرے اسے نہ تقلید کہہ سکتے ہیں نہ خوشہ چینی بلکہ وہ اس کا جائز حق ہے جس سے اس کو دنیا کا کوئی قانون محروم نہیں کر سکتا۔ اردو شاعری میں جو تشبیہیں، استعارے اور تلمیحیں رائج ہیں وہ مستعار نہیں بلکہ اس کی خاص ملک ہیں۔ اسلوب بیان کو پوپ نے شاہد سخن کا "لباس" قرار دیا تھا لیکن کارلائل اسے "پوست" کہتا ہے۔ اردو شاعری کا مخصوص طرزِ بیان بھی اس کا کوئی خارجی لباس نہیں بلکہ جزو بدن ہے اگر اسلوب بیان کی حیثیت محض لباس کی ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ ایرانی جامہ اتار کر ہندی پوشاک زیب تن کر لیتی اگرچہ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی آرام دہ، شاندار اور قیمتی لباس کو موٹے جھوٹے گھٹیا ہندی لباس سے کیوں تبدیل کرے لیکن جب اسلوبِ بیان و طرز ادا نے پوست کی حیثیت اختیار کر لی ہے تو اس کا جسمِ شاعری سے جدا ہونا محال ہے۔

ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی۔ دیسی و بدیسی کا سوال نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ دنیائے شاعری کو جغرافیائی حدود بندیوں اور سیاسی تنگ نظریوں سے کوئی سروکار نہیں۔ شاعری کا تعلق جذبہ و تخیل سے ہے جن کی وسعت اور ہمہ گیری کی کوئی حد نہیں تخیل

مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی فضائے پرواز مکان ولامکان تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے میدانِ سخن کو میدانِ سیاست
تصوّر کرلینا فاحش غلطی ہے۔ سیاسی و معاشرتی معاملات میں مادی مفاد اور مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر انسان رواداری سے کام
لیتا ہے۔ اپنے بعض حقوق سے دست بردار ہوتا ہے دوسروں کو راضی رکھنے کے لئے اپنے نفس پر بیجا پابندیاں عائد کرتا ہے لیکن
جذبہ تخیل اور عشق و شاعری کی دنیا میں اس قسم کی مصلحت مبنی بادہ کی نیم رسی اور شوق کی نارسائی میں دلالت کرتی ہے۔ اور بعض
موقعوں پر تو وہ خودکشی کے مترادف ثابت ہوتی ہے۔ غزل میں تو خاص طور پر دیسی اور بدیسی کا امتیاز لایعنی سی بات ہے۔ یہاں
ملکی و غیر ملکی سرمایہ کی بحث کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ اجنبیت و مانوسیت اور یگانگی و بیگانگی کا مسئلہ قابلِ ذکر ہے۔ اگر کوئی
تشبیہ و استعارہ یا تلمیح و کنایہ اجنبی و غیر مانوس ہو تو کلام میں تعقید پیدا ہوتی ہے اور شعر کی ساری خوبی و دلچسپی خاک میں مل جاتی ہے
ہر زبان کی ساخت۔ ترکیب۔ نحوی و عروضی اصول۔ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں چند امتیازی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ زبان بھی ایک
زندہ نامیاتی ہستی (living organic body) کی طرح اپنی مخصوص ہیئت طبیعت اور فطرت رکھتی ہے جو باتیں اس کی ساخت
و ہیئت کے مطابق ہوں وہ مفید اور جو چیزیں اس کی فطرت و طبیعت کے مخالف ہوں وہ مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ اردو
شاعری کی طبیعت نے جن تشبیہوں۔ استعاروں اور تلمیحوں کو ان کی لطافت۔ پاکیزگی۔ شگفتگی اور دلچسپی کی بنا پر قبول کرلیا ہے وہی اب
مانوس ہیں مفید ہیں۔ اس کا ذاتی سرمایہ ہیں بلکہ اس کا جزو بدن بن گئی ہیں۔ خواہ جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے ان کا تعلق ہندوستان سے
ہو یا ایران سے۔ عرب سے ہو یا چین سے۔ یونان سے ہو یا ترکستان سے اور مذہب و ملت کے لحاظ سے خواہ وہ دیر سے وابستہ ہوں یا
حرم سے میخانہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ یا آتشکدہ سے۔ مسیحی روایات سے ان کا لگاؤ ہو یا اسرائیلی اساطیر سے مثلاً۔ پان کا بیڑا۔ مہندی
نذانچہ جوگی۔ دھونی۔ انگیا۔ جھومر۔ گھونگھٹ وغیرہ خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ گل و بلبل۔ سرو و شمشاد۔ راہ ہفتخواں۔ کوہِ الوند
جوئے شیر۔ جام جم۔ فرِّ فریدوں۔ رستم و سہراب ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں۔ وامق و عذرا۔ سلمیٰ و رباب خاص عرب
نژاد ہیں۔ حکمت چین۔ ارژنگِ مانی وغیرہ مشرقِ اقصیٰ کے تحفے ہیں۔ ارسطو و فلاطوں۔ جالینوس و فیثاغورس وغیرہ کی عقل و
تدبیر اور آئینۂ سکندر عظمتِ یونان کی یادگار ہیں۔ کسی کے خالِ ہندو پر سمرقند و بخارا کی بخشش۔ ترکوں کی شہسواری۔ کلاہ تتری
فتورِ ہلاکو وغیرہ ترکستان سے متعلق ہیں۔ بت صنم۔ برہمن۔ زنّار۔ قشقہ کا تماشا دیر میں نظر آتا ہے۔ قربانی اسمعیل تعمیر کعبہ۔ گلزارِ خلیل
بوسۂ حجرِ اسود وغیرہ کا محلِ وقوع حرم ہے۔ رندی و سرمستی۔ مدہوشی و بیخودی۔ خمار و خمیازہ۔ جام و سبو۔ مینا و صراحی کا نظارہ دیکھنا ہو
تو میخانہ کی سیر شرط ہے۔ برسم گذاری۔ زمزم سرائی۔ آتش پرستی۔ پیرِ مغاں کا راگ۔ رموزِ مجوس آتشکدہ سے وابستہ ہیں۔ مہرِ کلیسا۔ خرِ عیسیٰ
لبِ مسیحا۔ اعجازِ مسیحائی نصرانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیدۂ یعقوب۔ چاہِ کنعان۔ طوفانِ نوح۔ صبرِ ایوب۔ تختِ سلیمان۔ شمعِ طور
عصائے موسیٰ۔ ید بیضا وغیرہ کے واقعات یہودیوں کی تاریخ و روایات سے ماخوذ ہیں۔ جب سروشِ سخن کو دنیائے
آب و گل کی چیزوں سے سیری نہیں ہوتی تو وہ عالمِ خیال میں پرواز کرکے عنقا۔ ہما۔ سیمرغ۔ روضۂ جنان۔ شاخِ طوبیٰ۔ حور و غلمان
کوثر و تسنیم وغیرہ کے نظارے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری جغرافیائی حدود بندیوں اور فرقہ داری تنگ نظریوں سے بالاتر ہے۔ وہ ان تمام باتوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے جو اس کی ہیئت۔ ساخت۔ فطرت اور طبیعت سے مناسبت رکھتی ہیں جن اشیا کو اس کی طبیعت قبول کرچکی ہے وہی اب اس کا اصلی و ذاتی سرمایہ ہیں۔ شاعری اور خصوصاً صنف غزل ان چیزوں سے الگ رہنا چاہتی ہے جو اس کی فطرت کے مخالف ہیں اور جن سے اس کی طبیعت مالش کرتی ہے۔ بھاشا کے ثقیل و کرخت الفاظ اور ہندی کے غیر مانوس و اجنبی دیو مالائی واقعات سے اگر وہ مصالحہ گیر نہ ہو تو اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی شخص کو کوئی غذا بالطبع مرغوب نہ ہو تو کوئی دانشمند اس کو صرف اس بنا پر کہ یہ ملکی پیداوار ہے اس کے کھانے کے لئے مجبور نہیں کرے گا۔ اردو شاعری کے لئے بھی ایسی ثقیل غذا تجویز کرنا جو سوءِ ہضمی کا باعث ہو کسی طرح مناسب نہیں۔ انگریزی شاعری کی ابتدا۔ اٹھان اور ارتقا بھی اردو شاعری سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ انگلستان میں ابتداءً وہی شخص مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا جو یونانی و لاطینی ادبیات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ بہت دنوں تک انگریزی زبان محض کاروباری ضروریات پوری کرتی رہی۔ وہ شعر و شاعری یا اعلیٰ ادب کی صلاحیت سے بے بہرہ تھی اس لئے انگلستان کے سخنور صرف لاطینی زبان میں فکر شعر کیا کرتے تھے لیکن جب انہیں اپنی مادری زبان کی ترقی کا خیال پیدا ہوا جو اس وقت تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی تو شعرائے انگلستان نے انگریزی زبان میں اُسی سُر اُسی لے اُسی تان کے ساتھ نغمہ سرائی شروع کردی جو یونانی و لاطینی شاعری کے لئے مخصوص تھیں۔ رفتہ رفتہ انگریزی شاعری کا دامن یونانی و لاطینی تشبیہات۔ استعارات۔ تلمیحات اور تصورات سے بھر گیا۔ یونانی اور لاطینی خرمن ادب کی خوشہ چینی سے انگریزی شاعری نے جو کچھ حاصل کیا وہ اُس کے ادبی ذخیرہ کا جزو اعظم ہے۔ یونانی و لاطینی ادبیات کی پیروی سے انگریزی شاعری کا جو نمونہ قائم ہوا۔ اس کو پوپ نے معراج کمال کو پہنچادیا اور اس کا نام "کلاسیکل لٹریچر" یعنی ادب العالیہ قرار پایا۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر شعرا کے لئے اس نمونہ نے خضر راہ کا کام کیا۔ ملٹن کے شاعرانہ کمال کا کون معترف نہیں؟ اگرچہ وہ مذہب تقشف (پوریٹن ازم) کا زبردست حامی تھا۔ اس کی شاعری میں مذہبی جوش نمایاں ہے تاہم اس کے کلام میں یونانی و لاطینی صنمیات (مائی تھولوجی) کی مشرکانہ تلمیحیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کیا کوئی شخص ملٹن کی شاعری پر صرف اس لئے حرف گیری کرسکتا ہے کہ اس کے کلام میں ملکی خصوصیات کم اور یونانی و لاطینی سرمایہ بہت زیادہ ہے؟ انگریزی شاعری کو یونانی و لاطینی ادبیات سے جو رابطہ ہے اس سے کہیں زیادہ گہرا تعلق اردو شاعری کو فارسی شاعری سے ہے۔ یونانی و لاطینی عنصر خارج کردینے سے انگریزی شاعری بالکل روکھی پھیکی۔ بے مزہ اور بے اثر ہوجائیگی۔ اسی طرح اگر اردو شاعری کو ایرانی وراثت سے محروم کردیا جائے تو اس کی محفل کی ساری رونق چشم زدن میں کافور ہوجائے اور غزل کا تو نام و نشان ہی مٹ جائے۔ باقی آئندہ

محمد حسین ادیب

رُخصت!

کبھی ہیں یاد بھی آؤں تو مت آنسو بہانا تم
یہی بہتر ہے مجھ کو رفتہ رفتہ بھول جانا تم

بھلا کیا فائدہ اک جی جلے پر جان کھونے کا
نہ ہونا سوگ میں شامل نہ تربت ہی پہ آنا تم

نہ کرنا یاد میری دکھ بھری آنکھوں کی مایوسی
تصوّر میں بھی یہ کلفت فزا منظر نہ لانا تم

جو یاد آئے کوئی اپنی جفا دل مت بُرا کرنا
غذا ہے دکھ مری ناحق نہ جی اپنا دکھانا تم

مری بربادیوں کی یاد میں رونے سے کیا حاصل
نہ اپنے آنسوؤں کے بے بہا گوہر لٹانا تم

مری ہستی کو اک خواب پریشاں فرض کر لینا
گزشتہ صحبتوں کی یاد بھی دل میں نہ لانا تم

مرے اقرارِ الفت کو سمجھنا قصّہٴ باطل
نہ دل کو اب مری حسرت کے افسانے سنانا تم

کوئی اچّھا کہے مجھ کو تو سننا بھی نہ بات اُسکی
بُرا کوئی کہے تو صدق دل سے مان جانا تم

جو ناممکن ہو جی سے بھولنا افسانہٴ غم کا
جو ناممکن ہے، ناممکن سے ممکن کر دکھانا تم

حامد علی خاں

مجلسِ اقوام کا پیغام

مجلس اقوام نے گذشتہ سال محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ذیل میں انہوں نے ہمایوں کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

خوبصورت جھیل، زمردیں پانی، دخانی جہاز، چھوٹی چھوٹی کشتیاں، جن میں حسین عورتیں سر جھکائے کہنیاں ٹیکے بیٹھیں، کناروں پر سبزہ، سبزے میں پھولوں کی کیاریاں، شاندار عمارتیں، عالیشان ہوٹل، فواروں سے موتیوں کی بارش، پانی کے جھرنے، جابجا چمن میں چھوٹی چھوٹی نہریں، بلوریں جام، رنگ برنگ کے شربت، غرض انواع و اقسام کی نعمتیں، چاروں طرف سرسبز و نیلگوں پہاڑ، برف سے لدی ہوئی چوٹیاں، بادل برف پر محو خواب...... خیالی دنیا نہیں حقیقت، فردوس بر روئے زمین...... شہر جنیوا اور مجلس اقوام!

کس قدر بڑا کیسا وسیع ہال!..... ہر ملک و قوم کی مخصوص نشستیں وسط میں، داہنے ہاتھ اخبار نویسوں کی کرسیاں، بائیں ہاتھ سیکرٹریوں کی، چاروں طرف عوام الناس کا ہجوم، سامنے اونچی جگہ صدر، سیکرٹری جنرل، نائب صدر اور ترجمانوں کی مخصوص جگہ، سینکڑوں نہیں ہزاروں کا مجمع۔

ہر تقریر کو سبھی سن رہے ہیں۔ بھلا ہو مارکونی کا ہر ملک کے رکن کے پاس وہ چھوٹی سی شے ہے جس کو کان سے لگا دو اور ہر تقریر کو اپنی زبان میں سن لو۔ انسان نے کمال کر دیا۔ ترجمان ایسے کہ ترجمے میں اصل کا پورا زور قائم رہے۔ پریس کو نوٹ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ سب تقریروں کا خلاصہ ختم ہوتے ہی ان کے لئے موجود ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں سائنس نے جو کمال کر دکھایا ہے جنیوا اور یہ انجمن اس کی زندہ تصویر ہے۔

اٹلی — سینیور گرینڈی اٹھے۔ روما کی گذشتہ عظمت اور اس کے شاندار مستقبل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا۔ تجویز کی کہ مجلس تخفیف اسلحہ کے اختتام تک اسلحہ کا بنانا موقوف کر دیا جائے کوئی ملک و قوم بحری یا بری یا ہوائی فوج میں اضافہ نہ کرے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟...... تالیوں سے ہال گونج اٹھا!

انگلستان — لارڈ رابرٹ سیسل کھڑے ہوئے۔ کہا کیوں نہیں؟ کیوں موجودہ فوجی مصارف میں سے ایک چوتھائی فوراً کم نہ کر دیا جائے؟ وقت آگیا ہے بلکہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ہر ملک فوجی خرچ کے بار گراں سے دبا جا رہا ہے۔ انسانیت متقاضی ہے کہ اس بوجھ کو کم کرنے کی نہ صرف کوشش کی جائے بلکہ اس سعی کو فی الفور عملی جامہ پہنایا جائے۔ اگر اس قدر تہذیب و تمدن ہمیں اس بار سے سبکدوش ہونے میں مدد نہ دے تو ایسے تمدن کا کیا فائدہ؟ لازم ہے کہ ہم سب بہت جلد متفق ہو کر بنی نوع انسان کی تکلیفوں کو کم کریں اور تمام وہ روپیہ جو جنگ کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے مفید و کارآمد کاموں میں لگایا جائے۔ جنگ و جدل کا ہمیشہ کے لئے قلع و قمع کرنا ہمارا فرض ہے...... ایک ایک لفظ ایسا تھا جیسے موتی پروئے جا رہے ہوں۔ کونسا دل تھا جس پر ان الفاظ کا اثر نہ ہوتا؟

سب کے دل مسرت سے لبریز تھے۔ انسانیت کی رہائی کا زمانہ آگیا۔ بین الاقوامی انجمن کی کامیابی یقینی ہے۔ دنیا اب ایک نیا دور دیکھے گی یعنی امن اور خوشی و اطمینان کا زمانہ آنے والا ہے۔ خوش ہو جاؤ کہ مشکلات کے حل ہونے کا وقت آگیا۔

فرانس اور جرمنی کیا کہتے ہیں۔ ان دونوں زبردست طاقتوں کے نمائندے ہال میں موجود نہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں سے ان کی رائے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کیا جواب دیں۔ خدا بھلا کرے سائنس کا جس نے صلاح و مشورہ کو ایسا آسان کر دیا۔

فرانس — موسیو بریاں کی باری آئی۔ ایک دھواں دھار تقریر کی۔ ایک گھنٹہ دس منٹ تک ایک زبردست مقرر بن کر انسانی جذبات پر گویا اپنی

مضراب چلائی، ہاتھوں سے آنکھوں سے یہاں تک کہ پاؤں سے بھی کام لیا۔ چاروں طرف شاندار فقرے بکھرے۔ سامعین محو حیرت تھے معنوں کو سوچنے کا کسے ہوش تھا سب غرق آواز اور غرق الفاظ تھے۔ تقریر ختم ہوئی۔ نشہ تمام ہوا۔ کیا تھا، کیا کہا! ایک زبردست مقرر کی تقریر بس اور کچھ نہیں۔ . . . . . سب نے سر جھکا دئے۔

جرمنی۔ ڈاکٹر کرٹس کو وہی کہنا تھا جو فرانس نے کہا کہ یہ کام آسان نہیں ہوتے آہستہ آہستہ سرانجام پاتے ہیں۔ انسانیت کو اس مرض سے رہائی دلانا ہمارا فرض ہے۔ اب اسلحہ کانفرنس ہونے والی ہے۔ اسے کامیاب بنانے کی پوری سعی کرنی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

سپین۔ سلوادور دی مادریاگا اُٹھے۔ کہا ہوش میں آؤ۔ اپنے فرض کو نہ صرف سمجھو بلکہ اسے جلد سرانجام دو۔ وہ مدد دو جو اصلی مدد ہو۔ الفاظ بہت ہو چکے اب کام کا وقت آیا ہے۔ کمر ہمت باندھو اور اسے سرانجام دو۔

یہ تھی بین الاقوامی انجمن کی پہلی نشست۔ تین ہفتے چھ کمیٹیوں نے کام کیا۔ یہ انجمن جو کچھ کام کر رہی ہے کاش اس کے متعلق لوگوں کو پورا علم ہو سکے۔ دنیا کے بہترین دماغوں کو جمع کرنا اور دنیا کی سب قوتوں کو یکجا کرنا آسان کام نہیں۔ مزدوروں کی حالت کیسے بہتر ہو سکتی ہے؟ اس قسم کے "لاعلاج" امراض کی دوا کیسے مل سکتی ہے؟ دنیا کو روپیہ کی کمی سے کیسے نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ انسان کو غلامی کی ذلت سے بچانا کیونکر ممکن ہے؟ عورتوں اور بچوں کا بیگار میں پکڑا جانا کیسے روکا جا سکتا ہے؟ افیون اور کوکین وغیرہ نشوں سے انسان کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ یہ ان کاموں میں سے چند کام ہیں جو لیگ نے کچھ سرانجام دئے اور کچھ سرانجام دے رہی ہے۔ بین الاقوامی قانون کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ بین الاقوامی عدالت قائم ہو چکی ہے۔ لیگ ہر دم ہر ملک و قوم کو مدد دینے کے لئے تیار ہے جس کام میں انہیں مشورہ درکار ہو مشورہ مل سکتا ہے۔ اور وہ اصلاح و مدد ایسی ہے جو عموماً بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں برباد شدہ خانماں انسانوں کے لئے لیگ گھر مہیا کر چکی ہے۔ سب سے بڑا کام جو اس وقت تک لیگ نے کیا ہے وہ نشہ آور چیزوں کے ترک کرانے کا کام ہے۔ لیگ کی یہ کوشش ہے کہ یہ چیزیں ہر ملک میں اتنی بنیں جتنی جائز ضرورت کے لئے درکار ہوں تاکہ بیجا استعمال کا موقعہ ہی نہ آسکے۔ بیشک ابھی لیگ نے وہ کام سرانجام نہیں دیا جس کے لئے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی یعنی دنیا کو جنگ و جدل سے رہائی دلانا مگر اس کام کی تکمیل کے لئے وہ ہر قدم کوشش کر رہی ہے۔ لیگ نے تمام دنیا کے لئے شہر جنیوا میں ایک ایسی جگہ مہیا کر دی ہے جہاں تبادلۂ خیالات ہو سکے۔ اور ایک دوستانہ مقام میں ہر ملک و قوم کے انسان مل سکیں ان کے دلوں میں ایک دل ہونے کی آرزو پیدا ہو اور اس میں وہ ایک دوسرے سے بازی جیت لینے کی کوشش کریں۔ یہ تبادلۂ خیالات انہیں ایک دوسرے کے مقصد زیست۔ ایک دوسرے کے علم و عمل کے سمجھنے اور اس کی قدر کرنے میں مدد دے۔ کیا یہ سب سے بہتر ذریعہ انسانیت کو ہم خیال بنانے کا نہیں۔

یہ بارہ سال کا کمسن بچہ وہ کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو صدیوں کے بوڑھوں سے نہ ہو سکا۔ مگر اسکو کامیابی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ہر فرد بشر ہر مرد عورت اس کی مدد پر کمر بستہ ہو جائے جب ہم میں تمام انسانی ہمت و قوت انسانی فہم و فراست اور انسانی کوشش کو یکجا جمع کرنے کی امنگ پیدا ہو۔ آج کل کی دنیا میں جب تک ایسا نہ ہوگا یہ تمدن و سائنس کی دنیا اپنے آپ کو خود تباہ کرے گی اور یہ ترقی زیست کی موت ثابت ہو گی۔ وہ نسخہ جسے نوع انسان کو استعمال کرنا ہے جس پر تمام دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے یہ ہے۔ کہ "دنیا ایک اور انسان بھی سب ایک ہیں ہر فرد بشر یکساں حق رکھتا ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کا حق چھین لے۔" اس کا پورا استعمال کرو تاکہ کوئی مرض باقی نہ رہے اور انسانیت تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے۔ دوائی تلخ ہے مگر اس کے سوا چارہ نہیں۔

یہ پیغام تھا جو لیگ نے مجھے دیا!

جہاں آرا بیگم

جذباتِ تاجورؔ

تمہارے دل سے مٹے دشمنی محبّت کی
سُنو جو درد بھری راگنی محبّت کی

ہم اپنی رام کہانی تمہیں سُنائیں گے
شنیدنی ہے یہ ناگفتنی محبّت کی

مریضِ عشق کا دم توڑنا خدا کی پناہ
ہے دردناک بہت جاں کنی محبّت کی

جمالِ دوست میں پیدا ہو رنگِ جلوۂ عشق
جو دل میں دوست کے ہو چاشنی محبّت کی

متاعِ صبر و سکوں لوٹ لی محبت نے
نصیبِ زیست ہوئی رہزنی محبّت کی

فروغِ مہر کو ہو میرے دل سے کیا نسبت
اِس آئینے میں تو ہے روشنی محبّت کی

تاجورؔ

خودکُشی

رات کے سناٹے میں پُل کے آہنیں، برف کی طرح سرد کٹہرے پر وہ جھکا ہوا کھڑا تھا، وہ ــــــ خدا کی مملکت کا فرار شدہ قیدی عالمِ بے اختیاری میں آہستہ سے اُس نے زمین کو اپنے پاؤں سے ٹھکرایا۔ ابھی ابھی وہ قدرت کی اُن پُراسرار زنجیروں کو توڑ کر چلا آرہا تھا جن کی بندش میں مدتوں اُس کے قدم جکڑے رہ چکے تھے ــــ اور آج وہ آزاد تھا، صرف ایک ہلکی سی جھنکار کو سن لینے کے بعد جو یک بیک، خدا جانے کیوں اُس کی سماعت کے پردوں سے آٹکرائی تھی۔

اُفقِ بعید سے چاند کی لرزتی ہوئی سرخ کرنیں پانی کی سبز زرد موجوں پر تیرتی ہوئی آئیں اور دریا ایک وسیع و بسیط سفید چادر کے مانند اس کی نگاہ کے سامنے پھیلا ہوا نظر آیا جس طرح مدتوں کا بے خواب، تھکا ماندہ انسان اپنے سامنے گرم بستر کو دیکھ کر ایک سرور آمیز اطمینان محسوس کرتا ہے، وہی روح پرور کیفیت اس چھینٹے اڑاتے اور چھلکتے ہوئے دریا کو دیکھ کر اُسے محسوس ہو رہی تھی ــــ تمام روحانی درد و کرب، تمام ذہنی کلفتیں، زندگی کے تمام پُرشور ہنگامے ساتھ لئے ہوئے دریا کی تہہ میں ایک دائمی نیند سو جانا ــــ کس قدر لطیف تھی ایک میٹھی نیند ــــ ایک آزادی کی نیند ــــ اور وہ آگ جو جہنم کی جھلستی ہوئی آگ کے خیالی تصور سے کہیں زیادہ گرم تھی وہ جس کی لپٹوں میں خاموشی کے ساتھ دن رات وہ جلا کیا تھا ایک ہی لرزش قدم سے بجھی ہوئی رکھی تھی ــــ اور کون سی شے تھی جو اس وقت صحیح معنوں میں اُسے اذیت پہنچا سکتی؟ ــــ پھر اسی ہنگاموں سے معمور اسی پُرشور بستی میں زندگی کی کٹھن منزل پر پابہ زنجیر عرصۂ روزگار کو طے کئے جانا، اس وقت ہلکی سے ہلکی کھڑکھڑاہٹ بھی اُسے چونکائے دیتی تھی ــــ کہیں پُرفریب زندگی نے اسے از سرِ نو محبوس کر لینے کے لئے کسی نئے فتنے کو بیدار تو نہیں کر دیا؟ ــــ اور پھر وہ ایک لمحہ کے لئے دم سادھ کر کھڑا ہو جاتا۔ یہی کیفیت شاید کبھی زندگی کی محبت میں موت کے خوف سے اُس پر طاری ہوتی ہو لیکن آج یہ خوف اُس خوف سے کس قدر مختلف تھا۔

پھر اُس نے نگاہ اوپر اُٹھائی ــــ اوپر ہی اوپر ــــ اتنی بلندی پر وہ اُسے لے گیا ــــ وہ خدا کی مملکت کا فرار شدہ قیدی جہاں آج تک کسی دنیادار آنکھ کی رسائی نہ ہوئی تھی اور دُور بلندیوں پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ مسرت ــــ جس کی تلاش میں اُس کے پاؤں کے چھالے ابھی تک خشک نہ ہوئے تھے اپنا کھیل کھیلتی ہوئی صرف ایک بار ہر دل کے قریب ہو کر گذرتی تھی ــــ عمر بھر میں صرف ایک لمحہ ــــ اور جب تک کوئی اس کے خیر مقدم کے لئے اپنا دروازہ کھولے وہ کوسوں دُور کی منزل پر ہوتی ہے ــــ اور وہ دروازہ ایک مدت تک یونہی بیکار کھلا پڑا رہتا۔ اور وہ جن کے شکوہ و دولت پر دنیا کو رشک تھا چشمِ ظاہر جن کے قدموں میں خوشیوں کے دریا موجیں مارتے دیکھتی تھی وہ بھی خلوت کے تاریک پردوں کے پیچھے اوندھے گرے ہوئے اس کی فرقت میں بے بسی کے آنسو بہا رہے تھے۔

اور کون تھا جس نے تیرہ و تار رات میں ایک بار یہ آرزو نہ کی کہ یہ وسیع ظلمت اُس کی رُوح اور اس کے جسم کو اپنے اندر ہی اندر تاریکی کے ایک بادل کی طرح جذب کر کے اسے دنیا اور دنیا والوں کی نگاہ سے ہمیشہ کے لئے اوجھل کر دے۔ ہر سینے میں ایک چھپی ہوئی انگاری سلگ

رہی تھی اور اُس کا دھواں اندر ہی اندر اس کی روح پر کہر بن کر چھا رہا تھا۔ اور نہ جانے کن مصلحتوں کو برقرار رکھنے کے لئے ان میں سے ہر ایک اپنے دل کی آگ کو دوسرے کی نظر سے چھپاتا پھر رہا تھا۔

محبت اور دوستی — اُف یہی تھی زندگی کی سب سے بے حاصل تلاش جس طرح ہرن اپنے نافے کی خوشبو سے مست ہو کر جا بجا اُس کی تلاش میں آوارہ پھرتا ہے اسی طرح بے چارہ انسان اُس محبت کی تلاش میں تھا جو خالق نے اس کے دل میں صرف اُسی کی ذات کے لئے ودیعت کی تھی۔ وہ صرف اپنی ذات کا دوست تھا۔ اپنا ہی غمخوار، اپنا ہی ہمدرد، اپنی ذرا ذرا سی خوبیوں کو آپ پہچاننے والا اور اپنے بڑے سے بڑے عیوب پر چشم پوشی کے لئے ہر وقت تلا ہوا لیکن آہ وہ نادان ان سب کو کسی اور خانۂ دل میں تلاش کرنے کے لئے دیوانہ وار عرصۂ ہستی میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اور وہ خود بھی کبھی اس راہ میں بھٹک چکا تھا لیکن پھر اُس نے خیال کیا کہ اگر قانونِ قدرت کچھ اور ہوتا تو کیوں وہی محبوب عکسِ رُخ جو افقِ زندگی پر اُسے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ نظر آیا تھا — جس کے قدموں تلے اس کی زندگی کی بہترین ساعتیں مدفون ہوئی تھیں اُسے تنہا موت کی تاریکیوں کی طرف دھکیل رہا تھا۔

اور کون تھا جس نے اُس کے دل کی شکستگی کے ساتھ ہی ایک عالم کو شکستہ ہوتے ہوئے پایا کون تھا جو اس کی تباہ شدہ محبت کے مزار پر ایک عرصہ خون کے آنسو رویا کس نے اُس کے چوٹ کھائے ہوئے غرورِ نفس میں ٹھہر ٹھہر کر اُٹھنے والی ٹیسوں کو اسی شدت کے ساتھ محسوس کیا؟ وہ خود۔ اور اس کے سوا کون تھا؟

وہ بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر چلا آ رہا تھا لیکن ایک لمحے کے لئے بھی ان کی تکمیل کے خیال نے اسے مضطرب نہ کیا۔ ساری دنیا اسکے سامنے ایک ناکام و ناتمام جد و جہد میں مصروف تھی — قدرت کے اس کھیل کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے جو محض بگڑنے کے لئے بنا تھا — اس بنیاد کو استوار کرنے کے لئے جو صرف گرا دینے کے خیال سے رکھی گئی! دور بلندیوں پر اُس کے تخیل نے زندگی کی تصویر کو اس رنگ میں دیکھا۔ ایک بھولا بھالا معصوم بچہ کسی بھیانک غار کے پھیلتے ہوئے کنارے پر ہر لمحہ قریب تر پہنچے ہوئے انجام سے بے خبر اپنے مرغوب کھیلوں میں محو بیٹھا تھا — ایک زہر خند تبسم اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا اور پھر اس نے جلدی سے دریا کے چکر کھاتے ہوئے پانی پر نگاہ ڈالی۔ ایک تند و تیز لہر آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے دعوت دیتی ہوئی آگے بڑھی "آؤ میری آغوش دیر سے تمہارے انتظار میں وا ہے اور تمہاری بے خواب آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں"۔

وہ ساتھ والے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ کر آیا تھا — اُن کی نمناک آنکھوں کا تصور پھر ایک بار اسے دنیا کی شورشوں میں کھینچتا ہوا لے گیا — لیکن تصور ہی تصور میں کس قدر سرعت کے ساتھ پھر وہ واپس لوٹ رہا تھا کیونکہ اسی سرعت کے ساتھ ان آنسوؤں کو اُس نے پھر انہیں آنکھوں میں جذب ہوتے ہوئے دیکھ پایا تھا اور چشم زدن میں دنیا اپنی رنگینیوں کا ایک نیا پردہ اُس کے اور اُن کے درمیان حائل کر چکی تھی اور اُن میں سے بعض جو بری طرح عقل و دانش کے اسی پر پیچ چکر کے درمیان گھرے ہوئے تھے اسے "بزدل" کہیں گے اور "دنیوی فرائض سے منہ موڑ کر ہمت ہار جانے والا" لیکن یہ مصنوعی رسوم و قیود، یہ خود عاید کردہ پابندیاں اب اس سے دور کس قدر فاصلے پر پڑی دم توڑ رہی تھیں۔ تقدیر کے اٹل قوانین سے آزاد ہو کر اب وہ ان سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

دنیا کی تمام طرب ناک اور الم انگیز نیرنگیوں کو بھول جانے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بازو اٹھتی ہوئی موجوں کی جانب پھیلا دئے — عین اس وقت زندگی روتی ہوئی آکر اسکے قدموں میں گر گئی — اور پاؤں کی ایک جنبش سے اُسے ٹھکرا کر وہ آگے نکل گیا — پانی میں صرف ایک دھمک سی اٹھی اور پھر سطحِ آب پر سکون طاری تھا۔ اسی طرح ہوا کے برف بار جھونکے سائیں سائیں کرتے ہوئے دریا کے اُس پار جا رہے تھے اور تنہا رات اپنے سیاہ آنچل میں روشنی کو چھپائے ویسے ہی ساکت و صامت کھڑی تھی۔

"راہرو"

غزل

جو حال دیکھتے ہو وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمہارا خیال ہے
اور وہ خیال جس کا بھلانا محال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ افشائے راز ہو
یہ عرض تھی کہ ضبطِ تمنّا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے
للہ یہ نہ پوچھ کہ جی کیوں نڈھال ہے

اچھا! اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

مقدور ہو تو زخمِ جگر سے یہ پوچھئے
ظالم! ترے نصیب میں بھی اندمال ہے؟

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں
کمبخت! دیکھ تو کوئی پرسانِ حال ہے

اے بختِ سازگار! ہمیں یہ خبر نہ تھی
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ ملنا محال ہے

اب دل ہے اور دل میں ہزاروں تفکرات
اور وہ تفکرات کہ جینا وبال ہے

قاضی ہو، شیخِ وقت ہو، زاہد ہو، رند ہو
ہم دیکھتے ہیں، مفت کی سب کو حلال ہے

آزاد! دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے طبیعت نڈھال ہے

حکیم آزاد انصاری

ابُوحامد

(۱)

جب غرناطہ کا آفتاب غروب ہوگیا اور وہاں کے آخری تاجدار ابو عبداللہ کو غریب الوطن ہونا پڑا تو اس نے اپنی روانگی سے قبل پاول کی چوٹی پر کھڑے ہوکر پہلے تو سمندر کی طرف نظر کی جدھر سے اُس کے اسلاف اسپین میں آئے تھے اور پھر دریائے وادالگا پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالی، جس کے کنارے شاہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے خیمے ایستادہ تھے، اہلِ اسلام کے چند مقابر کا پیشِ نظر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں اور اس وقت سلطانہ عائشہ نے (جو اس جلاوطنی میں اس کے ہمراہ تھی) ان مردانہ صفت الفاظ کا اعادہ کیا جو مغربی یورپ میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

"جس سلطنت کی تو مردوں کی طرح حفاظت نہ کرسکا۔ اب اس پر عورتوں کی طرح رو۔"

ہسپانوی موروں کے مختلف قبیلے افریقہ کی اسلامی ریاستوں میں آباد ہوگئے، زیگیری اور گومل جو فیض سے آئے تھے پھر اسی جگہ واپس آگئے، وینیگا اور الابا الجیریا کے ساحل پر مقیم ہوئے اور بنو سراج نے طرابلس کے قرب و جوار میں سکونت اختیار کرکے کارتھیج کے منہدم شدہ شہر کے سامنے ایک نوآبادی قائم کی جو آج تک مشہور ہے۔ ان نوآبادیوں میں جنت الغرناطہ کے افسانے رائج تھے اور جب مائیں بچوں کو سُلاتی تھیں تو زیگیری اور بنو سراج کے گیت ان کی لوریاں ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہر جمعہ کو غرناطہ کی واپسی کے متعلق دعائیں مانگتے تھے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی یہ گریہ وزاری اثر سے ہمیشہ عاری رہی۔ غرناطہ کے محلات سے نکلنے کے بعد ان لوگوں کو نہ تو پھل شیریں معلوم ہوتے تھے اور نہ فطری مناظر ہی میں کوئی دلکشی نظر آتی تھی۔ گویا جلاوطن ہوتے وقت ان کا دل وہیں رہ گیا تھا۔

بنو سراج کو تمام قبائل سے زیادہ صدمہ تھا۔ یہ لوگ غرناطہ کی فوج کے مسلمہ جنگ جو تھے، لیکن چونکہ اس آبادی میں جنگ کا ذکر بھی نہ تھا اس لئے انہوں نے شمشیر زنی کو ترک کرکے جڑی بوٹی کی شناخت کو اپنا مشغلہ اور طب کو اپنا پیشہ قرار دے لیا تھا۔ گویا وہ قوم جو کبھی زخم لگانے میں مشہور تھی اب ان کا اندمال کرنے لگی۔

اسی قبیلہ میں وہ خاندان بھی تھا جو محلات میں رہا کرتا تھا، انہوں نے عین اس مقام پر ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا لیا تھا جہاں سینٹ لوئی نے شہادت پائی تھی۔ اس مکان کی دیواروں پر ان کی گذشتہ عظمت کی یادگار ڈھالیں، تلواریں اور دیگر آلاتِ حرب آویزاں تھے جس کے مقابلہ میں میزوں پر گھاس پھوس اور جڑی بوٹیاں رکھی ہوئی تھیں، جو نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی زخموں کو بھی مندمل کر دیتی تھیں۔ لیکن ایک زخم کے واسطے کوئی دوا نہ تھی اور وہ اب تک اسی طرح ہرا تھا۔

غرناطہ کی فتح کو چوبیس سال ہوگئے تھے۔ اس دوران میں بنو سراج کے چودہ نفر موسم کی سختیوں اور آب و ہوا کی ناموافقت سے چل بسے، اور اب اس خاندان کا لے دے کر ایک سہارا، ایک رہنما اور ایک سردار ابو حامد تھا جس میں اپنے اجداد کی تمام صفات موجود تھیں، وہ جری ہونے کے علاوہ نیک دل، خوش خلق اور سخی بھی تھا، لیکن ساتھ ہی غریب الوطنی نے اس کے چہرہ پر مایوسی کا پھیکا پن پیدا کر دیا تھا۔

باپ کے انتقال کرتے ہی اس نے غرناطہ جانے اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا عزم کر لیا تھا لیکن اس خیال سے کہ ماں کی ممتا مانع نہ ہو اس نے اپنے منصوبوں کا کسی سے ذکر نہ کیا اور ایک دن بلا کسی کو اطلاع دیئے جہاز پر سوار ہو کر یورپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جبل الطارق پہنچ کر اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ ایک طبیب ہے اور سیرا نویدا کی وادیوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرنے آیا ہے۔ لیکن اُس کا دل مرتعش تھا اور جب اُس کی نظر ایک اسلامی عمارت پر پڑی جو دست بُرد زمانہ کے ہاتھوں کھنڈر ہو گئی تھی تو اس کو معاً اپنے خاندان کا خیال آیا اور اس مشابہت نے بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کو اندوہگیں کر دیا۔ سڑک پر تلوار بند مسافر جا رہے تھے اور ہر گذرنے والا ابو حامد کو سلام کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مست تھا اور نہ کچھ سنتا تھا نہ سمجھتا۔

غرناطہ کا پہلا نظارہ بہت صبر آزما تھا۔ یہ شہر دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے اور اس کی شکل نیم وا انار کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کو غرناطہ کہتے ہیں۔ اس کے ہر دو جانب دریا ہیں اور قریب ہی ویگا کی وادی ہے جس میں پھل وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ابو حامد نے اس جنت ارضی کو دیکھ کر اپنا خچر روک لیا اور راہبر سے مختلف عمارات کے متعلق سوال کرنے شروع کئے۔ ہسپانوی اگوا کا ایک ایک لفظ اس کے حق میں تیر و نشتر سے کم نہ تھا۔ تقدیر کا تمسخر ہی کہنا چاہیئے کہ بنو سراج کا ایک فرد اپنے اجداد کی عمارت کے متعلق اجنبیوں سے سوال کر رہا تھا اور خود محض لاعلم تھا۔

اس نے ایک مسلمان سردار کے مکان پر قیام کیا جو غرناطہ میں ریشمی پارچوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ لیکن روئیداد قلب نے اس کو اطمینان سے نہ سونے دیا اور وہ آدھی رات کے وقت گھر سے نکل پڑا۔ نوجوان شہزادے نے غرناطہ کے چپہ چپہ کا حال سُنا تھا اور اب تاریک رات میں وہ اپنے اجداد کے محلوں اور کتب خانوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ان سڑکوں پر کسی زمانہ میں بنو سراج کے جلوس نکلا کرتے تھے لیکن اس وقت شور و شغب کی جگہ موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ شہر کے باشندے تبدیل ہو گئے تھے اور فاتح سردار مفتوحوں کے محلات میں مستِ خواب تھے۔ انہیں خیالات کو لئے ہوئے ابو حامد شہر کے کوچہ و بازار میں گشت کر رہا تھا۔ لیکن جب اُس نے واپسی کا ارادہ کیا تو قوتِ حافظہ جواب دینے لگی۔ اصل یہ ہے کہ وہ سڑکوں پر بلا کسی اصول کے چل رہا تھا اور راستہ بھول گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ واپسی کی کوشش کی لیکن بیکار، راہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔

ٹھیک اُس وقت قریب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ جو ملکہ گوتھ کا سا لباس پہنے ہوئے اس کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے ہمراہ ایک دوسری عورت تھی اور دو خادم، جن میں سے ایک "دعاؤں کی کتاب" لئے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا حسن ابو حامد کے نزدیک نہ صرف کامل بلکہ مافوق البشر تھا اور ایک مرتبہ تو اس کو گمان ہوا کہ آسمان سے حور اتر آئی ہے۔ اجنبی لڑکی نے بھی جو صبح کی نماز ادا کرنے گرجا جا رہی تھی اس نووارد کو استعجاب کی نظر سے دیکھا، مگر پھر بلا کسی قسم کا جوش ظاہر کئے اشارہ سے ابو حامد کو اپنے پاس بلایا اور کہا "مور صاحب! آپ غالباً آج ہی کل میں تشریف لائے ہیں؟ کیا آپ کو راستہ نہیں ملتا؟"

ابو حامد نے کہا "اے ملکۂ حسن، اے کنیزِ نصرانی تمہارا خیال درست ہے۔ میں مور سردار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں، اور راستہ بھول کر نہ معلوم کہاں آ گیا۔ تم کو ہمارے پیغمبر اس ذرہ نوازی کا اجر دیں۔"

دوشیزہ مُسکرائی اور جواب دیا "موروں کا طرزِ کلام مشہور ہے، مگر میں نہ حسن کی ملکہ ہوں نہ کنیز۔ اور نہ مجھ کو تمہارے پیغمبر کی عنایت درکار ہے۔ البتہ میں تم کو منزلِ مقصود تک پہنچائے دیتی ہوں۔"

چنانچہ اس نے جلد جلد چند سڑکیں طے کیں اور مور تاجر کے دروازہ کی طرف اشارہ کرکے ایک گلی میں غائب ہوگئی۔

اس ذراسے واقعہ نے ابوحامد کی دنیا تبدیل کر دی۔ اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ سب خواہشات ملیامیٹ ہوگئیں اور ان سب کی جگہ اُس برق صفت معشوقہ کا خیال اس کے دل میں جاگزیں رہنے لگا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنے آبا واجداد کی یادگاروں پر آنسو بہائے اور اپنے خاندانی حظیرے کی بھی زیارت کی۔ لیکن اب اس کے دل میں وہ خلوص باقی نہ تھا جس کو وہ افریقہ سے لیکر چلا تھا۔

یہ نامعلوم دوشیزہ کون تھی؟ ابوحامد نے اس سے دوبارہ ملنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود۔ کوئی کوچہ کوئی بازار، کوئی محل، کوئی گرجا ایسا نہ تھا جہاں وہ اُس کی تلاش میں نہ گیا ہو۔ عشق نے اس کے جذباتِ حمیت کو اس قدر پامال کر دیا تھا کہ وہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے مقابر پر بھی ہو آیا لیکن فضول۔ گوہرِ مقصود کہیں ہاتھ نہ آیا۔

(۲)

ایک روز شہر سے دُور جنگل اور پہاڑوں میں ابوحامد چند بوٹیاں تلاش کر رہا تھا، یکایک اس کی نظر درختوں کے ایک کنج پر پڑی جس کے درمیان دیہاتی وضع کا ایک مکان بنا تھا اور وہ ابھی محوِ تحیر ہی تھا کہ اس کی کھڑکیوں سے کسی خوش گلو نازنین کے نغموں کی آواز نکلنے لگی، مور کا دل مرتعش ہونے لگا اور اس نے زیرِ لب کہا "بے شک یہ اسی کی آواز ہے" نامعلوم حسینہ ایک قسطلی راگ نکال رہی تھی جس میں بنوسراج اور زنگیریوں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ بنوسراج کا نام سن کر ابوحامد کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور مکان میں داخل ہوگیا۔ اس دخل درمعقولات سے محفل درہم برہم ہوگئی اور لڑکیاں مور کی صورت سے دہشت کھاکر وحشی ہرنیوں کی طرح بھاگنے لگیں، دوشیزہ ہچکچائی، لیکن ابوحامد کو دیکھ کر بول اٹھی "ارے یہ تو وہی مور ہیں"۔

ابوحامد نے کہا "پری وش خاتون، میں نے آخر تم کو ڈھونڈ نکالا، میں نے آواز ہی سے تم کو پہچان لیا تھا، اور اب اس احسان کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں"۔

لڑکی نے مُسکراکر جواب دیا "مجھ کو بھی تمہارا ہی خیال تھا اور اسی وجہ سے میں بنوسراج کی بہادری کا گیت گا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ موری مبارز بھی تمہاری ہی طرح ہوں گے"۔

اس فقرے کا اعادہ کرتے وقت یلانکا (لڑکی کا نام) کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا جس کو مور نے بھی دیکھ لیا۔ اس کو اپنی قوم پر بیجا فخر نہ تھا اور ابوحامد کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دوشیزہ پر اس حقیقت کا اظہار کر دے کہ وہ خود بنی سراج کا آخری چشم و چراغ ہے لیکن اس امر کا اعادہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے اپنی محبوبہ سے جدا کر دیتا، اس لئے اُس نے خاموشی ہی کو مناسب سمجھا۔

یلانکا کا خاندان شرافت و نجابت کے واسطے مشہور تھا اور اس کے دادا کو شاہ فرڈی نینڈ نے حسنِ خدمات کے صلے میں

موروں کی جاگیریں اور ڈیوک کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ دوشیزہ کا ایک بھائی بھی تھا جو تاریخ میں ڈان کاربو کے نام سے مشہور ہے، یہ شخص ایک مشہور نبرد آزما تھا اور اس نے اس وقت تک بہادری میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ باپ کو بلانکا کے ساتھ ابتدا ہی سے بہت اُنس تھا اور بیوی کے انتقال پر تو گویا اس کی تمام مسرت اس لڑکی کے دم سے وابستہ تھی جو اس وقت اٹھارہویں سال میں قدم رکھ رہی تھی، آج کا جشن اس کی سالگرہ کی تقریب میں تھا۔

بلانکا نے ابوحامد کو باپ سے متعارف کراتے ہوئے کہا "یہی وہ مور صاحب ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا"

ابوحامد کو بھی جشن میں شرکت کی اجازت دے دی گئی اور اس نے مشرقی افسانے سنا کر نہ صرف بلانکا بلکہ اس کے والد اور تمام حاضرین کا دل موہ لیا اور جب جلسہ برخاست ہوا تو اس سے وعدہ لے لیا کہ گاہے گاہے ڈیوک کے گھر آیا کرے گا چنانچہ دوسرے دن آفتاب کی ابتدائی کرنوں کے ساتھ ہی وہ اپنی معشوقہ کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس کا دل اب دوشیزہ کے عشق کا گنجینہ تھا اور وہ تمام خیالات جو اس کے سفر اسپین کے محرک تھے فراموشی کے غیر متناہی عمق میں دھکیل دیئے گئے تھے۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ ان کا اظہار اس طلسم کو توڑ دے جو اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے مشرق و مغرب کے بُعد کا خیال نہ کیا اور نہ اس امر کا کہ دوشیزہ اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے اس کے اجداد کو غریب الوطن بنا دیا۔ وہ کہتا تھا "بس بلانکا مسلمان ہو جائے اور میرے ساتھ محبت کرنے لگے تو میں ہمیشہ کے لیئے اس کا غلام بن جاؤں گا"

ہسپانوی دوشیزہ کو بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کے دل پر ابوحامد کی محبت گہرے نقوش ڈال رہی ہے۔ اول اول تو اس کو یہ خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ ڈیوک سنتانی کی لڑکی کسی مور کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہے، لیکن جب اس پر حقیقت کا اظہار ہوا تو اسپینیوں کی طرح وہ بھی ناگزیر کے واسطے تیار ہو گئی اور کہنے لگی "بس ابوحامد عیسائی ہو جائے اور مجھ سے محبت کرنے لگے تو میں اس کے ساتھ دنیا کے ہر حصہ میں جانے کو تیار ہوں"

ابوحامد اور بلانکا دونوں اپنے ارادوں میں راسخ اور محبت میں مستقل تھے لیکن ابھی ایک کو دوسرے کی حالت کا اندازہ نہ تھا موسم بہار پوری رعنائی پر تھا اور دونوں اکثر و بیشتر باغ میں بیٹھے بلبلوں کے نغمے سنا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکی نے کہا "تم نے ابھی تک الحمرا کی سیر نہیں کی حالانکہ وہ تمہاری قوم کے بادشاہوں کی زندہ یادگار ہے۔ چلو میں آج تم کو وہاں لے چلوں"۔

مور سردار کو اس سے زیادہ خوشی کس بات میں ہو سکتی تھی کہ وہ الحمرا کو بلانکا کی معیت میں دیکھے، چنانچہ اس نے پہلے تو ڈیوک کی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کرایا اور پھر خود ایک اندلسی خچر پر بیٹھ گیا۔ مور کا لباس اور وضع، اس کی جرأت و شہامت اور شہسواری راہگیروں کے واسطے جاذب توجہ تھی اور اس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھتا تھا کہ "بلانکا اس کا فرشہزادے کو عیسائی بنانے لئے جاتی ہے"۔

الحمرا کی سیر بذات خود ایک رومان تھی، یہ عمارت گویا غرناطہ کے عروج و زوال کی مجسم تاریخ ہے۔ اس کو دیکھ کر ابوحامد کو اپنی بیکسی کا احساس دوچند ہو گیا اور وہ پکار اٹھا "آہ! بنو سراج کے بادشاہو! تم کس گوشے میں محو خواب ہو؟" بلانکا اس کو کیسے بود و باش کے تمام محلات دکھا رہی تھی، آخر وہ ایک کمرے میں پہنچی جس کی چھت سقفِ آسمان کی طرح نیلی فام اور دیواریں سورج کی کرنوں کے

مانند سنہری تھیں۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ تھا جس کا پانی ایک مرمریں پیالہ میں گرتا تھا۔ ڈیوک کی لڑکی نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسی پیالہ میں ابو عبداللہ نے بنو سراج کا خون بہایا تھا۔ ان کے خون کی رنگینی اب تک اس ظرف میں موجود ہے، دیکھو تمہارے ملک میں اُن مردوں کا یہ حشر ہوتا ہے جو عورتوں کو جھوٹے وعدے کر کے بہکالے جاتے ہیں "

ابو حامد پر اس نظارے کا بہت زبردست اثر پڑا۔ اس نے پہلے تو دوزانو ہوکر اپنے اجداد کے خون کو بوسہ دیا اور پھر دوشیزہ کے قدموں پر گر کر کہنے لگا "میں بنو سراج کے خون کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا "

یلانکا نے اپنے نازک ہاتھوں کو ایک دوسرے میں حمائل کرتے ہوئے دریافت کیا "ہاں، تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر کیا تم نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا: میں ہسپانی عیسائی ہوں اور تم مسلمان مور، پھر تم کو اپنی محبت کے اظہار کی جرائت کیونکر ہوئی۔ بہر حال میں معاملات کو صاف کر لینا ضروری سمجھتی ہوں۔ سنو! مجھ کو بھی تم سے محبت ہے اور اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو ہمیشہ کے واسطے تمہاری ہو جاؤں گی لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ اگر تم اس سے انکار کرتے ہو تو ڈیوک سانتافی کی لڑکی کسی طرح تمہاری بیوی نہیں بن سکتی "

ابو حامد کو یہ بات معلوم کر کے کہ لڑکی کا دل بھی اس کی محبت سے معمور ہے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ اُس کی شرط کو مطلق بھول گیا مگر پھر سنبھل کر بولا "اللہ اکبر! اے خدا تو ہی اس لڑکی کو سیدھا راستہ دکھا "

اب یہ دونوں "دوازدہ شیروں کے کمرے" میں پہنچے اور یلانکا نے اپنے ساتھی سے کہا "یہ النعیمہ کا کمرہ ہے۔ ابو حامد جب میں تمہارے عمامہ، عبا اور ہتھیاروں کے ساتھ تمہاری محبت کا خیال کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بنو سراج کا سردار بدنصیب النعیمہ کے ساتھ اس کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ ہاں ذرا اس کتبہ کے معنی بتانا "

فوارے کے اوپر ایک تحریر تھی جس کا کچھ حصہ دست بردِ زمانہ سے کالعدم ہو چکا تھا، ابو حامد نے اس پر لکھا ہوا دیکھا "حسین شہزادی جو اس جگہ محوِ خرام ہے اپنے حسنِ عالمتاب سے کمرے کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ۔۔۔۔۔" اور کہنے لگا "یہ تحریر دراصل تمہارے ہی واسطے لکھی گئی ہے۔ کاش میں بھی خوش نصیب بنو سراج ہوتا "

یلانکا نے ان الفاظ کو بہت غور سے سُنا، پھر بولی "لیکن اس وقت مجھ کو اور زیادہ اذیت ہوتی۔ اگر میرا کہنا مانو تو سرداری کے خیال کو چھوڑ دو۔ کیونکہ سردار اکثر شہرت کے پیچھے محبت کو فراموش کر دیتے ہیں "

ابو حامد نے کہا "اس طرف سے تو مطمئن رہو، کیونکہ میں تم کو شہرت سے بہت زیادہ عزیز رکھتا ہوں "

الحمرا کی سیر دونوں کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ انہوں نے اپنا پورا دن اس میں صرف کر دیا اور جب جدا ہونے لگے تو یلانکا نے کہا "میری قسمت پر ہمیشہ کے واسطے مہر ہو گئی۔ ابو حامد یاد رکھو جب تک تم مسلمان ہو گے میں تمہاری محروم قسمت کنیز ہوں لیکن عیسائی ہوتے ہی تمہاری خوش نصیب بیوی بن جاؤں گی "

ابو حامد کا جواب بھی ایسا ہی پُر اشتیاق و پُر حسرت تھا "جب تک تم عیسائی ہو میں تمہارا حسرت نصیب غلام ہوں لیکن اسلام

قبول کرنے کے بعد تمہارا شوہر بننے پر فخر کروں گا"

وقت کے ساتھ دونوں کی محبت میں اضافہ ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی وہ خلیج جوان کے ازدواج میں حائل تھی وسیع تر ہونے لگی۔ ابوحامد نے کبھی اپنے نام و نسب کا راز بلانکا پر ظاہر نہ کیا اور اس امر سے اس کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اسپین کی امیرزادی اس کے باوجود بھی اس کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنائے ہوئے تھی۔

(۳)

ایک روز مور کو خبر ملی کہ اس کی والدہ لب مرگ ہے اور مرنے سے قبل اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہے، اب وہ مجبور تھا کہ اس جنت ارضی کو چند روز کے واسطے خیرباد کہہ کر افریقہ جائے، چنانچہ اس نے بلانکا سے اپنی مشکلات کا اظہار کر کے کہا "سلطانہ! میں اپنی ماں سے ملنے جارہا ہوں، کیا تم اپنی محبت میں ثابت قدم رہوگی؟"

لڑکی اس ناگہانی واقعہ سے گھبرا گئی، اس نے سمجھا کہ ابوحامد ہمیشہ کے لئے اس کو خیرباد کہہ رہا ہے۔ لیکن مور سردار معاملات کو اس حالت میں نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے بلانکا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے اجداد کے قبرستان میں پہنچکر کہنے لگا "حسین نازنین، میرے باپ دادا اس قبرستان میں محو خواب ہیں اور میں ان کی روح کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ کہ اپنی عمر میں بجز تمہارے کسی دوسری عورت سے محبت نہیں کروں گا، اور جس وقت تم کلمہ پڑھ لوگی تو مدت العمر کے واسطے تمہارا خادم بن جاؤں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ ہر سال اسی موسم میں غرناطہ آیا کروں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ تم اپنی محبت میں ثابت ہو۔ نیز یہ کہ تم نے اپنی ضد کو ترک کیا یا نہیں"۔

بلانکا کا جواب بھی اسی قدر شریفانہ تھا "اور میں ہر سال تمہارا انتظار کیا کرونگی، تمہاری طرح میں بھی اپنی محبت کو تمہارے اور صرف تمہارے واسطے مخصوص کرتی ہوں، اور جس وقت خدا تمہارے کافر دل میں ایمان کی کرن ڈالدے گا میں نہایت خوشی سے تم کو اپنا شوہر بنالوں گی"۔

ابوحامد چلا گیا اور بلانکا کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ وہ اسی روز سے سال کے دن گننے لگی اور جب موسم بہار دوبارہ آیا تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ اس کو سمندر کے کنارے لے چلے۔ اس کا معمول تھا کہ روزانہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر افق کی طرف دیکھتی اور اگر افریقہ سے کوئی جہاز آنے والا ہوتا تو اس کا انتظار کرتی۔ ایک مرتبہ اس نے کسی مشرقی جہاز کو طوفانی لہروں میں گھرا ہوا دیکھا اور اس خیال سے اس کا دل سرد ہوگیا کہ کہیں اس کا عاشق صادق اس ورطۂ ہلاکت میں نہ پھنسا ہو۔

مور سردار نے اپنی والدہ کو زندگی کے آخری لمحے گنتے ہوئے پایا اور چند روز کے بعد اس نے داعی اجل کو لبیک کہہ دی گویا وہ کڑی جو اس کو افریقہ سے وابستہ کئے ہوئے تھی ٹوٹ گئی۔ اب اس کی نظروں میں دنیا تاریک تھی اور وہ بھی بلانکا کی طرح موسم بہار کا نہایت بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر موعودہ دن آگیا اور اس نے جہاز پر قدم رکھتے ہی اپنے خیالات کو بلانکا اور محض بلانکا کے واسطے وقف کر دیا "کیا وہ شہزادی اپنی محبت میں ثابت قدم ہوگی؟ کیا وہ بھی میری طرح اس روز کا انتظار کر رہی ہوگی؟

کیا اس نے ایک غریب عرب کو دل سے فراموش تو نہ کیا ہوگا"؟ اس قسم کے سینکڑوں سوال اس کے دل میں آتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابو حامد کو علم نہ تھا کہ باوفا معشوقہ اس کے انتظار میں چشم براہ ہے۔

اسپین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بلانکا نے اپنے عاشق کو پہچان لیا۔ اس کا حرماں نصیب دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دوڑ کر ابو حامد کے پاس جائے لیکن پاسِ وضع مانع تھا۔ آخر اس نے اپنے خادم کو بھیجا کہ مور کو مکان پر لے آئے۔ بنو سراج کا آخری چشم و چراغ بلانکا کے واسطے اپنے ملک کا ایک غزال لایا تھا جس کو اس نے معشوقہ کی خدمت میں پیش کیا اور سب لوگ خوشی خوشی غرناطہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بہار کا موسم گذر گیا۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہو گئے۔ لیکن وہ خلیج جو دونوں کے درمیان حائل تھی اب بھی اسی طرح موجود تھی اور ان کو حسرت نصیب بنائے ہوئے تھی۔ ایک کہتا تھا "مسلمان ہو جاؤ" اور دوسری کی دھن تھی "عیسائی بن جاؤ"۔ آخر فراق کا زمانہ آگیا اور ابو حامد آئندہ سال ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

(۴)

اس مرتبہ اس کا استقبال پر جوش نہ تھا۔ سمندر کے کنارے نہ بلانکا ملی اور نہ اس کا خادم لیکن گورنر نے اس کو ایک خط دیا۔ جس میں بلانکا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کا باپ دار الخلافہ چلا گیا ہے اور بھائی ایک فرانسیسی کے ساتھ وہاں مقیم ہے۔ ان کو چھوڑ کر وہ کسی طرح نہیں آسکتی۔ اس سرد مہری نے مور کو متوحش کر دیا۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا اور وہم طرح طرح کی مہیب اشکال پیش کر رہا تھا۔

بلانکا کا عذر معقول تھا۔ ڈان کارلو سات برس کی مسلسل عدم موجودگی کے بعد گھر واپس آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک فرانسیسی امیر زادہ بھی تھا۔ جس کی مہمان داری دونوں پر فرض تھی۔ ڈان کارلو نے مذہبی جنگوں میں شریک ہونے کے بعد تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو خدا کی راہ میں وقف کر دے گا اور ازدواجی زندگی سے ہمیشہ کے واسطے کنارہ کش ہو جائے گا۔ اس ارادہ کی باپ اور بہن دونوں نے سختی سے مخالفت کی لیکن چونکہ مذہبی معاملہ تھا اس لئے جبر سے کام نہ لے سکے اور نوجوان ڈیوک اپنے عزم میں راسخ رہا اب گویا خاندان کی تمام امیدیں بلانکا کی ذات سے وابستہ تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ڈیوک اور ڈان کارلو دونوں اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ابو حامد نے ڈیوک کے مکان میں داخل ہو کر دیکھا کہ اس کی معشوقہ ایک اجنبی کے پاس بیٹھی ہوئی ہے، اور ایک دوسرا نوجوان جو قرینہ سے بلانکا کا بھائی معلوم ہوتا ہے قریب کھڑا ہوا دوشیزہ سے باتیں کر رہا ہے۔ مور سردار کو دیکھ کر بلانکا کے منہ سے بے اختیاری میں "ابو حامد" نکلا مگر پھر سنبھل کر کہنے لگی "مبارزو! دیکھو یہی وہ کافر مور ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا، دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر غالب آجائے۔ بنو سراج کا بھی یہی خیال تھا اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بہادری، وفاداری اور عشق میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے"!

ڈان کارلو نے آگے بڑھ کر کہا " والد صاحب اور بلانکا نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ تم کسی اعلیٰ خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہو۔ بادشاہ سلامت عنقریب تیونس پر فوج کشی کرنے والے ہیں، اس وقت ہم دونوں کا جنگ میں سامنا ہوگا "

ابوحامد نے کوئی جواب نہ دیا، اس کی نظر بلانکا اور فرانسیسی امیرزادے پر تھی جو پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ امیرزادہ اپنی دوشیزہ کو الفت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن بلانکا کے جذبات عشق اس کی آنکھوں سے ہویدا تھے۔ جن کو نہ صرف لاٹریک بلکہ ڈان کارلو نے بھی دیکھ لیا۔ ابوحامد کچھ دیر کے بعد چلا گیا اور جب بھائی بہن تنہا رہ گئے تو ڈان کارلو نے پوچھا " بلانکا یہ کیا بات ہے کہ تم اس مور کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں؟"

بلانکا نے اپنے جذبات عشق کو پوشیدہ رکھنے کی مطلق پروا نہ کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ مجھ کو ابوحامد کے ساتھ محبت ہے اور اگر وہ عیسائی ہو جائے تو میں بجز اس کے کسی کو اپنا شوہر بنانا پسند نہ کروں گی۔

ڈان کارلو " کیا! خاندان سناآفی کی لڑکی ایک مور سے محبت کرے جنکو ہم نے اس ملک سے باہر نکال دیا ہے"۔ بلانکا بھی آخر اسی بھائی کی بہن تھی اس نے سختی سے کہا " ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کو تین سال ہو گئے۔ ہم دونوں اپنے اپنے مذاہب پر قائم ہیں اور یہی امر ہمارے ملاپ میں مزاحم ہے، یہ شخص شرافت مجسم ہے اور میں تا دم مرگ اس کی محبت میں ثابت قدم رہوں گی "

ڈان کارلو نے دیکھ لیا اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ دونوں شرافت کے پتلے اور اپنے مذہب کے پکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے بلانکا کو اس ورطۂ ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کی اور کہا " مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میرا خیال تھا کہ لاٹریک میرا بھائی بن جائیگا!"

بلانکا " تمہارا خیال غلط تھا، میں اس اجنبی سے محبت نہیں کرسکتی۔ تم اپنے ارادوں میں راسخ رہو اور میں اپنے عزم میں، ہاں اس کا اطمینان رکھو کہ میں ایک کافر کی بیوی کبھی بننا پسند نہ کروں گی "

کارلو " مگر اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ہماری نسل برباد ہو جائے گی "

بلانکا " نسل لڑکے سے چلتی ہے یا لڑکی سے؟ مگر اس کا افسوس ہی کیا ہے "

یہ دیکھ کر کہ بہن سے پیش جانا مشکل ہے ڈان کارلو ابوحامد کے پاس گیا اور نہایت جوشیلے الفاظ میں کہا " بہتر ہے کہ میری بہن سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ پھر ہم میں جنگ چھڑ جائے گی "

ابوحامد " کیا تم بلانکا کا پیغام لائے ہو؟"

کارلو " نہیں وہ تم سے اسی طرح محبت کرتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ بلانکا میرے فرانسیسی دوست کی زوجیت میں آجائے اور اگر تم راہ میں حائل نہ ہوتے تو اس امر میں کوئی شخص میرا مزاحم نہ ہوسکتا تھا "

یہ الفاظ سن کر ابوحامد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور لڑنے کے واسطے تیار ہو گیا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بلانکا اپنے وعدوں سے منحرف ہو کر فرانسیسی امیرزادے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس بات کا علم کہ اس کی معشوقہ باوفا ہے تقویت قلب کے واسطے کافی تھا اور وہ اس کے لئے کیا کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اس نے پہلے تو بلطائف الحیل اس جنگ کو ٹالنا چاہا۔ جس کی وجہ یہ نہ

تھی کہ وہ جرأت یا شہامت میں اپنے آپ کو ڈان کارلو سے کم سمجھتا تھا بلکہ وہ اپنی معشوقہ کے عزیز بھائی سے اُسی کے واسطے لڑنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن بدرجۂ مجبوری اس ناگزیر ڈوئل پر تیار ہوگیا اور دونوں شہر سے باہر جاکر مصروفِ پیکار ہوگئے۔

ڈان کارلو پورا مردِ میدان تھا لیکن اس کے مقابلہ میں ابوحامد کسی جنگ میں شریک نہ ہوا تھا۔ تاہم اس کی ذاتی شجاعت اور نسبی شہامت کافی حد تک ناتجربہ کاری کی بدل ہوگئی تھی۔ ایک طرف اگر احساسِ نسب باعثِ مجادلہ تھا تو دوسری جانب جذبات عشق۔ بہرحال دونوں اپنے ارادوں میں پختہ اور دھن کے پکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ڈان کارلو کو اپنے حریف کے مار ڈالنے میں باک نہ تھا۔ لیکن ابوحامد اس کی جان نہ لینا چاہتا تھا۔

مجادلہ کافی عرصہ تک رہا اور اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو ضرور کہہ اٹھتا کہ مقابلہ کی جوٹ ہے۔ دونوں کے گھوڑے زخمی ہوگئے۔ تلوار چلاتے چلاتے ہاتھ رہ گئے مگر غلبہ کسی کو حاصل نہ ہوا۔ پھر ڈان کارلو کا راہوار جواب دے گیا اور سوار پیادہ لڑنے لگے۔ اب بھی کوئی ہار ماننے کے واسطے تیار نہ تھا۔ لیکن جب حریف کا آلۂ حرب ابوحامد کی دمشقی تلوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تو گویا اس جنگ کا فیصلہ ہوگیا اور مغلوب شخص چلانے لگا "میں اب بھی تمہاری قوم کو لامذہب اور برا سمجھتا ہوں اس لئے تم مجھ کو جلد ہلاک کر دو"۔

مگر ابوحامد نے اپنی تلوار نیام میں کر لی اور کہا "میں صرف اس لئے جنگ کر رہا تھا کہ تم پر اپنی برتری کا اظہار کر کے ثابت کرسکوں کہ بلانکا میری بیوی بن سکتی ہے۔ ورنہ میرا ارادہ تم کو کاری زخم پہنچانے کا نہ تھا"۔

اس وقت شہر کی طرف سے گرد و غبار اٹھتا نظر آیا اور لاٹریک معہ بلانکا کے موقعِ جنگ پر پہنچ گیا۔ بلانکا کو شبہ ہوا تھا کہ دونوں آپس میں لڑ نہ بیٹھیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ بھائی کو غیر حاضر پاکر سیدھی میدانِ مجادلہ کی طرف چلی آئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر کارلو نے کہا "میں تو ہار گیا مگر لاٹریک تم غالباً اس عرب سے جیت جاسکو گے"۔ مگر فرانسیسی امیرزادے نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور اسپین کی دوشیزہ کا عزمِ راسخ دیکھنے کے بعد اس کو مورکے مقابلہ میں کامیابی کی بہت کم امید تھی۔

بلانکا نے ہر ممکن کوشش کی کہ تینوں میں اتفاق ہوجائے۔ لیکن کارلو بول اٹھا "میں ابوحامد سے نفرت کرتا ہوں" لاٹریک نے کہا "اور مجھے اس پر رشک آتا ہے"۔ لیکن ابوحامد کا خیال تھا کہ وہ باوجود اس کے کہ ڈان کارلو کی عزت کرتا اور لاٹریک پر رحم، ان سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کرسکتا۔

اس وقت سے بلانکا کی محبت سوگنی بڑھ گئی۔ بہادر اقوام کی عورتیں شوہر کی جرأت و شہامت پر ہمیشہ ناز کرتی ہیں۔ اور بلانکا کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا عاشق ڈان کارلو سے بھی زیادہ شجاع ہے۔ حالانکہ وہ تمام مغربی یورپ میں نام پیدا کر چکا تھا۔

(۵)

اس مجبوری کو ایک عرصہ گذر گیا۔ ابوحامد ہر سال آتا اور ناکام واپس جاتا۔ آخر ایک روز اس نے سوچا کہ لاڈ گرجا میں ...

بلانکا کے مسلمان ہونے کی دعا مانگوں۔ چنانچہ وہ ایک ایسی عمارت میں داخل ہؤا جو کسی زمانہ میں مسجد تھی، لیکن اب اہلِ مسیح کی عبادت گاہ کہلاتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ قربان گاہ کے سامنے ایک نائٹ جھکا ہؤا نہایت خلوص سے دعا مانگ رہا ہے۔ اس کی تلوار قریب ہی رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی عبادت میں اس قدر منہمک ہے کہ کوئی کھٹکا کوئی آواز اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کرسکتی۔ یہ نائٹ لاٹریک تھا۔ ابوحامد پر اس کی محویت کا بے حد اثر ہؤا۔ اور وہ بھی قربان گاہ کے سامنے جھکنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک عربی کتبہ پر پڑی جو در اصل قرآن مجید کی ایک آیت تھی۔ اس کے دیکھتے ہی اس میں مذہبی جوش پیدا ہوگیا اور وہ گرجا سے نکل بھاگا۔ لیکن آج کا دن اس کے واسطے مبارک نہ تھا۔ گرجا کے دروازے پر اس کو ایک نقاب پوش عورت ملی جو بجز بلانکا کے کوئی نہ تھی۔

ابوحامد نے اس کو روک کر پوچھا "کیا تم لاٹریک کو تلاش کرنے آئی ہو؟"

بلانکا نے جواب دیا "بھلا اس رشک و حسد سے فائدہ؟ اگر میری محبت سرد ہو جاتی تو میں بجائے دھوکا دینے کے صاف صاف تم سے کہہ دیتی۔ میں یہاں تمہارے واسطے دعا کرنے آئی ہوں۔ اول تو تمہیں مجھ سے محبت نہ کرنی چاہیئے تھی اور اگر تم نے اس کا دعوے کیا تھا تو عیسائی ہو جاتے، تمہاری وجہ سے ہمارا سارا خاندان رنج والم میں مُبتلا ہے۔ میرا بھائی تم سے متنفر ہے۔ والد اسی غم میں گھلے جاتے ہیں کہ میں شادی نہیں کرتی۔ اور خود میری تندرستی بھی خراب ہوگئی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ یہ محبت اور صدمات مجھ کو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنے دیں گے۔ کیونکہ مشعل کی آگ اس کو روشن ہی نہیں کرتی بلکہ جلا بھی ڈالتی ہے۔"

یہ الفاظ نہ تھے تیر و نشتر تھے جو ابوحامد کے دل میں پیوست ہوگئے۔ عشق و مذہب میں جنگ شروع ہوگئی اور بہت جلد عشق مذہب پر غالب آگیا، ابوحامد اپنی معشوقہ کا اس غم میں مرجانا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ عیسائی ہو جائیگا۔

(۶)

آج سب لوگ لاٹریک کے مہمان تھے اور دعوت کا سامان موروں کے محل میں کیا گیا تھا۔ دیواروں پر مسیحی فاتحین کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اور ان کے نیچے غرناطہ کے آخری فرمانروا کی تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ ابوحامد کا دل اس نظارے سے خون ہوگیا لیکن عشق میں بجز ذلت و رسوائی کے رکھا ہی کیا ہے؟

دعوت شروع ہوگئی۔ پہلے ڈان کارلو نے اپنی بہادری کے افسانے سنائے اور پھر لاٹریک نے ایک نظم گائی جس میں فرانس کے مناظر کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے بعد ابوحامد سے خواہش کی گئی کہ وہ بھی کچھ سنائے۔ مگر بیچارے مور کو اس ماحول میں بجز اپنی قوم کی بربادی اور تباہی کے کیا نظر آسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے غرناطہ کی تباہی کے متعلق ایک نوحہ گایا جس کو سن کر سب کے دل بھر آئے۔ پھر ڈان کارلو نے ایک نظم شروع کی جس میں اس کے جد امجد سڈ (مشہور اسپینی ہیرو) کی تعریف کی گئی تھی۔

ابوحامد بول اٹھا "اس شخص کو تم لوگ سردمیدان کہتے ہو اور ہم اسے ظالم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ اگر اس کی

بہادری فیاضی کے قدم بقدم ——"

ڈان کارلو نے تلخ لہجہ میں جواب دیا "اس کی شجاعت اور فیاضی دونوں ضرب المثل ہیں۔ میرے جدامجد کو صرف مورہی برا کہہ سکتے ہیں۔"

اس فقرے کو سن کر ابوحامد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا استعجاب انتہا کی حد کو پہنچ چکا تھا اور الفاظ کی تلخی اس کی دلی کاوش کا ثبوت دیتی تھی "تم سنار کو اپنا جد امجد قرار دیتے ہو؟"

"ہاں۔ اس کا خون ہماری رگوں میں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھ کو کافر موروں سے سخت نفرت ہے۔"

ابوحامد نے اپنی معشوقہ کی طرف دیکھ کر کہا "تم خاندان بیوار سے تعلق رکھتی ہو جس نے غرناطہ کی فتح کے بعد بنوسراج کے ایک معمر شخص کو اس کے باپ کی قبر کے پاس ہلاک کر دیا تھا! افسوس مجھے اس کا علم نہ تھا کہ اس خاندان نے سنا تانی کا نام اختیار کر لیا ہے۔ اور اس ناواقفیت نے مجھ کو ڈبو دیا۔"

کارلو نے فخریہ لہجہ میں کہا "جی ہاں۔ ہمارے دادا ہی نے بنوسراج کو قتل کیا تھا اور انہیں کو فرڈی نینڈ نے ڈیوک سنا تانی کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔"

ابوحامد کی گردن جھکی تھی۔ چہرہ کا رنگ کافور تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر اس نے اپنے دل کو قابو میں کیا اور بولا "معاف کیجئے میں جانتا ہوں کہ رونا کم ہمتی کی نشانی ہے اور آیندہ آپ کبھی میری آنکھوں کو پرنم نہ دیکھیں گے (بلانکا کی طرف خطاب کر کے) بلانکا، میری محبت باد سموم کی طرح ہے۔ اس روز لاٹریک کو سربسجود دیکھ کر اور تمہارے الفاظ سن کر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ عیسائی ہو جاؤں ——"

ان الفاظ کو سن کر غمزدہ دوشیزہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ ڈان کارلو استعجاب سے چونک پڑا اور فرانسیسی نائٹ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا کیونکہ اب اس کو دوشیزہ کے حصول کی مطلق امید نہ رہی۔ مور نے اس کے خیالات کو معلوم کر لیا اور ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو انتہائی کرب کا پتا دیتی تھی۔ بولا "نائٹ۔ امید کو ہاتھ سے نہ دو۔ اور بلانکا تم بنی سراج کے آخری چشم و چراغ کا ماتم کرو۔"

بنوسراج کا نام سن کر ہر طرف خاموشی ہو گئی۔ اور دلوں میں خوف، نفرت، الفت، استعجاب اور حسد کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ آخر بلانکا نے اس سکوت کو توڑا اور بولی "پاک مریم، تو نے میرے انتخاب کو لاجواب بنا دیا، واقعی میں صرف بہادروں کی اولاد سے محبت کر سکتی ہوں۔"

ابوحامد نے کہا "نازنین ملکہ میں تا دم مرگ تمہارا غلام رہوں گا مگر تم کو میری اصلی حالت کا پتا نہیں۔ میں نے ابھی خاندان بیوار کا ذکر کیا ہے جس نے غرناطہ میں بنوسراج کے ایک معمر شخص کو بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ یہ شخص میرا دادا تھا اور میں پہلی مرتبہ غرناطہ صرف اس غرض سے آیا تھا کہ بیوار کے کسی فرد سے اپنے دادا کا بدلہ لوں۔ لیکن میں کس خیال میں تھا اور تقدیر کو کیا منظور تھا! اس انکشاف نے دونوں

کے دلوں کو آلودہ کر دیا اور بلانکا نے بالکل ہی مُردہ آواز میں دریافت کیا "اور اب کیا ارادہ ہے؟"

ابوحامد "یہی کہ میں تمہارے مواعید کو واپس کر دوں، خود ہمیشہ کے لئے بادیہ گردی اختیار کر لوں اور آخر اپنی موت سے اس باہمی تنافر کی تلافی کروں۔ اگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں تمہارے دل سے میری تصویر مٹ جائے تو بہ فرانسیسی نائٹ ———"

مگر لاٹریک نے اس کو آگے بڑھنے نہ دیا اور مور سے بغلگیر ہو کر کہنے لگا "نہیں نہیں، تم یہیں رہو اور میں ڈان کارلوس سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنی بہن کو تمہاری مناکحت میں دیدے۔ اگر تم چلے بھی جاؤ تو میرے مُنہ سے بلانکا کی محبت کا ایک کلمہ بھی نہ نکلے گا۔"

ڈان کارلوس نے دونوں کے ایثار کی تعریف کی، لیکن اس کو یقین نہ تھا کہ ابوحامد دراصل بنو سراج کا آخری چشم و چراغ ہے۔ اور جب مور سردار نے اس کو اپنی انگوٹھی بطور نشانی کے دکھائی تو وہ بھی نرم پڑ گیا اور کہنے لگا "ابوحامد، بس عیسائی ہو جاؤ اور میں خود بلانکا کو تمہاری جیت میں دے دوں گا۔"

امتحان سخت تھا مگر نہ اس قدر کہ ابوحامد عزت کو محبت پر قربان کر دے "کیا مقتول کا پوتا قاتل کی پوتی سے شادی کر سکتا تھا؟" پھر بھی اس نے اس امر کا فیصلہ بلانکا کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔

ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اس امتحان میں بلانکا باوجود عورت ہونے کے نہایت کامیاب رہی۔ اس نے ایسی آواز میں جو مشکل سنی جاتی تھی کہا "جاؤ۔ اپنے وطن کو چلے جاؤ" اور غش کھا کر گر پڑی۔ ابوحامد نے اس فیصلہ کو پھانسی پانے والے مجرم کی طرح سنا اور اپنی تقدیر پر قانع ہو گیا۔

(۷)

دوسرے دن مور سردار جہاز میں سوار ہو کر افریقہ چلا گیا لیکن چونکہ وہاں اب اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا اس لئے وہ اس کارواں میں شامل ہو گیا جو ہر تیسرے سال مصر کو جاتا اور مصر میں مکہ معظمہ کے قافلہ سے مل جاتا ہے۔

بلانکا کچھ عرصہ تک صاحب فراش رہی مگر پھر تندرست ہو گئی۔ اس کا معمول تھا کہ ہر سال موسم بہار کی آمد پر سمندر کے کنارے جاتی، کچھ دور افریقہ کی طرف انتظار کی نظریں ڈالتی اور جب ابوحامد کے آنے کا زمانہ گذر جاتا تو غرناطہ واپس آجاتی۔ وہ نہ کسی بات کی شکایت کرتی تھی نہ کبھی ابوحامد کا ذکر اس کے لبوں تک آتا۔ لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ بلانکا اپنے حال میں خوش ہے۔ اس کا باپ بیٹی کے غم میں مر گیا اور ڈان کارلوس لڑائی میں مارا گیا لیکن ابوحامد کا انجام کسی کو معلوم نہ ہوا۔

ایک مرتبہ تیونس سے کارتھیج کے کھنڈروں کو جاتے ہوئے مجھ کو بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کا مقبرہ دکھایا گیا جس پر کھجور کا ایک گھنا درخت سایہ کئے ہوئے تھا۔ قبر میں بجز اس کے کوئی خاص بات نہ تھی کہ بیچ میں ایک پیالہ بنا ہوا تھا جس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور موسم گرما میں پرند اس سے پیاس بجھاتے ہیں۔"

احمد الدین مارہروی

(مشہور فرانسیسی فسانہ نگار شاتو بریاں کے قلم سے)

ایک خواب

(سید صاحب کا اصل مضمون جو انہوں نے مجھے عنایت فرمایا انگریزی میں ہے میں نے ناظرین ہمایوں کیلئے اس کا ترجمہ کر دیا ہے)

میرے لئے طلوعِ آفتاب کی سرزمین ایشیا کی اٹھتی ہوئی امیدوں کی سرزمین ہے اس کی پھول بھری وادیوں و زمردیں جزیروں کے درمیان میری روح وسعت پکڑتی ہے یہاں تک کہ گذشتہ موجودہ اور آئندہ زمانے سب ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں میری روح اُمنڈ کر وہ تاریکی کے پار کا منظر دیکھ رہی ہے جو اس وقت ایشیا پر پڑا ہوا ہے بمنظر جس کا حُسن ہر ایسے نظارے سے بدرجہا زیادہ شاندار ہے۔ جو چشمِ انسانی نے کبھی دیکھا ہو بمنظر کہ چاندنی راتوں میں مقدس فوجی یا باشان و شوکت سے بھی زیادہ خوشنما اور تحیر خیز ہے۔

ایک بار جاپان کے ایک جنگل میں گذری ہوئی صدیوں کی یاد سے معمور میرے کانوں میں اکابرِ ماضی کی روحوں کی آوازیں تیرتی ہوئی آئیں آوازیں جو یوں گویا ہوئیں تیرا آنا سر آنکھوں پر اے ہمارے وطن میں آنے والے اجنبی اپنی روح کو صبر سے معمور کر لے ہمیں اُن عذابوں کا علم ہے جو تو سہہ رہا ہے کہ ہم بھی کچھ ایسے ہی عذاب سہہ چکے ہیں۔ تو یہ فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا سب سے قیمتی ورثہ ہے اور یاد رکھ کہ صرف صبر اور دیانت داری کے کام سے تیری قوم وہ بات پیدا کر سکتی ہے جس کی اُسے تمنا ہے۔ تیرے ہی ہم وطن بُدھ نے ہمیں تمام دنیاوی مصائب کا علاج بتایا۔ یہی جو آج ہم تجھے بتا رہے ہیں۔ اور بتا رہے اس لئے ہیں کہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ہم وطن اُسے اپنے دل سے قطعاً بھلا چکے ہیں۔

آوازیں خاموش ہو گئیں اور میں نے آنسو بھری آنکھوں سے مغرب کی طرف اپنے ملک کی سمت دیکھا وہاں جہاں سورج چمکتے ہوئے سونے کے کہر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا!

راس مسعود

رباعی

وا خوابِ عدم سے چشمِ مدہوش ہوئی
تاریکیٔ شب ہی سے ہم آغوش ہوئی

جب ظلمتِ غم میں کچھ سجھائی نہ دیا
پھر پردۂ نیستی میں روپوش ہوئی

اثر صہبائی



خاکہ اڑانے والے کا خاکہ

CALCUTTA ART PG. WORKS, LAHORE.



بات کچھ بھی نہیں اور شور مچا رکھا ھے

مہاوٹوں کی ایک رات

گڑا! گڑا! گڑا! - الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا - کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گڑا ڑڑڑ!

اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوتے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اٹھیں - ہوا کے ایک تیز جھونکے نے سلری عمارت کو ہلا ڈالا - سُوسُوسُوووو! کیا سردی ہے! یخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے -

ایک چھوٹا سا مکان ۴ × ۲ سے ۴ × ۲ فٹ یا اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اس کے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا - کوئی فرش تک نہیں - کچھ پھٹے پرانے بوریے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور سیل سے چپ چپ کر رہے ہیں - کونوں میں بنچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے - ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق، اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے استعمال سے کالے ہوگئے ہیں، اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں - ان میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے - کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی! گھستے گھستے پیندا جواب دینے کے قریب ہے -

چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں - اور اس پر بارش! یا اللہ کیا مہاوٹیں اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؟ اب تو روک دو! کہاں جاؤں، کیا کروں؟ اس سے تو موت ہی آجائے - تو نے غریب ہی کیوں بنایا؟ یا اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے - یا یہ حالت ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں - چھت چھلنی کی طرح ٹپکی جاتی ہے - بلی کے بچوں کی طرح سب کونے جھانک لئے - لیکن چین کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، بچوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے - نہ معلوم سو بھی کیسے گئے ہیں - سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے! اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر! یاد ہے زمانہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے - آہ وہ میرا کمرہ! ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور سینبل کے تکیئے - کیا نرم نرم توشک تھی کہ لیٹے سے نیند آجائے - اور لحاف؟ آہ! ریشمین چھینٹ کا، اور اس پر سچے ٹھپے کی گوٹ - انائیں، مامائیں کھڑی ہیں - بیوی سر دباؤں؟ بیوی پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی ہے، کوئی ہاتھ مل رہی ہے - گدگدا گدگدا بستر، اوپر سے یہ سب چونچلے، نیند ہے کہ کہکشانی کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے ... سبز شیشوں پر نیلے اور سُرخ اور نارنجی عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سابوت ڈلے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں ... دستر خوان پر چاندی کی طشتریاں! ایک جھلملاہٹ، قورما، پلاؤ، بریانی، متنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے .... ایک باغ درختوں سے گھرا ہوا - جن کی کاہی پتیوں پر تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے - واہ! واہ! کیا کیا خوش نما پھل ہیں - آم مُنہ لال کلیجہ بال ماں کا بُغد وبچہ - سیب کیسے خوبصورت ہیں - اندھیرے اندھیرے درختوں میں سُرخ اور گلابی اور بسنتی لٹکے ہوئے ہیں، ڈالیوں سمیٹ جھکے ہوتے ہیں - ارے

آہ! کاش کہ وہ ہوتے ـ وہ، وہ، وہ ـ رات کو آئے کچھ نہ کچھ لئے چلے آتے ہیں ـ کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے ـ وہی نگوڑا پڑی کا ہوگا ـ تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی پسند ہے ـ لو! پھر چیخنے لگیں، دیکھا تو ہوتا آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ، کیا دن تھے ـ اب تو ایک خواب ہیں، پھر چاندنی راتوں میں پھولوالوں کی سیر ـ آہ! وہ سیجیں ـ کیا مہک تھی، دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں ـ اے کاش وہ ہوتے ـ کیا زندگی تھی! ہم دو تھے لیکن ایک تھے ـ دو جڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اُگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز، تھے کہ اُگ رہے تھے ـ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ایک ہی سوت کے پانی سے جیتے تھے ـ آہ! کاش کہ وہ ہوتے ـ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے مسل ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے ـ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی ـــ ٹنڈا ـ اکیلا، مرجھایا ہوا، بچھڑی کی جان ابھی تک ٹھوکریں کھانے کو زندہ ہے اگر وہ ہوتے . . . .

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی ـ

آہ! زمانہ کسی کے بہلاوے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلاوے میں نہیں آتا! اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں اس سے تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی ـ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ ـ امید بھی کیا جھینتے جھلاتی ہے ـ کبھی پاس آتی ہے ـ کبھی دور جاتی ہے ـ لیکن امید کا ہے کی؟ اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے ـ وہ سوت کی رسی کا جھولا، چار ہم جولیاں، ہنڈولے کے ایک ایک کنارے پر دو دو ـ اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگھور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں ـ جھولا کن نے ڈالو رے اموریاں ـ واہ! انوری اور کشور بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو میں اور کبری کتنا بڑھاتے ہیں ـ چکر نہ آجائیں جب ہی کہنا . . . پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور . .

. . . آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے ـ باغ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر ـ نہ وہ بیر کی ڈالی! کہاں میرا آشیانہ پھر ایک تپتی ہوئی چٹان، بنجر اور سخت، اور اس کے پہلو سے زندگی لیکن پھر ایک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، من وسلوے کے مزے، دودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور ان میں کھیلنا ـ پھر دن عید، رات شب برات ـ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ ـــ ابلیس اور گیہوں کا ڈر نیستی ـ تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کاش کہ وہ ہوتے ـــ اے آدم! ـــ نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ـ پھر وہی خوشی اور خرمی ـ ایک قیامت بپا ہے نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے ـ میں تو اسی کے پاس جاؤں گی، امید تو ہے ـ آہ! یہ تنہائی ـ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں ـ نہ تسلی نہ دلاسا ـ تنہائی، تنہائی ـ رات اندھیری اور بھیانک رات ارے لا دو کوئی جنگل مجھے . . . . جنگل . . . . مجھے . . . . بازا . . . . . . یا ـ زار ـ

مُوا ـ جھ . . . . ـ

رات ـ

احمد علی



اُنگلیاں پانچ اِس پاؤں کی بھی
اُنگلیاں پانچ اُس پاؤں کی بھی
جب میں اندر آتا ہوں
جب میں باہر جاتا ہوں
یہ بھی اندر آتی ہیں!
یہ بھی باہر جاتی ہیں!

آنکھ یہ دائیں جانب کی
آنکھ یہ بائیں جانب کی
جب میں رونے لگتا ہوں
جب میں سونے لگتا ہوں
یہ بھی رونے لگتی ہیں!
یہ بھی سونے لگتی ہیں!

سر یہ میرے کندھوں پر
لیٹنے جب میں لگتا ہوں
یہ بھی لیٹنے آتا ہے
لیکن جب میں اُٹھتا ہوں
پہلے یہ اُٹھ جاتا ہے!!

ل ب

(ماخوذ از انگریزی)

محفلِ ادب

روسی گیت

جُدائی

جب جوانی کا سورج نکل رہا تھا
مجھے دل و جان سے پیاری ایک لڑکی سے محبت تھی
اُس کی آنکھوں میں سُورج کی چمک تھی
اُس کے چہرے پر محبت کی آگ جل رہی تھی
اُس کے سامنے تیری کیا ہستی تھی، بہار کی صبح
یا تیری، ہرے بھرے شاہ بلوط کے درخت
یا تیری، ستپ کی گھاس، سبز مخمل کی چادر،
یا تیری اے جھٹ پٹے کے وقت، یا تیری اے چاندنی بھری رات!
تم پر تو نظر تب ہی پڑتی ہے جب وہ نہ ہو،
جب تم کو کوئی اپنے درد اور اشتیاق کا حال سنائے!
وہ سامنے ہو۔ تو تم دکھائی بھی نہیں دیتے . . .
وہ ساتھ ہو تو جاڑا بہار ہو جاتا ہے، اندھیری رات اُجالا دن!
وہ گھڑی کیسے بھول جاؤں جب میں نے آخری بار
اُس سے کہا، خدا حافظ میری پیاری!
شاید خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہم جُدا ہو جائیں،
مگر پھر کبھی ملیں گے . . . "
اِک دم اُس کے چہرے پر آگ سی بھڑک اُٹھی،
پھر وہ برف کی طرح سفید پڑ گیا ـــ
تڑپ کر دیوانوں کی طرح،
وہ میرے سینے سے لپٹ گئی ـــ
"ابھی نہ جا، ذرا ٹھیر، مہلت دے
کہ دل کو سنبھال لوں، سورما کے کندھے پر
رو کر اپنے رنج کو بہا دوں . . . "
وہ سسکیاں لینے لگی، بات زبان پر آکر رہ گئی . . .

پھیری والے

نکراسوف نے اپنی نظم "پھیری والوں" میں روسی دیہاتن کی ذہنیت کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک لڑکی کا دوست کوئی رنگیلا پھیری والا، ایک خاص تہوار کے دن تک واپس آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا ہے۔ لڑکی
اکثر اکیلی پڑی ہوتی
ساری رات جاگ کر گذارتی تھی
اور جب اونچے گیہوں کے کھیت کاٹتی
تو آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہتے تھے
وہ رنج اور مایوسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیتی
اگر رنج کرنے کی اُسے مہلت ملتی،
لیکن زمانہ کھیتی کاٹنے کا تھا، جلدی جلدی کام کرنے کا ـــ
بیسیوں کام ختم کرنے تھے . . .
درانتی کے نیچے وہ گھاس کے ڈھیر لگا دیتی،
اور گیہوں کے انبار،

صبح سویرے کے وقت اپنی پوری طاقت لگا کر
اناج کھندلتی
شام کو دیر تک شبنم سے تر چراگاہوں میں
کٹا ہوا سن پھیلاتی
سن پھیلاتی، اور ایک خیال
کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا :
"کیا کوئی دوسری موہنی
ٹونا کر کے اس کے من کو لبھا رہی ہے ؟
کیا وہ بیوفائی کر رہا ہے ؟ پردیس میں
دوسری عورتوں کے پیچھے لگا ہے ؟"
یہ سوچ کر بیچاری کا دل ٹوٹ جاتا . . .
"ارے تو مجھ سے شادی کر، مجھ سے،
میں تجھے یا تیرے باپ کو
کبھی خفا نہ ہونے دوں گی،
تیری ماں کی گالیاں
چپ چاپ سن لوں گی —
میں نہ شریف زادی ہوں نہ سوداگر کی بیٹی،
میری طبیعت مسکین ہے
تیری بیوی بنی تو ہمیشہ
خاموش رہوں گی، محنت کروں گی
تجھے کام کرنے کی زحمت نہ ہو گی
میرے ہاتھ پاؤں کا اور کوئی مصرف نہیں
میں اپنے پیارے کے لئے
خوشی سے کھیت بھی جوتا کروں گی
تو اپنی عنتی بیوی کے بل پر
خوب مزے سے رہنا
بازاروں کی سیر کرنا،
مست ہونا، گیت گانا !
اگر تو اناج کا سودا کر کے مست واپس آئے
تو تجھے کھلا پلا کر پلنگ پر لٹا دوں گی !
"سو میرے پیارے، سو میرے موہن !"
اس کے سوا اور کچھ نہ کہوں گی،
قسم ہے خدا کی ذرا خفا نہ ہوں گی . . .
تیرے گھوڑے کو سواری کے لئے سنواروں گی،
تیرے پیروں پر گر کر کہوں گی :
"میرے دوست، مجھے پیار کرتا جا"

"اردو"

مڈل سکول کی شرارتیں

مندرجہ بالا عنوان سے "نیرنگ خیال" میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے ایک مزاحیہ مضمون لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے خاص خاص ماسٹروں کا ذکر کیا ہے اور طالب علموں کی شرارتیں درج کی ہیں۔ ایک طالب علم جو اپنے اثر درعب یا بالفاظ دیگر شرارت کے لحاظ سے طالب علموں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ ہماری توجہ کو خاص طور پر اپنی طرف منعطف کرتے ہیں۔

اِن کے امتحان کا ایک واقعہ ایسا ہے کہ جب کبھی خیال آتا ہے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ مڈل کا امتحان ہے تاریخ کا پرچہ ہے۔ یہ نہایت اطمینان سے بیٹھے مولوی ذاکر حسین کا خلاصۂ تاریخ ہند سامنے رکھے نقل کر رہے ہیں۔ ہیڈ بڑے مولوی

صاحب اس حصّہ کے گارڈ ہیں انہوں نے دیکھا کہ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے! امتحان اور یہ دیدہ دلیری۔ بڑے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ جو گفتگو ان میں ہوئی وہ لفظ بلفظ لکھتا ہوں۔ پڑھنے میں جب مزا آئے گا کہ جہاں "تالی" لکھوں وہاں مولوی صاحب کی طرح آپ بھی پینترا بدل کر تالی بجائیں اور ایک ہاتھ سامنے اور دوسرا پیچھے لے جائیں۔ یہیں نہیں جہاں کہیں مولوی صاحب کی گفتگو آئے وہاں اسی طرح کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے مولوی صاحب طرفہ معجون تھے یا نہیں! اچھا اب دونوں میں یوں گفتگو شروع ہوئی:۔

مولوی صاحب۔ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے (تالی)

یہ۔ کچھ نہیں نقل ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب: نکال دئے جاؤ گے (تالی)

یہ۔ ہم کو کوئی نہیں نکال سکتا۔

مولوی صاحب۔ نہیں نکال سکتا (تالی) ہم نکال سکتے ہیں (تالی) امتحان ہے (تالی) کوئی مذاق ہے (تالی)

یہ۔ جائیے جائیے اپنا کام کیجئے۔ ہمارے نقل کرنے میں ہرج ہوتا ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ پرچہ پڑا ہے۔

مولوی صاحب چلو (تالی) اٹھو (تالی) صاحب کے پاس چلو (تالی)

یہ۔ چلیئے ہم بھی دیکھیں آپ کے صاحب ہمارا کیا کر لیتے ہیں! الغرض یہ اُٹھے کتاب ہاتھ میں لی آگے آگے مولوی صاحب اور پیچھے پیچھے یہ۔ دوسرے کمرے میں پہنچے۔ صاحب کچھ لکھوا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے جاتے ہی تالی بجائی انہوں نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔

مولوی صاحب۔ غضب ہے (تالی) نقل ہوتی ہے (تالی) بڑے گستاخ ہو گئے ہیں (تالی) ہم سے نہیں ڈرتے (تالی) آپ سے بھی نہیں ڈرتے (تالی) کتاب کھولے بیٹھے ہیں (تالی) نقل کر رہے ہیں (تالی) کہتے ہیں (تالی) صاحب ہمارا کیا کر لیں گے (تالی) بڑی مشکل سے لایا ہوں (تالی) سخت سزا دی جائے (تالی)۔

صاحب نے اُن کی طرف دیکھا انہوں نے کہا:۔

"جناب یہ مولوی صاحب میرے دشمن ہیں۔ عرصہ سے پہلے ان کے اور ہمارے خاندان میں دشمنی چلی آ رہی ہے۔ زبردستی پرچہ لکھتے لکھتے مجھ کو یہاں گھسیٹ لائے کہ چلو میں صاحب سے کہہ کر تم کو نکلوا دیتا ہوں۔ خواہ مخواہ کا الزام ہے آپ میری تلاشی لے لیں کوئی میں دیوانہ تھا جو اس طرح کتاب سامنے رکھ کر نقل کرتا۔ نقل کرتے ہیں تو چھپ چھپا کر نقل کرتے ہیں۔ نہ اس طرح کہ کتاب سامنے کھولے بیٹھے ہیں اور نقل کر رہے ہیں۔"

صاحب کو بھی یہ بات خلاف عقل معلوم ہوئی۔ ان کی خوب اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ کتاب تو کتاب ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہ نکلا۔ آخر صاحب نے بیچارے مولوی صاحب کو بہت ڈانٹا کہ آپ فضول امیدواروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ آیندہ ایسا کیا تو کرسی سے نکال دوں گا۔ بہرحال مولوی صاحب شرمندہ شکل وہاں سے واپس آئے آگے آگے مولوی صاحب اور پیچھے پیچھے یہ۔ مولوی صاحب پریشان تھے کہ یا اللہ آتے وقت کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے آتے کہاں غائب ہو گئی۔ آخر نہ رہا گیا اور خود اُن سے پوچھا۔

مولوی صاحب "کتاب کہاں ہے (تالی) آتے وقت تمہارے ہاتھ میں تھی (تالی) راستہ میں کہاں غائب کر دی (تالی)"

یہ۔ کچھ نہیں راستہ میں ایک ایک صفحہ کر کے کھا گیا۔ یہ سننا تھا کہ مولوی صاحب نے وہیں سے دے تالی پہ تالی بجانی شروع کی۔

مولوی صاحب۔ غضب ہے (تالی)، کھا گیا (تالی)، ساری کتاب کھا گیا (تالی)، اُستاد کو جھوٹا بنا دیا (تالی)، نالائق ہے (تالی) شیطان ہے (تالی)، صاحب نے جو تالیوں کی آواز سُنی تو یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا معاملہ ہے حکم دے دیا کہ مولوی صاحب کو کمرے سے باہر کر دیا جائے خیر بچارے نکال دیئے گئے۔ ہمیشہ اس واقعہ کو بیان کر کے بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔

"نیرنگِ خیال"

بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ — عشق نہیں ہے آگ ہی آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

حسن کے کیا گن گاتا ہے — حسن تباہی لاتا ہے
حسن گلے کٹواتا ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن کے ارماں ٹھیک نہیں — جی کا نقصاں ٹھیک نہیں
ٹھیک نہیں ہاں ٹھیک نہیں — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن پہ جی کیوں کھوتا ہے — تخمِ غم کیوں بوتا ہے
حسن کسی کا ہوتا ہے؟ — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن کا دم کیوں بھرتا ہے — خونِ دل کیوں کرتا ہے
جیتے جی کیوں مرتا ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن پہ ناحق مائل ہے — یہ تو دامِ ہر دل ہے
پھر چھٹکارا مشکل ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن کی ناحق چاہت ہے — حسن نہیں ہے آفت ہے
فتنۂ روزِ قیامت ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن سے دھوکا کھائے گا — رنج و اذیت پائے گا
دیکھ بہت پچھتائے گا — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن کو پہلے زر دے گا — بعد ازاں کل گھر دے گا
آخر آخر سر دے گا — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

عالمِ روئے حسن نہ دیکھ — جلوۂ موئے حسن نہ دیکھ
بھول کے سوئے حسن نہ دیکھ — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسنِ بتاں سے بات نہ کر — دشمنِ جاں سے بات نہ کر
خصمِ جہاں سے بات نہ کر — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

دل کو لگا کر کیا لے گا — جان کھپا کر کیا لے گا
زیست گنوا کر کیا لے گا — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

لعلِ جادو فن کو نہ چاہ — جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ
دشمنِ جاں! دشمن کو نہ چاہ — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

چشم نہیں ہے، ڈائن ہے — زلف نہیں ہے ناگن ہے
عشوہ نہیں ہے رہزن ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

اہلِ ادا سے بچ کر چل — چشمِ قضا سے بچ کر چل
راہِ خطا سے بچ کر چل — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

حسن کی چاہت پر بھی نہ جا — چشمِ عنایت پر بھی نہ جا
لطفِ نہایت پر بھی نہ جا — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

اس کی ملاحت پر بھی نہ ریجھ — اس کی صباحت پر بھی نہ ریجھ
ناز و نزاکت پر بھی نہ ریجھ — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

ہجر کا غم بھی قاتل ہے — وصل کا سم بھی قاتل ہے
کم سے کم بھی قاتل ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

شوقِ وفا بھی مہلک ہے — ذوقِ جفا بھی مہلک ہے
کم بھی سوا بھی مہلک ہے — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

جتنے حبیب کہلاتے ہیں — دشمنِ دیں کہلاتے ہیں
دوست نہیں کہلاتے ہیں — بھاگ بلائے حسن سی بھاگ

دِل کو وفا کا اِذن نہ دے　ذوقِ جفا کا اِذن نہ دے
ایسی خطا کا اِذن نہ دے　بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ
دولتِ دین و دِل نہ گنوا　بے جا، لاحاصِل نہ گنوا
ہوش میں آ۔ غافل! نہ گنوا　بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

حُسن کا ہو کر کیا لے گا　سر سے پاتک کھائے گا
بھاگ، نہیں تو آئے گا　بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ
آزاد، اپنی جان بچا　دِین بچا، ایمان بچا
ناداں! کہنا مان، بچا　بھاگ بلائے حُسن سی بھاگ

"مکتبہ"

دربارِ اموی میں ایک فاطمی لڑکا

حضرتِ عمر ابن عبدالعزیز کو جب خلافت ملی تو لوگ دُور دُور سے مبارک باد دینے کے لئے دربارِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ دربار اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم تھا۔ امیرالمومنین تختِ خلافت پر متمکن تھے۔ اُمرا صف درصف اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق مُرصّع کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف قبیلوں کے معتمر سردار یکے بعد دیگرے مبارکباد عرض کرنے کے لئے دربار میں حاضر ہو رہے ہے کہ ایک بے ریش وبروت نوعمر حجازی لڑکا اپنے قبیلہ کی طرف سے مبارکباد عرض کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خلیفہ نے کہا اے لڑکے! کسی اپنے سے بڑی عمر والے سردار کو گفتگو کے لئے پیش کر۔

لڑکے نے جواب دیا۔ اے امیرالمومنین جب خدا اپنے بندے کو اُس کا یاد کرنے والا دِل اور بولنے والی زبان عطا کر دے تو وہ گفتگو کا مستحق ہے، اور اے امیرالمومنین اگر فضیلت عمر کے لحاظ سے ہوتی تو اس وقت اُمت میں جو آپ سے بڑی عمر والے ہیں وہ تخت پر بیٹھے ہوتے۔

امیرالمومنین لڑکے کی معقول گفتگو سے مرعُوب ہو گئے اور اُنھوں نے کہا اے لڑکے تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

لڑکے نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ حضور والا ہم مبارک باد عرض کرنے آئے ہیں۔ خُدا نے آپ جیسا عادل خلیفہ مقرر کر کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

امیرالمومنین نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو پُونچھتے ہوئے کہا۔ اے لڑکے مُجھے کُچھ نصیحت کر۔

لڑکے نے جرأت کے ساتھ جواب دیا۔ بہت سے ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو خُدا کے حلم پر مغرور ہو گئے اور نہ سمجھے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ خوشامدی مصاحبوں نے اُن کو رعایا کے حالات سے غافل کر کے نفس پروری میں پھنسا دیا۔ بے شک ایسے لوگ جلتی آگ کا ایندھن ہیں۔ اے امیرالمومنین ہماری دُعا ہے کہ آپ ایسے لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ اور آپ کا حشر اُمت کے نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز لڑکے کی فصاحت، حکمت اور جرأت سے بہت متعجب ہوئے۔ آپ نے اُس کی عُمر اور حسب نسب پوچھا تو معلوم ہُوا کہ وہ خاندانِ نبوت کا ایک گُلِ نودمیدہ ہے اور اُس نے ابھی اپنی عمر کی محض دس بہاریں دیکھی ہیں۔

"ادبی دنیا"

مطبوعات

پرانا خواب اور دو افسانے۔ سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کی یہ دلچسپ کتاب ایک ڈرامے اور دو افسانوں پر مشتمل ہے سید صاحب کو ترکی زبان اور ترکی ادب سے جو گہرا لگاؤ ہے یہ کتاب بھی اس کی شاہد ہے۔

پرانا خواب (ڈراما)، آسیبِ الفت (افسانہ) مطلوب حسیناں (افسانہ) تینوں ترکی زبان کے ترجمے ہیں، لیکن یہ مسلم ہے کہ سید صاحب کا ترجمہ تصنیف کا ہم پایہ ہوتا ہے اور جب اِن کا قلم ترکی خیالات کو اردو قالب میں ڈھالتا ہے تو ہماری زبان میں ایک ایسا لطیف اور شگفتہ اندازِ تحریر ایجاد کرتا ہے جو بلاشبہ فقید النظیر ہے۔ ڈراما اور افسانے یکساں نہایت دلچسپ ہیں، حجم تقریباً سوا تین سو صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت عہ مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ سے طلب فرمایئے۔

منتخباتِ ہندی کلام۔ اردو ہندی کے ملاپ کی کوششوں میں غالباً یہ سب سے موثر اور بہترین طریقہ ہے کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسری کے ادبی محاسن سے روشناس کیا جائے۔ اس کا بہترین طریقہ ترجمہ وغیرہ ہے۔ تذکرۂ صدر کتاب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی کی تالیف ہے اس میں کئی سو ہندی دوہے اور اقوال وغیرہ نہایت محنت سے جمع کئے گئے ہیں۔ ہندی سے ناواقف اصحاب کے لئے اردو ترجمہ بھی ساتھ دیا گیا ہے کتاب دیدہ زیب اور مجلد ہے قیمت ۸؎ حیدرآباد بک ڈپو، چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

دہلی (بارھویں صدی میں) یہ دلچسپ تذکرہ سید مجتبیٰ حسین صاحب نے شائع کیا ہے اور نواب ذوالقدر درگاہ قلیخاں سالار جنگ مرحوم کی تالیف ہے۔ دہلی آج کیسی ہے اور آج سے دو صدی قبل کیسی تھی؟ غزنوی اور غوری تہذیب جو ہندوستان میں آئی اس نے آخر کیا شکل اختیار کر لی تھی؟ اس کی صحیح ترین تاریخ دیکھنی ہو تو یہ کتاب ملاحظہ فرمایئے یہ اس عہد کی چشم دید معاشرتی و تمدنی تصویر ہے اس میں تمام دلکش تاریخی مشاہدات ادبی معلومات، حال و قال کی مجلسیں، عیش عشرت کی محفلیں، احباب کی جلوت و خلوت میں بزم آرائیاں، مشاعرے، میلے، اعراس، ہمعصر مشائخ غرضکہ ہر موضوع کے متعلق دلچسپ حالات لکھے گئے ہیں۔ بلاک کی نو تصاویر بھی شامل کتاب ہیں کاغذ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے قیمت مجلد ۸؎ غیر مجلد ہے۔ مہتمم صاحب خزینۂ یوسفیہ، ڈیوڑھی نواب مستقیم الدولہ مرحوم چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے۔

سید الانبیا۔ یہ کتاب کارلائل کے اُن مشہور لکچروں میں سے ایک کا ترجمہ ہے جو اس نے "اکابر اور اکابر پرستی" کے زیرِ عنوان دیئے تھے۔ کارلائل کی تصنیف پر رائے زنی کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ترجمہ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ نہایت صاف اور سلیس ہے۔ مترجم نے جگہ جگہ ضروری حواشی درج کر کے کتاب کو اور مفید بنا دیا ہے حجم ۸۰ صفحات کاغذ چھپائی وغیرہ خوب ہے۔ قیمت مجلد ۱؎ غیر مجلد ۱۲ محمد اعظم خاں صاحب۔ بخیر ولا۔ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے۔

تصاویر

سرورق:- سرورق کی خوبصورت تصویر کے انتخاب میں ہمیں عزیزہ نسیم جہاں کے حسن مذاق کی داد دینی ہے اور ترتیب و تزئین الفاظ میں اپنے نقاش مشیر اعجاز (رساندوی) صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے۔

علامۂ فقید آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم و مغفور - دسویں سالگرہ کے موقع پر ہمایوں ایک دفعہ پھر اس بزرگ ہستی کی تصویر شائع کر رہا ہے جس کی یادگار ہونے کا اسے فخر حاصل ہے اور جس کے بلند معیار ادب و اخلاق کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانا اس کی عمر بھر کی کوششوں کا ماحصل ہے۔

ادارۂ ہمایوں - اس وقت تک اہل ہمایوں رسالے میں اپنی تصاویر شائع کرنے سے احتراز کرتے رہے ہیں لیکن دسویں سالگرہ کے موقع پر بعض احباب و معاونین ہمایوں کے حسب خواہش "ہمایوں" کے مدیران سابق و حال کا یہ گروپ شائع کیا جاتا ہے۔

التجائے محبت - یہ تصویر سر جوزف نوئل پیٹن (۱۸۲۱-۱۹۰۱) کا کارنامہ ہے۔ یہ باکمال مصور بچپن ہی میں جب ابھی اس نے لکھنا پڑھنا بھی نہ سیکھا تھا، تصویریں بنانے لگا۔ تصویر کا رنگ ڈھنگ مصور کے حسن ذوق کا شاہد ہے۔ شام کا وقت ہے، سر پر ستارۂ زہرہ جسے عشاق مقدس سمجھتے ہیں چمک رہا ہے اور تمام کی تمام تصویر ایک کیف آرزو میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میڈیا - اس غیر فانی تصویر کے متعلق، تصویر کے بالمقابل میڈیا کے زیر عنوان مفصل حالات درج کئے گئے ہیں۔

جینیوا کی جھیل پر غروب آفتاب کا منظر اس دلکش تصویر میں آئینہ ہے۔ جینیوا کی جھیل کے کنارے رہنے والے فرانسیسیوں اور سوئس لوگوں کی زبان فرانسیسی ہے اس لئے اس تصویر کا عنوان فرانسیسی زبان میں ہے۔ جینیوا کی جھیل کا دوسرا نام لیمان جو یہاں مرقوم ہے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے - یہ پاکیزہ تصویر مصور کے حسرت نگار موقلم کی کامیابی کی آپ شاہد ہے۔

آئی خزاں چل دی بہار - مصور نے سیاہ موٹے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تصویر کو موسم سرما یا خزاں کا مظہر بنایا ہے۔ بہار باریک سفید لباس میں ہے۔ سردی کا ہولناک مس بہار کی گرمی پر اوس ڈال رہا ہے۔ بہار کے ہاتھ سے گلدستہ چھوٹ کر گر گیا ہے اور پھول زمین پر بکھر رہے ہیں۔ خزاں کی درشتی کی تاب نہ لا کر بہار رخصت ہو رہی ہے اور صرصر کے تیز جھونکے برگ و بار کو افسردگی کا پیغام دے رہے ہیں۔

نپولین کا خواب - نپولین کی ساری زندگی اس فرانسیسی تصویر میں منعکس ہے۔ تصویر کا فرانسیسی نام ہے "آسینت ایلین ان ریو" (سینٹ ہیلینا میں: ایک خواب)

بات کچھ بھی نہیں اور شور مچا رکھا ہے - یہ ہسپانوی مصور جمن دابیز (۱۸۲۹ء) کی تصویر ہے۔ بچے کے علاوہ دوسرے سامان سے بھی تصویر کا ماحول گھریلو معلوم ہو رہا ہے۔ ایک بکری نے خاموشی سے اپنا سر دروازہ میں داخل کیا ہے اور بچہ طفلانہ خوف سے چیخنے لگا ہے۔ کیا زندگی کے کثیر خوف طفلانہ ہی نہیں ہیں؟

خاکا اڑانے والے کا خاکا - یہ جرمن مصور آگسٹ بیڈن (۱۸۲۷ء) کی تصویر ہے۔ ایک کارٹون بنانے والا کارٹون بنا رہا ہے۔ اس کے مداح بھی اس کے ساتھ ہیں کہ اس کے بدقسمت شکار کی طرف بہ انداز تمسخر نگاہیں ڈال رہے ہیں اور وہ غریب اس سے بالکل بے خبر ہے کہ اس کے خال و خط اور چال ڈھال سے کیا کام لیا جا رہا ہے اور اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ کارٹون بنانے کا فن بہت قدیم ہے۔ بمپئی کے آثار کی تاریخی دیواروں پر بھی کارٹون نظر آتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بالخصوص یورپی صحافت میں کارٹون سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ کارٹون محض ہنسنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے بعض اہم اخلاقی اور سیاسی مقاصد میں بھی مدد لی جاتی ہے۔ اس تصویر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خود کارٹون بنانے والا کارٹون بن گیا ہے اور وہ اور اس کے مداح جو دوسروں کو تمسخر کی نظر سے دیکھتے ہیں خود سراپا سامان تمسخر بن رہے ہیں۔

مطبوعات

مبادئ سیاسیات جلد ۲ ۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کی فاضلانہ کتاب مبادئ سیاسیات کا ذکر اس سے قبل "ہمایوں" میں ہو چکا ہے۔ اب اس کتاب کی دوسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں حکومت (GOVERNMENT) سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں حکومت کی قسموں، اعضاءِ حکومت اور تفریقِ اختیارات، مفرد اور مرکب مملکتوں، جماعتِ مقننہ، جماعتِ عاملہ، سیاسی فریق بندیوں، دساتیرِ حکومت، بین الاقوامی ہئیت اور قانون بین الاقوام وغیرہ کے موضوعات پر نہایت مفصل اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ آخر میں فرہنگِ اصطلاحات بھی منسلک ہے۔ حجم ۴۱۶ صفحات۔ قیمت مجلد ۳ للعہ پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدر آباد (دکن) یا غلام دستگیر بک ڈپو حیدر آباد (دکن)۔

داغ ۔ یہ کتاب محمد نور اللہ صاحب نوری نے نواب فصیح الملک داغ دہلوی کے متعلق لکھی ہے اور اسے حتے الامکان جامع اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے بعض اہم باب یہ ہیں:۔ داغ کے حالاتِ زندگی، داغ کی شاعری کے محرکات، داغ کی شاعری کا مقصد اور فلسفۂ زندگی، داغ کی شاعری میں مقامی عنصر، داغ کا اسلوبِ بیان، داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصّہ وغیرہ۔ حجم تقریباً دو سو صفحات۔ قیمت غیر مجلد عہ۔ پتہ:۔ غلام دستگیر صاحب کتب فروش، چار کمان۔ حیدر آباد دکن۔

کالیداس ۔ ہندوستان کے باکمال شاعر کالیداس کے نام سے سب لوگ واقف ہیں اور اردو زبان میں اب تک اس کے بعض ڈرامے بھی منتقل ہو چکے ہیں مگر اس کی زندگی اور شاعری پر اب تک کوئی مفصل تبصرہ نہیں کیا گیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب نے جو چودھری جے کرشن ایم اے کی کاوش کا نتیجہ ہے اس اہم ضرورت کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت مجلد طہ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور سے طلب فرمایئے۔

معاہدۂ عمرانی ۔ روسو کی کتاب "سوشل کنٹریکٹ" کو عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ اے پی، ایچ، ڈی نے اس مشہور کتاب کو اردو کا جامہ پہنا دیا ہے۔ ترجمہ صاف اور شستہ ہے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے طلب فرمایئے۔



سید عبدالطیف پرنٹر پبلشر و منیجر رسالہ ہمایوں نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

R. L. No. 1363.

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Picture and Title Page, Printed at the Half-tone Press,
Ram Nagar Langley Road, Lahore